سلاطینِ دہلی

مع دستاویزات

پروفیسر غلام رسول

3795

یو بک پیلس
چوک اردو بازار لاہور

3795

Marfat.com

3795

سلاطینِ دہلی

مع

دستاویزات

پروفیسر غلام رسول

مشتاق احمد

ناشر

نیو بک پیلس اردو بازار لاہور

Marfat.com

3795

87042

(جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں)

کتاب ——— سلاطین دھلی
مصنف ——— پروفیسر غلام رسول
ناشر ——— نیو بک پیلس اردو بازار لاہور
قیمت ——— ۳۴/۵۰ روپے
مطبوعہ ——— ندیم یونس پرنٹرز۔ لاہور

نیو بک پیلس اردو بازار لاہور

Marfat.com

انتساب

یہ کتاب شہداء اسلام کے نام معنون
کرتا ہوں جنھوں نے اپنے خون سے
کشت اسلام کو سرسبز کیا

مصنّف

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

زیرِ مطالعہ کتاب برائے طلبا و طالبات ایم اے ہسٹری لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف و تالیف کے لئے بڑی محنت سے تاریخ کی بیسیوں کُتب سے مواد حاصل کیا ہے۔ پھر یونیورسٹی کے سلیبس کے ڈھانچے میں ڈھال کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک طالب علم اس جامع کتاب کو پڑھ لینے کے بعد مزید تاریخ کی کُتب کی ورق گردانی کی زحمت سے یقیناً بچ جائے گا۔ کتاب کو بلا وجہ طویل بنانے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے جو کہ اپنے اندر جامعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔

یہ کتاب سلیبس کے ہر پہلو پر مکمّل اور حاوی ہے۔ کوئی ایسا پہلو نہیں جو تشنہ چھوڑا گیا ہو۔ اور طالب علم کو مزید مطالعے کی ضرورت پڑے۔ زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔

سوالات کے جوابات دیتے وقت اہم مقامات پر مُستند تواریخ کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ طلباء کے مطالعہ اور نظر میں وُسعت پیدا ہو جائے۔

Marfat.com

مجھے امید کامل ہے کہ ہر طالب علم اس کتاب کو امتحانی نقطہ نگاہ سے مفید پائے گا۔ اگر کوئی طالب علم اس کتاب میں کوئی خامی اور کمی محسوس کرے تو وہ پبلشر کو مطلع کرے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کمی اور خامی کو دور کیا جا سکے۔ ہر کتاب کی خامی کو ناقد ہی ظاہر کرتا ہے اور سلیبس کی کتاب کا سب سے بڑا ناقد طالب علم ہوتا ہے جس کتاب کو وہ اچھا سمجھے وہ کتاب یقینی طور پر امتحانی نقطہ نگاہ سے اچھی ہوگی۔

اگر یہ کتاب کسی کی نظر سے گزرے تو اس کے مفید مشورے کو بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔ اور کتاب میں جس خامی کی نشاندہی کریگا اس کو دوسرے ایڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔ انشاءاللہ۔

آخر میں خدا بزرگ و برتر کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ اس کوشش کو طلبہ کے لئے مفید بنائے (آمین)

"مصنّف"

Marfat.com

فہرست

	صفحات
غزنوی خاندان	۳۳
غوری اور ان کے غلاموں کی سلطنت	۴۳
ناصر الدین، غیاث الدین بلبن	۵۹
خلجی خاندان	۷۲
خاندانِ تغلق	۸۶
تغلق سلطنت کا زوال	۱۱۵
سیّد خاندان	۱۱۸
لودھی خاندان	۱۲۵
سوری پٹھانوں کی سلطنت	۱۴۲
طوائف الملوکی	۱۴۴
نظامِ حکمرانی	۱۶۲
کبیر، چیتنیہ اور نانک	۱۹۲
نجم الدین حسن بن علی سنجر	۲۰۶
ابتدائی دور کی عمارتیں	۲۱۰

Marfat.com

صفحات

قطب مینار	۲۱۱
ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے مضمرات	۲۱۷
لودھیوں کے عہد میں ترقیاں	۲۲۹
علاؤالدین خلجی کی اقتصادی اصلاحات	۲۳۲
خلافتِ راشدہ میں ہندوستان	۲۵۰
دستاویزات	۲۶۹
قاضی منہاج الدین سراج	۲۷۰
طبقاتِ ناصری	۲۷۳
امیر خسرو	۲۷۸
خزائن الفتوح	۲۹۱
تغلق نامہ	۲۹۲
نہ سپہر	۲۹۳
برنی بحیثیت مورّخ	۳۰۲
فتوح السلاطین	۳۱۶
تاریخ فیروز شاہی	۳۱۷

Marfat.com

سوال :- عربوں کے حملے سے قبل ہندوستان کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حالت کیا تھی۔ بیان کیجئے۔

مذہبی حالت

ہندوستان کا اس وقت مذہب ہندومت تھا ۔ ہندومت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے تاریخی اعتبار سے اس کا آغاز ۱۷۰۰ ق.م میں ہوتا ہے۔ جب اریائی اقوام ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں ۔ اریائی قوم اپنے مسلک اور روائتوں کا خزانہ لے کر ہندوستان میں وارد ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مغلوب قوموں کے عقیدے بھی ان میں مدغم ہو گئے۔ کیونکہ اصنام پرستی اس بارے میں بڑی کشادہ واقع ہوئی اور چند دیوتاؤں کا اضافہ یا کسی خاص مقام یا قوم کے دیوتاؤں کو اپنے موجودہ دیوتاؤں کا روپ دینا یا انہیں کے قبیلے کی کسی ہستی کی حیثیت دے کر قبول کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

ہندومت کی مقدسہ کتب

وید کے لفظی معنی ہیں علم ۔ عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وید

Marfat.com

چار کتابوں کا نام ہے۔ لیکن وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا پرنسپل سنسکرت کالج کلکتہ اپنی مشہور کتاب "A HISTERY OF INDIAN PHILOSOPHY" میں لکھتے ہیں "ایک مبتدی جیسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے۔ یہ دیکھ کر پریشانی سی محسوس کرے گا کہ متضاد مطالب اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں۔ لیکن ان سب کا نام وید یا سرتی (سنی سنائی باتیں) ہے اس لئے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے اس علمی تگ و تاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف وجوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا۔ اس لئے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہیے لیے بعض اہل ہند نے قریب دو ہزار سال کے عرصہ میں مختلف علوم و رسوم کے متعلق جو کچھ مواد جمع کیا ہے اس کا نام وید ہے۔ اس مجموعہ کو زمانہ، اسلوب بیان اور موضوع کے اعتبار سے چار اقسام میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ سمہت (SAMHIT) یا گیتوں کا مجموعہ۔

۲۔ برہمن

۳۔ ارنیک

۴۔ اُپ نشد

نظم و نثر کا یہ مولو مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ اسے احاطہ تحریر میں لانا گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ روایتاً سینہ بسینہ برہمنوں کے ہاں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے اس کا نام سرتی (روایات یا سنی ہوئی باتیں) ہے۔

چار وید

سمہت کے مجموعہ کے چار حصے ہیں اور ان کو ہی چار وید کہا جاتا ہے۔ یعنی رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید۔

رگ وید:۔ رگ وید کو سب سے پرانا خیال کیا جاتا ہے اگرچہ پرانوں کی رو سے سب سے پہلے یجر وید تھا۔ اس کو توڑ تھوڑ کر چار وید بنائے گئے (ہندو ازم صفحہ ۹۲)

لہ صفحہ ۱۱-۱۲

Marfat.com

اس کے دس ہزار منتر ہیں۔ یہ وید نظم میں ہے اس میں خداؤں کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تاریخ تصنیف یا مصنف کا نام بتانا مشکل ہے۔ غالباً اس کے تحریر کرنے والے بہت لوگ ہیں۔ رگ وید میں بہت سی دعائیں درج ہیں۔ یہ دعائیں دیوی دیوتاؤں کے ناموں سے مانگی گئی ہیں۔

سام وید:۔ یہ پندرہ کتابوں اور بیس ابواب پر مشتمل ہے اس میں ۷۵ اشلوکوں کے سوا سب کچھ رگ وید سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس وید میں زیادہ تر رسوم اور اس کی تیاری کی دعائیں مذکور ہیں۔ اس وید کے معنی ترنم وید کے ہیں اس میں درج شدہ دعاؤں کے پڑھنے والے پروہت کہلاتے تھے۔

یجر وید:۔ یہ سارا وید رگ وید سے ماخوذ ہے۔ اس کے چالیس ابواب ہیں۔ یجر کے معنی قربانی کے ہیں۔ اس میں رگ وید کی تلاوت وغیرہ کے احکام اور قربانی سے متعلق دعائیں اور منتر درج ہیں یجر وید نثر میں ہے۔

اتھر وید:۔ اس میں کل چھ ہزار منتر ہیں جو ۲۰ ادھیاؤں میں تقسیم کئے گئے ہیں تقریباً ایک ہزار دو سو منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ نصف کے قریب نثر میں ہے۔ اس کا زیادہ حصّہ ٹونے ٹوٹکے اور علاج معالجے پر مشتمل ہے۔ پروفیسر میکڈونل کی تحقیق کی سو سے زیادہ عہد کہن کے تصورات کا مظہر ہے۔

ہندوؤں میں برہما شیو اور وشنو تین خدا مانے جاتے ہیں۔ ویدوں میں توحید کا نام و نشان نہیں۔ ہندو مت کی اساس میں دیوتاؤں کی پرستش پر ہے۔ ویدوں میں مظاہر قدرت کی حمد و ثنا زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان مظاہر قدرت کی دیوتائی صورتیں مشہور ترین یہ ہیں۔

دبارش اور جنگ کا دیوتا) اور اہلاکت کا دیوتا) وایو (ہوا کا دیوتا) سوریہ (سورج کا دیوتا) ورن (آسمان کا دیوتا)

رامائن

ہندوؤں کے ہاں رامائن اور مہابھارت بھی بڑی مقدس کتب سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کے مضامین سے ظاہر ہے کہ وہ صرف تاریخی کتابیں ہیں۔ تاریخی صرف اس لحاظ سے کہ ان میں دو لڑائیوں کا ذکر ہے۔ ان کے زمانہ تصنیف کا تعین بھی مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔

Marfat.com

عام طور پر ہندوؤں کا خیال ہے کہ رامائن اور مہابھارت سے بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ پنڈت لیکھ رام صاحب تاریخ دنیا میں مہابھارت کی تصنیف کا زمانہ ۳۱۰۰ ق۔م بتاتے ہیں۔ اور رامائن کو آٹھ لاکھ برس کی پرانی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ لیکن یورپین مورخ ڈاکٹر ہنٹر کی تحقیق ہے کہ رامائن کی تصنیف کا زمانہ مہابھارت سے بعد کا ہے، اور رامائن ۱۰۰۰ ق م یا اس سے بھی بعد کی تصنیف ہے۔ اور مہابھارت قریباً ۱۲۰۰ ق م میں لکھی گئی۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں سن عیسوی کے سینکڑوں سال تک الحاقات ہوتے رہے۔ چنانچہ مہابھارت میں راجہ بلی کا ذکر موجود ہے۔ جو چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ رامائن کے متعلق مسٹر گورنداس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی تصنیف کا زمانہ قریباً تیسری صدی ق۔م ہے۔ (ہندوازم)

اگرچہ ہندوؤں کے عقیدہ کی رو سے مہاراج چندرجی کا زمانہ آج سے بیس لاکھ سال پیشتر کا مانا جاتا ہے۔

رامائن میں اڑتالیس ہزار اشعار ہیں۔ اس کتاب میں سری رام چندرجی کی ان لڑائیوں کا ذکر ہے۔ جو انہوں نے لنکا کے بادشاہ راون سے اپنی بیوی ستیاجی کو چھڑانے کے لئے لڑی تھی۔

مہابھارت

اس میں دو لاکھ پندرہ ہزار اشعار ہیں۔ مہابھارت کو ویاس جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ جنہوں نے اس جنگ کے حالات بچشم خود دیکھ کر لکھے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مہابھارت کی جنگ کا واقعہ قریب ۱۶۰۰ ق م کا قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں ہستناپور کی ریاست کے دو رشتہ دار خاندانوں (کورو پانڈو) کی جنگ کا ذکر ہے۔ جو اٹھارہ دن تک جاری رہی۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ مختلف اندازوں کے مطابق (۹۹، ۶۷، ۸۲) آدمی مارے گئے (ہندوازم) اس میں متصوفانہ تصورات اور فسانہ طرازی کا بڑا امتزاج ہے۔ بھگوت گیتا جس کی شہرت بے بنیاد نہیں اس کا ایک حصہ ہے۔ ہندومت کے تصورات کا یہ انمول موتی ہے۔ اس میں آدمی کو ان فرائض کی ادائیگی کے لئے جو اس کے سماجی مقام کا تقاضا ہے۔ ترغیب وتحریص ہے شخصی مفاد اور نتائج سے بالاتر رہنے کی دلاویز تلقین ہے۔ یہ یوگ کا صحیفہ ہے۔ جس کا بنیادی اور مرکزی تصور احکام الہیہ کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

مہابھارت کے موجودہ نسخوں کے متعلق مسٹر گوونداس لکھتے ہیں۔

Marfat.com

ان میں بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تین مختلف مرتب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے۔ (ہندوازم صفحہ ۱۴۱)

مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں بدھ مت زوال پذیر تھا۔ اور بہار میں پال اور سین خاندانوں کے زمانوں تک اس کے پیرو موجود تھے۔ جنوبی ہند میں جین مت کا غلبہ تھا۔ بالخصوص راشٹر کوتہ، چالوکیہ، گنگہ اور ہویا سالہ راجاؤں کے علاقوں میں جین مت کو بہت فروغ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ وشنومت اور شیومت کی مذہبی تحریکات نے غلبہ پالیا۔ کمار بھٹ، شنکر آچاریہ، رامانج اچاریہ اور مادھو اچاریہ جیسے ہندو مذہبی عالموں نے ہندو سماج کے فکری ڈھانچہ میں انقلاب برپا کر لیا۔

معاشرتی حالت

مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر میں سیاسی اور سماجی زندگی کی بنیادی خصوصیت طبقاتی تھی۔ ہندو سماجی زندگی کا اہم اصول ذات پات تھا۔ جو ہندو کی زندگی اور عادات پر تین ہزار سال سے اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ذات کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ خاندان یا خاندانوں کے گروہوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا کوئی مشترک نام ہوتا ہے۔ ہر ذات کا کوئی نہ کوئی انسانی یا آسمانی روایاتی مورث اعلیٰ ہوتا ہے۔ اکثر ذات اور مورث اعلیٰ کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ ذات کے لوگ ایک ہی پیشہ سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ اہل الرائے کے نزدیک یکساں نوعیت کی سوسائٹی کی شکل میں ہوں۔

ذات پات کے امتیاز کا ماخذ ہندوؤں کی مذہبی کتب ہیں۔ وید میں لکھا ہے۔ برہمن پرماتما کا منہ ہے۔ کھشتری بازوؤں سے ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔

وید کے لئے برہمن حکومت کے لئے کھشتری کاروبار کے لئے ویش اور دکھ اٹھانے کے لئے شودر پیدا کیا ہے۔ (یجروید)

منوشاستر ہندوؤں کی قانون کی کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے " قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے وبالترتیب برہمن چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا (باب اوّل)

اس دنیا کی حفاظت کے لئے اس نے ان میں ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض سونپ

Marfat.com

دیئے ہیں (باب اول) فرائض ہوئیں۔ برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے۔ اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا ہے (باب اوّل)

چھتری کو اس نے حکم دیا ہے کہ خلقت کی حفاظت کرے دان دے چڑھاوے چڑھائے وید پڑھے اور شہوت انسانی میں نہ پڑے (باب اول)

ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے دان دے چڑھاوے چڑھائے۔ تجارت لین دین، اور زراعت کرے۔ (باب اوّل)

شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا اور وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے۔

عورت کے متعلق تعلیم

اتھروید میں لکھا ہے اگر کسی ایک عورت کے پہلے دس خاوند موجود ہوں اور اگر برہمن اس کا ہاتھ پکڑے تو وہ اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے۔ کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک ہے نہ کہ کھشتری یا ویش۔

سیاسی حالت

اسلام سے پہلے ہرش وردھن آخری حکمران تھا۔ جس کی حکومت برصغیر کے وسیع حصّہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وفات (۶۴۷ء) کے بعد دوبارہ طوائف الملوکی (چھوٹی چھوٹی ریاستوں) کا دور شروع ہوا۔ ان میں سے بعض ترقی کر کے بڑی طاقتیں بھی بن گئیں۔ مگر ان سے کسی ایک کے لئے بھی ممکن نہ ہوا کہ وہ برصغیر کے بڑے حصّہ کو اپنے زیر اقتدار لے آئے اس وجہ سے مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ انہیں ٹکڑوں میں بٹا ہوا ملا۔ اس کی فتح قدرے آسان مگر ایک طویل مہم بن گئی۔ ہر راجہ کی شکست کے بعد صرف ایک چھوٹا سا علاقہ قبضہ میں آیا۔ اور فتوحات کی تکمیل کے لئے ان کو طویل زمانہ صرف کرنا پڑا۔

فاتحین کے کام کی صحیح اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے برصغیر کی بعض اہم ریاستوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ہرش کی سلطنت

۶۰۵ء میں تھانیسر کا بہادر راجہ "پربھاکر" مرگیا تو اس کی جگہ

Marfat.com

اس کا بڑا لڑکا راج وردھن جو پنجاب کا ہنوں سے لڑ رہا تھا پایہ تخت پر پہنچ کر تخت پر بیٹھا ، لیکن مالوہ کی لڑائی میں وہ جلد مارا گیا تو ۶۰۶ء میں اس کی جگہ ہرش راجہ ہوا ۔ اس نے پچاس ہزار پیادہ بیس ہزار سوار اور پانچ ہزار ہاتھی سے کر مشرقی بنگال کے علاوہ تمام شمالی ہندوستان فتح کر لیا ۔ اب اس نے دکن کی طرف رخ کیا ۔ اس وقت ایک لاکھ سوار اور ساٹھ ہزار جنگی ہاتھی اس کے ساتھ تھے ۔ اس نے نربدا تک کا ملک فتح کر لیا ۔ مگر آگے نہ بڑھ سکا ۔ کیونکہ چالوکیہ خاندان کے طاقت ور راجہ نے اس کو ۶۲۸ء میں شکست دے کر واپسی پر مجبور کر دیا لیکن اس شکست کا بدلہ گجرات اور کاٹھیاواڑ کی فتح سے نکل آیا ۔

راجپوت اور گوجر

ہرش کے بعد اس کی سلطنت کمزور ہو کر متعدد حاکموں میں بٹ گئی اور آخر گوجروں نے اس پر قبضہ کر لیا ۔

۲۰۱ھ میں بھیل مان کا راجہ ناگ بھٹ جس نے قنوج کی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور پھر اس کے خاندان نے اس شہر قنوج کو مبارک سمجھ کر پایہ تخت قرار دیا ۔ ۲۱۰ھ (۸۲۵ء) میں اس کا لڑکا رام دیو تخت پر بیٹھا ۔

۲۲۵ھ/۸۴۰ء کے بعد راجہ مہیر جو راجہ بھوج کے لقب سے مشہور ہے اس نے پچاس سال تک بڑی شان سے سلطنت کی ۔ نربدا سے لے کر ستلج تک اور پورب میں بہار تک اس کی سلطنت تھی ۔

۲۷۷ھ/۸۹۰ء میں اس کے مرنے کے بعد مہندر پال وارث ہوا اور جب ۹۰۸ء/۲۹۵ھ میں مرا تھا تو کوئی ایسا طاقت ور شخص نہ تھا جو سلطنت کو بچاتا ۔

حکومت کشمیر

راجہ ہرش کے زمانہ میں سندھ کے علاوہ پنجاب اور کشمیر میں بھی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم تھیں ۔ کشمیر کی سلطنت کے حدود میں کابل و گندھارا (قندھار) یعنی شمال مغربی پنجاب کا پہاڑی علاقہ بھی داخل تھا ۔ راجہ ہرش کا ہم عصر راجہ ورلبھ وردھن یہاں کا حکمران تھا ۔

سلطنت پنجاب

دسویں صدی میں یہاں ایک عظیم الشان سلطنت قائم تھی ۔ جس کے

Marfat.com

حدود حکومت میں دریائے سندھ کی وادی کا بالائی حصہ اور سندھ کے شمال میں پنجاب کا بڑا علاقہ جو مغرب کی طرف کوہستان تک اور مشرق کی طرف دریائے بکرا تک پھیلا ہوا تھا۔ شامل تھا۔ راجہ جے پال یہاں کا حکمران تھا۔

دھلی، سانبھر، اجمیر کی حکومتیں

شہر دہلی کی بنا ۹۹۳ء میں مہابھارت کے شہر اندر پرست کے قریب ڈالی گئی تھی۔ اس حکومت کا خاتمہ تنوار خاندان کے راج پوتوں نے کیا تھا۔ جن میں راجہ انگ پال نے دہلی کو بڑی ترقی دی۔ دوسری طرف چوہان نسل کے راجپوتوں کی حکمرانی راجپوتانہ کے علاقہ سانبھر میں تھی۔ جس میں اجمیر کا علاقہ بھی شامل تھا۔ بارھویں صدی میں اس خاندان کے راجہ دلیپ دیو نے تنواروں کے ہاتھ سے دہلی کو بھی فتح کر لیا۔ دلیپ دیو کا بھتیجا یا نواسہ پرتھی یا پرتھوی راج یا پھورا برسر اقتدار آیا اس نے چندیل کے راجہ پرسال کو شکست دی۔

سلطنت بندیل کھنڈ

جمنا اور نربدا ندی کے درمیان کا علاقہ بندیل کھنڈ کہلاتا ہے ہندوستان میں طوائف الملوکی شروع ہونے کے بعد نویں صدی میں یہاں گوجر یا پرہیار سرداروں کی حکومت قائم ہوئی۔ ان سب کے ایک سردار نانک چند چندیل نے چھتر پور کے قریب ایک ریاست قائم کی۔ چندیل خاندان کی حکمرانی یہاں مستقل طور پر قائم ہوئی۔

سلطنت بہار و بنگال

ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے کے بعد اٹھویں صدی عیسوی میں مغربی بنگال و بہار میں پال خاندان برسر اقتدار آیا۔ راجہ گوپال اس خاندان کا بانی اور بودھ مت کا پیرو تھا۔ اس نے اوند پور میں بودھ مت کی خانقاہ قائم کی۔ یہی مقام اس کی راج دھانی تھا۔ اس بودھ خانقاہ وہار کی مناسبت سے اس کا نام تبدیل ہوا۔ اب بہار کہا جاتا ہے۔ پال خاندان کی حکومت بہار سے بنگال تک وسیع تھی۔

Marfat.com

سلطنت اڑیسہ

گیارھویں صدی کے اواخر میں اڑلیسہ (کلنگ) میں راجہ چور گنگ نے قوت حاصل کی۔ اس کا ایک فوجی سردار سمنت دیو کا سنی پور کا مالک بنا۔ سمنت دیو کے پوتے نے مشرقی بنگال کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا اس کے بیٹے لکشمن سین کو بودھ مت سے سخت اختلاف تھا۔ اس سین خاندان کی کوششوں سے مشرقی بنگال و اڑلیسہ سے بودھ مت کا خاتمہ ہوگیا اور برہمنی عقائد کی تبلیغ ہوئی ۱۱۱۹ء میں ملال سین کی وفات پر اس کا بیٹا لکشمن سین وارث تخت و تاج ہوا، جس کو مسلمان مورخین نے رائے لکھمن لکھا۔

سلطنت اسام۔ کام روپ

کام روپ کی قدیم سلطنت کی حدود اسام سے زیادہ تھی۔ کوچ، بہار، اور نگ پور کے علاقے اس میں شامل تھے۔ اسام کا یہ علاقہ عہد قدیم سے آریہ حکمران کے زیرنگیں رہا پھر مقامی سرداروں نے وہاں حکومت قائم کی، بھاسکر داس یہاں کا حکمران تھا۔ پھر بنگال کے پال خاندان کی یہاں حکمرانی ہوئی اسی خاندان کے ایک راجہ کمار پال نے اس علاقہ کو بارھویں صدی میں اپنے وزیر دھرپا دیو کے سپرد کردیا پھر ۱۳ ویں صدی کے اوائل میں شان قوم کے ایک قبیلہ آہوم نے یہاں قبضہ جمالیا۔

سلطنت گجرات

ادھر ہندوستان کے شمال مغرب کے حصوں میں سے گجرات میں بارھویں صدی میں یہاں کے چالوکیہ خاندان کے ہاتھوں جن میں سدھ راج اور کمار پال ممتاز تھے۔ اس علاقہ کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ پھر اسی صدی کے آخر میں چالوکیہ کے جانشین بگھیلہ خاندان والے بنے۔

مالوہ

مالوہ کا علاقہ دریائے نربدا کے شمال کی وہ سرزمین ہے جو قدیم زمانہ میں اونتی سلطنت اوجین کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں پرمار خاندان تھا۔ نویں صدی کے اوائل میں

Marfat.com

اپندر یا کرشن رائے نے اس خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔

دکنی حکومتیں

خاندان اندھرا

اس حصہ ملک پر ساڑھے چار سو برس یعنی ۲۳۵ء تک اندھرا خاندان کی حکومت رہی، کنو خاندان کے بھی یہی جانشین رہے۔ یہ دکھنی علاقہ شمالی ہند سے عہد قدیم میں اس سے بیشتر زمانوں میں جدا رہا۔ شمالی ہند کی مشہور قدیم حکومتوں کے بیشتر حکمران یہاں تک نہ پہنچ سکے۔ صرف موریا خاندان ہی ایسا تھا۔ جس کو انہوں نے اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کیا تھا۔

دتا چلکیا خاندان

چھٹی صدی عیسوی میں دکن نے چلکیا خاندان کے ہاتھوں عروج حاصل کیا۔ اس خاندان کی حکومت کی بنا پلکیسن اول نے ۵۵۰ء میں ضلع بیجاپور کے مقام پر ڈالی۔ پھر پلکیسن دوم ۶۰۸ء میں حکمران ہوا، اس نے اپنی فوجی طاقت سے راجہ ہرش کے حکم کو روکا۔ ۶۴۲ء میں پلو خاندان کے راجہ نرسمہورمن نے اس کے پایہ تخت ناسک میں اس کا خاتمہ کر دیا، مگر وہ چند سال سے زیادہ جنوبی ہند پر قبضہ نہ رکھ سکے۔ پلکیسن کے لڑکے بکرماجیت دوم نے ۷۴۰ء میں پلو خاندان کے قدیم دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔

شاہان راشٹر کوٹ

اس کے بعد آٹھویں صدی میں چلکیا خاندان کی ایک دوسری شاخ راشٹر کوٹ کو ۷۵۳ء میں عروج ہوا۔ اس نے وتاپی چلکیوں کی حکومت ختم کی۔

کلیانی شاہان چلکیا

راشٹر کورٹ کے بعد چلکیا ہی کا تیسرا خاندان راجہ تیل کی سرکردگی میں برسر اقتدار آیا ایک دور ایسا آیا۔ جب چول خاندان نے اس خاندان کی مملکت کو روند

Marfat.com

ڈالا۔ مگر مختلف سیاسی عروج و زوال کے ساتھ اس خاندان کے حکمرانوں کی حکومت بارہویں صدی تک قائم رہی اس دور میں چلکیا خاندان کی ایک اور شاخ کلیان میں برسر اقتدار آئی سنہ ۱۱۹۰ء میں اس حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

ہوسل خاندان

ہوسل خاندان کی حکمرانی کا زمانہ سنہ ۹۷۳ء تا سنہ ۱۱۶۰ء تک رہا۔ اس میں گیارہ فرماں روا گذرے۔ بارہویں اور تیرھویں صدی کے دوران میں ہوسل خاندان نے میسور میں بھی اقتدار حاصل کیا ان میں راجہ بٹی دیو نے نام پیدا کیا وہ جین مت کا پیرو ہوگیا تھا۔ چول خاندان نے جینی مندروں کو جو برباد کیا تھا۔ اس کی درستی کرائی۔

سلطنت خاندان یادو

اس زمانہ میں دیوگری (دولت آباد) میں یادو خاندان کو عروج ہوا اس میں راجہ بھلم اور راجہ سنگھن امتیاز رکھتے تھے۔

جنوبی ہند کی حکومتیں

رتن کی سطح مرتفع کے بعد راس کماری تک کا علاقہ جنوبی ہند کہا جاتا ہے اس میں وہ ساحلی حصے بھی ہیں جو جدید اصطلاح میں جنوبی و مشرقی گھاٹ کہے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کے قدیم آثار سے جو کچھ تاریخی مواد فراہم ہو سکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کی تین مشہور سلطنتیں پانڈیا، چول اور چیرپالیا کہ ہی تھیں۔

سلطنت پانڈیا

سلطنت پانڈیا شمال و جنوب میں دلارو (لوورکوتی) سے راس کماری تک اور مشرق و مغرب میں ساحل کارومنڈل سے درۂ اچھنکودل تک جو ٹراونکور میں داخلہ کا راستہ ہے وسیع تھی۔ اس میں مدرا اور تناولی کے اضلاع اور ترچناپلی کے کچھ حصے شامل تھے کبھی ٹراونکور کے جنوبی حصے بھی آجاتے تھے یہ سلطنت پانچ ریاستوں میں منقسم تھی اور موجودہ

Marfat.com

اصطلاح کے لحاظ سے ان میں وفاق قائم تھا۔ ان وفاقی ریاستوں کے سردار (پانچ پانڈیا " کہے جاتے تھے۔

سلطنت چول

سلطنت چول کے حدود مشرق میں ساحل کارومنڈل کے ساتھ نلور سے پدکوئی تک اور مغرب میں کرگ تک قائم تھے۔ ان حدود میں زمانہ حال کی تقسیم کے لحاظ سے مشرق میں ضلع مدراس اور انڈین یونین کے چند اضلاع اور ریاست میسور کا ایک بڑا حصہ آگیا تھا۔ اس کا پایہ تخت اُریور یعنی ترچناپلی تھا۔ خاندان چول کا آخری حکمران بادشاہ کلوتنگ سوم تھا۔ جس نے ۱۲۸۷ء سے چالیس برس تک حکومت کی۔

سلطنت چیریا یا کریل

سلطنت چیریا جس کو کریل بھی کہا جاتا ہے۔ ساحل مالدیار میں قائم تھی۔ جس میں موجودہ ضلع مالدیار مع ٹراونکور اور کوچین شامل تھا۔ کریل کا اطلاق عموماً مغربی گھاٹ کی اس ناہموار زمین پر کیا جاتا تھا۔ جو چندرگری دریا کے جنوب میں واقع ہے۔ ٹراونکور کا جنوبی حصہ کبھی پانڈیا سلطنت کا جزو رہا اور پانڈیا، چول اور چیر کے حدود وقتاً فوقتاً گھٹتے بڑھتے رہے۔

خاندان پلو کا عروج و زوال

جنوبی ہند کی ان تین سلطنتوں کے علاوہ ایک خاندان پلو برسر اقتدار آیا۔ انہوں نے چوتھی سے آٹھویں صدی عیسوی تک جنوبی ہند کی سیاسیات میں اثر انداز طاقت حاصل کی۔ ان کا کوئی مستقل مستقر نہ تھا ان کی طاقت ہمسایہ حکومتوں کی کمزوریوں سے حاصل ہوا کرتی تھی۔ آخر میں چول سلطنت کا خاتمہ ان ہی کے ہاتھوں سے ہوا۔ اس خاندان کا ایک راجہ کانچی میں حکمران تھا۔

Marfat.com

س ۔ سندھ پر مسلمانوں کے حملے سے قبل عرب اور ہندوستان کے تعلقات کا جائزہ لیجئے :۔

تعلقات کی طبعی سہولتیں

ہندوستان کے جنوبی حصہ کو اس طور پر بحیرہ عرب گھیرے ہوئے ہے کہ اس کے سامنے عمان ہے۔ اس کے دائیں خلیج فارس اور اس کے بائیں خلیج عدن ہے۔ عدن یمن کا پرانا بندرگاہ ہے۔ حضرموت گجرات کے سامنے ہے اور بحرین، خلیج فارس کا بحری مرکز ہے ۔

پس ان طبعی سہولتوں کے سبب ہندوستان اور عرب میں تعلقات کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ تاریخی شہادتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے ۔

تجارتی تعلقات

ہندوستان ہمیشہ سے تجارتی مرکز رہا ہے اور دنیا بھر کی قومیں اس حیثیت سے اس سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں اس لئے عرب جیسی تاجر قوم سے بھی ہندوستان سے کاروباری تعلقات قائم ہوگئے ۔ رفتہ رفتہ عربوں کو یہ ملک اور اس کا نام کچھ ایسا پسند ہوا کہ وہ ان کے ادب و شاعری میں عشق و محبت کا مظہر قرار پا گیا ۔ یہ عرب تاجر ہندوستان کے تجارتی مال جہازوں کے ذریعہ ہندوستانی بندرگاہوں سے لے کر یمن پہنچاتے اور یہاں سے بحر احمر کے کنارے کنارے خشکی کے راستہ سے یہ مال شام جاتا۔ جہاں سے بحر روم ہوکر مصر اور یورپ میں بھیجا جاتا ۔ ۲۰۰۰ ق م میں عرب تاجر جن کو کنعانی اور آرامی کہا جاتا تھا۔ اور اب فنیقی کہتے ہیں۔ جہاز رانی کے ذریعے تجارت کرنے میں بڑے ماہر تھے یہ دراصل بحرین کے رہنے والے تھے۔ مگر شام میں جاکر آباد ہوگئے تھے ۔ وہ بحر روم کے کنارے کنارے یونان پہونچتے اور وہاں سے یورپ چلے جاتے اسی طرح یورپ میں بحرین یا بحر احمر کے ذریعہ ایران اور ہندوستان کے کنارے کنارے چین تک اپنا مال لے جاتے اور پھر وہاں کی چیزیں یورپ پہنچاتے ۔

۱۰۰۰ ق م میں یمن کی ایک قوم سبا نے بھی اس تجارت میں کافی حصہ لیا ۔ جنوبی ہندوستان سے ان کے تجارتی تعلقات بڑے وسیع تھے۔ یہ چمڑا، زین، پوست، گلنگر (ایک قسم کی خوشبودار

پتی) جاوتری، ہڑبہیڑا، آبنوس، کچھوے کی ہڈی، کباب چینی، مخمل، رنگا لوبان، ہید مصتبر، ہاتھی دانت، مختلف نباتات کے تاروں کا کپڑا، ہلدی، لونگ، الائچی، سیاہ مرچ، دار چینی، ڈلی، ناریل، اعلیٰ خصوصیت سے ہندوستان سے لے کر غیر ملکوں میں بیچتے۔ چنانچہ بعض چیزوں کے نام عربی میں سنسکرت سے آئے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ وہ اس کو گواہی میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مشک، فلفل، کافور، زنجبیل، صندل، نارجیل، قرنفل، جائفل وغیرہ

اس طرح بعض چیزوں کے ساتھ ہندی کی جو نسبت لگی ہوئی ہے اس سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسے عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی، لوہے کے سامان میں سے خالص فولاد کی تلوار ہندوستان ہی سے جاتی تھی۔ اس لئے عربی میں ہندی اور مہند تلوار کی صنعت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور چیزیں بھی یہ تاجر ہندوستان سے باہر لے جاتے تھے چنانچہ مورخ جوزیفس نے لکھا ہے کہ سوپارے (بمبئی کے قریب) اور رورکھ (بھروچ کے قریب) بندر سے حضرت سلیمان کے زمانہ میں (۹۵۰ء ق۔م) ہاتھی کے دانت، بندر، مور وغیرہ کی فلسطین میں تجارت ہوتی تھی، کپڑوں کی تجارت بھی یہ عرب خوب کرتے تھے۔ ہندوستانی کپڑوں میں ململ، چھینٹ اور رومال خصوصیت سے ذکر کے قابل ہیں۔ جن کو عربی میں قرفس (کرپاس یا کرپس) شیسٹ اور خوط لکھتے ہیں۔ سمندری راستہ کے علاوہ خشکی سے بھی یہ لوگ تجارت کرتے تھے۔ چنانچہ سندھ سے بلوچستان اور وہاں سے ایران ہو کر پہلے یہ لوگ بابل پہنچتے اور پھر وہاں سے شام جاتے۔ ساتویں صدی ق۔م تک یہ تجارتی تعلقات وسیع پیمانہ پر قائم تھے۔ ہندوستان سے بابل اور بابل سے ہندوستان بہت زیادہ آمد و رفت تھی۔ جس کی گواہی پرانے آثار سے اب بہت زیادہ مل رہی ہے۔

علمی تعلقات

ہندوستان سے عربوں کے تعلقات صرف تجارت ہی کے نہ تھے۔ بلکہ علمی بھی تھے۔ ۸۰۰ء ق۔م سے پہلے ہندوستان میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ یہی عرب تاجر تھے، جو خشکی (بابل) بحری دونوں راستوں سے ہندوستان میں حروف لائے اور یہی سبب ہے کہ خاندان موریہ اور خاندان اندھرا کے تمام کتبات آرامی حروف میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح حساب بھی آرامی طرز میں لکھا جاتا تھا۔ اشوک کے کتبات اس کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے

87042

Marfat.com

ہیں۔ یہ حروف داہنے طرف سے بائیں جانب کو لکھے اور پڑھے جاتے تھے۔ ان کو آرین" یا می" کہتے ہیں اور گندھارا الیپی کے نام سے مشہور تھا۔ ساتویں صدی ق۔م میں ہندوستان کے لوگ عربی سے بھی واقف تھے۔ غالباً آمدو رفت کی کثرت اور تجارتی ضرورتوں کی بناء پر اس زبان سے آشنا ہوگئے۔ سوامی دیانند جی نے ستیارتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر جب پانڈوں کو جلا دینا چاہا تو دورجی نے عربی زبان میں اس بھید سے ان کو آگاہ کیا اور یڈ ہشٹر نے بھی عربی میں ان کو جواب دیا۔

سیاسی تعلقات

سیاسی اعتبار سے یہ واقعہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ بلوچستان اور سندھ پر ایران کے شہنشاہ کا قبضہ اکثر رہا ہے۔ اس تعلق سے بعض جنگجو قبیلے فوج میں بھرتی ہو کر اور ایرانیوں کے ساتھ مل کر دشمن سے لڑتے، جن میں سندھ کے جاٹ اور مید قوم زیادہ ممتاز تھی۔ چنانچہ آغاز اسلام میں جب ایرانیوں اور عربوں سے لڑائی ہوئی تو ایرانی فوج میں یہ جاٹ اور مید قوم کے لوگ شامل تھے۔ جو ایران کے فتح ہوجانے کے بعد مسلمان ہو کر مسلمانوں کے دست و بازو بن گئے۔ غرض جب مسلمانوں کا ایران پر قبضہ ہوگیا اور وہ اس کے تخت و تاج کے مالک ہوگئے تو قدرتی طور پر ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سرحدی معاملات اور دوسرے امور پر قابو پانے کے لئے سندھ اور بلوچستان پر بھی ان کا قبضہ رہے۔ تجارتی مفاد کے لئے بھی ایک بندرگاہ کی ضرورت تھی۔ جو عرب سے قریب ہو۔ سندھ کی مشہور بندرگاہ "دیبل" (کراچی کے قریب) ان باتوں کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ اکثر باغی اسلامی علاقوں سے بھاگ کر سندھ میں پناہ لیتے تھے اور راجہ ان کی مدد کرتا تھا۔ جس کے باعث ملک میں بدنظمی پیدا ہوجاتی تھی اور چونکہ سندھ اور کاٹھیاواڑ کے ساحل پر بہت سے بحری ڈاکو بھی رہا کرتے تھے۔ جو اسلامی جہازوں پر چھاپے مارتے تھے۔ اس لئے سندھ پر قبضہ کرنا عربوں کے لئے ضروری ہوگیا۔

Marfat.com

سوال :- سندھ پر مسلمانوں کے حملے کے واقعات بیان کیجئے نیز اس کے وجوہات اور نتائج پر روشنی ڈالئے ۔

سندھ پر حملہ کی وجوہات

سندھ اور بلوچستان کی سرحد ایران پر اسلامی سطوت کا پرچم اسلام کے آغاز کے چند ہی دنوں بعد لہرانے لگا تھا۔ عرب و ایران میں کچھ دیرینہ اختلافات تھے۔ اسلام کے آغاز میں سندھ کے قبیلے جاٹ اور میدکے لوگوں نے ایرانیوں کی طرف سے عربوں کا مقابلہ کیا تھا۔ لڑائی میں ان قوموں کے شریک ہونے کی وجہ سے سندھ گویا دشمن ملکوں کی صف میں داخل ہو گیا تھا۔ اس طرح سندھ سے اسلامی حکومت کو پہلی شکایت یہی ہوئی کہ سندھی ایرانیوں کے ساتھ ہو کر اسلامی لشکر کے خلاف صف آرا ہوئے، چنانچہ مسلمانوں کی دیکھ بھال کرنے والے بحری قافلے اور جنگی بیڑے ہندوستان کے ساحل سے آکر ٹکرانے لگے اور سپاہی مختلف جگہوں پر اتر کر چھاپے مارنے لگے۔

اس کے بعد سندھ سے اسلامی حکومت کو دوسری براہ راست شکایت یہ پیدا ہوئی کہ حکومت سندھ نے ایسے مختلف باغیوں کو اپنے دامن میں پناہ دی جو مسلمانوں کے خیال میں دین اور اسلامی حکومت کی نظر میں امن و امان کے لئے خطرہ بن چکے تھے۔ ان میں محمد بن حارث علافی، معاویہ بن حارث علافی اور صہیم بن سامہ سامی کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی اور عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کی باہم جنگ آزمائی اس عہد کی تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے یہ لوگ ابن اشعث کے ساتھ ہو کر حجاج کے خلاف لڑے تھے اور ابن اشعث کی شکست کے بعد فرار ہو کر عمان چلے گئے اور وہاں سے سندھ آئے اور سندھ کے راجہ داہر سے پناہ مانگی اور اس نے ان عربوں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس اثنا میں مکران کے مسلمان حاکم سعید بن اسلم بن زرعہ نے کسی جرم میں قبیلہ علاف کے بعض لوگوں کو قتل کرایا اور اس کے انتقام میں ان دو بھائیوں محمد و معاویہ نے پانچ سو سپاہیوں کا دستہ لے کر مکران پر حملہ کیا۔ سعید کلوبی مارا گیا۔ اور ان لوگوں نے مکران پر قبضہ کر لیا۔ مکران مرکزی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔ ان علافیوں کی اس یورش کی ذمہ داری سے قدرتی طور پر راجہ داہر سبکدوش نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ حجاج ثقفی نے اس حادثہ کی خبر سنتے ہی مجاعہ بن مسعر تمیمی کو ہندوستان کی سرحد کا گورنر بنا کر بھیجا اس نے مکران پر فوج کشی کر کے اس پر

Marfat.com

دوبارہ قبضہ کیا۔ محمد و معاویہ علافی اپنے آدمیوں کے ساتھ پھر سندھ چلے آئے اور ۸۵ھ میں ایک مقام ارور میں قیام پذیر ہو گئے۔

اس صورت حال سے ان دونوں ملکوں کے تعلقات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے آخر میں عرب عورتوں کے جہاز کے لوٹ لینے کا واقعہ پیش آیا یہ تیسرا سبب تھا۔ جس کی وجہ سے ان دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوئے اور اس قضیہ کو مستقل طور پر تلوار ہی کے ذریعہ سے طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس آخری واقعہ کی صورت حال یہ تھی کہ اس زمانہ تک اسلامی حکومت کا دائرہ اثر ایشیا یورپ افریقہ میں دور دور پہنچ چکا تھا۔ اور مختلف ممالک کے سفیر دارالحکومت میں آیا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں مالدیپ کے راجہ نے ایک سفارت چند تحائف کے ساتھ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس دمشق روانہ کی۔ نیز اسی سفارت کے ساتھ چند ایسے عرب تاجروں کی عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ جو لنکا میں انتقال کر گئے تھے۔ اس جہاز کو سندھیوں نے بندرگاہ دیبل کے پاس لوٹ لیا اسلامی حکومت کی طرف سے سندھ کے راجہ داہر کی اس کی طرف توجہ دلائی گئی شریف عرب خواتین کو واپس کر دیا جائے لیکن راجہ داہر نے جواب دیا کہ یہ بحری قزاقوں کا کام ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہیں حجاج بن یوسف ثقفی نے راجہ داہر کے جواب کو حیلہ جوئی پر معمول کیا۔ چنانچہ عرب عورتوں کے جہاز کو لوٹ لینے کے انتقام میں حکومت سندھ کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔

سندھ پر مسلمانوں کے حملوں کا آغاز

یوں تو ہندوستان پر مسلمانوں کے بحری حملے حضرت عمرؓ کے زمانہ سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ بحرین کے گورنر عثمان بن ابی العاصؓ نے عمان کے راستہ ساحل ہند کی طرف ایک لشکر روانہ کیا جو بمبئی کے علاقہ تانہ (تھانہ) تک آیا لیکن بعد میں حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور عثمان کو لکھا کہ اگر اس مہم بیڑہ کے مسلمانوں کو نقصان پہنچ جاتا تو میں اس کا بدلہ تیری قوم سے لیتا۔ علاوہ بریں عثمان نے اپنے بھائی الحکم کو بھڑونچ اور دوسرے بھائی مغیرہ کو دیبل بھی بھیجا تھا۔ جہاں اس کی دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی اور وہ کامیاب رہے۔ اور پھر جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے اور عبداللہ بن عامر کو عراق کا گورنر مقرر کیا تو آپ نے ان کو لکھا کہ ہندوستان کسی ایسے شخص کو بھیجو جو اس کے حالات سے واقف

Marfat.com

ہو اور وہاں کی خیر خبر لے کر آئے۔ عبداللہ بن عامر نے اس کام کے لئے حکیم بن جبلہ کو منتخب کیا چنانچہ جب وہ ہندوستان سے واپس آئے تو انہیں دربار خلافت میں روانہ کر دیا گیا۔ یہاں حکیم بن جبلہ نے حضرت عثمان سے ہندوستان کے حالات کچھ اس طرح بیان کیے کہ آپ نے کسی لشکر کو اس کی طرف بھیجنا مناسب خیال نہ کیا لے اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کی خلافت کے زمانے میں بھی سندھ کی سرحد پر مکران اور قیقان بلکہ بنوں اور لاہور تک اسلامی دستوں کے آنے اور جنگ کرنے کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کو صرف چھیڑ چھاڑ ہی کہا جا سکتا ہے۔

حجاج نے سندھ کے افسر عبداللہ کو لکھا کہ دیبل کا بحری راستہ چونکہ مسلمانوں کے لئے خطرناک ہے۔ اس لئے کچھ فوج لے جا کر امن قائم کر دو۔ لیکن عبداللہ لڑائی میں مارا گیا اور ان کی جگہ بدیل بجلی کو مقرر کیا گیا۔ مگر وہ بھی گھوڑے کی ٹھوکر کھانے سے گر کر مر گئے۔ اس کے بعد حجاج نے محمد بن قاسم ثقفی کو پوری تیاری کے ساتھ دیبل روانہ کیا۔

۷۱۱/۹۳ھ میں جمعہ کے دن وہ دیبل (ٹھٹھہ) پہنچا۔ بحری کمک بھی آگئی۔ اسی میں وہ منجنیق بھی تھی۔ جس کا نام "العروس" تھا اور جس کو پرانے زمانہ کی توپ سمجھنا چاہیے جو پانچ سو آدمیوں کی طاقت سے چلائی جاتی تھی۔ سب سے پہلے محمد بن قاسم نے اس منجنیق کے ذریعہ دیبل (ٹھٹھہ) کا قلعہ فتح کیا۔ پھر آگے بڑھ کر نیرون کو فتح کیا اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے سندھ پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

تین سال کے اندر کشمیر کی حد سے لے کر "کچھ" اور سمندر (بحر عرب) کے سرحد، مالوہ، راجپوتانہ مارواڑ اور دریائے راوی کے کنارے تک فتح کر کے قنوج (سندھ کی ایک چھوٹی سی ریاست) کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس کے پاس پچاس ہزار فوج تھی جس میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

۷۱۴/۹۶ھ میں خلیفہ ولید نے وفات پائی اس کی جگہ سلیمان تخت پر بیٹھا۔ اس وقت حجاج تو مر چکا تھا۔ جو مشرقی علاقہ کا حاکم تھا۔ مگر اس کے ماتحت حاکم محمد بن قاسم والی سندھ قتیبہ بن مسلم (والی ترکستان)، موسیٰ والی افریقہ وغیرہ زندہ تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو سلیمان کے خلیفہ ہونے کے مخالف تھے۔ سلیمان نے خلیفہ ہو کر ان سب سے بدلہ لیا چنانچہ اس کے حکم سے محمد بن قاسم کو ۷۱۴/۹۶ھ میں معزول کر کے عراق واپس بلا لیا گیا اور اس

لے فتوح البلدان۔ فتوح السند

Marfat.com

کے پورے خاندان کے ساتھ "واسط" کوفہ کے قید خانہ میں ا قید کر دیا گیا پھر خلیفہ کے خلاف سازش کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ راجہ داہر کی دو بیٹیوں کا جو قصہ عام تاریخوں میں بھی لکھا نظر آتا ہے، وہ سر تا پا غلط ہے۔

سندھ میں اسلامی حکومت محمد بن قاسم کے بعد

محمد بن قاسم کے بعد بہت سے لوگ ایک دوسرے کے بعد سندھ کے والی مقرر ہوئے۔ ان میں جنید خاص کر ذکر کے قابل ہے ۲۵ - ۷۲۶/۱۰۷ھ میں سندھ کا والی ہو کر آیا یہ بڑا بہادر اور مدبر تھا۔ سندھ کا معقول بندوبست کر کے سرحدی معاملات کے قطعی فیصلے کے لئے گوجروں کے ملک کی طرف بڑھا۔ سندھ سے پہلے مرمد (مارواڑ) آیا اور یہاں مانڈل (ویرم گام کے پاس) اور پھر وہج (دمن کے پاس پہنچا اور وہاں سے بھروچ بندرگاہ گیا۔ اس کے ایک افسر حبیب نامی نے اجین (مالوہ) پر دھاوا کیا۔ اور وہاں سے حملہ مارواڑ اور پھر بھیلمان (گوجروں کا پایہ تخت) کی طرف بڑھا اس کو فتح کر کے اور مال غنیمت لے کر سندھ واپس آگیا اسی زمانہ میں شہر چنپانیت (بیاس ندی سے پچھم کی طرف دس میل پر) کی ریاست مطیع ہوئی۔ اور اس طرح سندھ کی سلطنت میں بہت سے مقبوضات کا اضافہ ہوا۔ ان فتوحات کے صلہ میں جنید کو خراسان کا والی بنا دیا گیا۔ اس کے جانشینوں کے زمانہ میں عربوں کی طاقت اور وسعت مملکت دونوں گھٹنا شروع ہو گئیں اور دوسرا اہم تر معاملات کی وجہ سے سندھ کی طرف سے بے توجہی برتی گئی۔ مگر عباسی خلافت کے قائم ہونے کے بعد ایک نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ بعض والیوں نے ملکی انتظام میں اصلاحات کیں اور سرحدی علاقوں کے باشندوں کو آسودہ اور مطمئن کر دیا۔ چنانچہ خلفائے عباسیہ کے مستحکم دور حکومت میں سندھ کا علاقہ بھی مدت تک خوش حال رہا۔ نویں صدی عیسوی کی آخری چوتھائی میں دو عرب سردار ملتان اور منصورہ میں نیم آزاد ریاستیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خلیفہ کے اقتدار اعلیٰ کو برائے نام تسلیم کرتی تھیں۔ محمود غزنوی کے عہد میں یہ علاقہ اس کے زیر اقتدار آیا۔

فتح سندھ کی اہمیت اور نتائج

بعض مورخین نے مسلمانوں کی فتح سندھ کو برصغیر کی تاریخ ایک معمولی واقعہ قرار دیا ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں مسلمانوں

Marfat.com

کی فتوحات سندھ اور ملتان تک محدود رہیں اور برصغیر کے شمالی علاقہ کا بڑا حصہ ان کے اثر سے محفوظ رہا۔ تاہم فاتحین اپنے ساتھ ایک نیا مذہب اور ایک نئی تہذیب لائے تھے۔ جن کے اثرات نے مفتوحہ اقوام کی معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کو قطعی طور پر نیا رنگ دے دیا۔ انہوں نے برصغیر کا رابطہ اسلامی دنیا سے قائم کرکے تجارتی و ثقافتی ترقی کے بے شمار امکانات پیدا کر دیئے۔ خلیفہ کی طاقت کمزور ہونے کے ساتھ اس کا اقتدار بھی گھٹتا گیا۔ مگر اسلام کی کامیابی اس سے کہیں زیادہ دیرپا ثابت ہوئی۔ اور سندھ برصغیر میں مسلم اکثریت کا علاقہ بن گیا۔ نیز جب محمد بن قاسم سے تین سو سال بعد مسلم فتوحات کا دوسرا دور شروع ہوا تو یہ فاتحین ایک ایسے قطعہ اراضی میں داخل ہوئے جہاں اسلام کے پیرو کافی تعداد میں موجود تھے۔ اسلامی فتوحات کے دوررس نتائج کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سندھ بہت جلد علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔

نتائج و اثرات

۱۔ سندھ کی فتح سے اسلامی حکومت کا قیام اس خطہ میں ہوگیا اور ہندو حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

۲۔ اسلامی تہذیب نے اہل سندھ کے خیالات اور عقائد میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔

۳۔ اسلامی حکومت نے سندھ میں انصاف اور عدل قائم کرایا مقامی لوگوں کو مذہبی کامل آزادی تھی، ان کی املاک ان کے ہی تصرف میں رہیں مقامی لوگوں کی جائیدادیں خریدنے کی اجازت نہ تھی۔ مقامی لوگوں کو ملازمتوں پر بحال رکھا۔

۴۔ پروفیسر سید عبدالقادر لکھتے ہیں کہ "فتح سندھ کے بعد بے شمار علماء، مبلغین تاجر اور صناع عرب سے آکر سندھ میں آباد ہوگئے۔ مقامی باشندوں میں اسلام رائج ہوا، اور جب ہی یہ سرزمین فرزندانِ توحید کا گہوارہ بن گئی۔

۵۔ سندھ پر مسلمانوں کے کامیاب حملوں سے ہندوؤں کی عسکری اور سیاسی کمزوریاں سامنے آگئیں۔ اہل ہند کا طریق جنگ اور ان کے اختلافات مسلمانوں کے سامنے آگئے۔

۶۔ عرب سپاہیوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اس طرح یہ معاشرتی عمل دخل ایک نئے معاشرتی تجربے کا باعث بنا اور سندھ میں ایک نئی تہذیب نے جنم لیا جس کے رشتے مسلمانوں کی تہذیب سے ملتے تھے۔

Marfat.com

۷۔ ہندوستان میں ذات پات اور اونچ نیچ اور عدم مساوات کا دور دورہ تھا۔ اسلام نے مساوات کا سبق دیا۔ جس سے صدیوں سے کچلے ہوئے انسان آرام کا سانس لینے لگے۔ اور اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے لگے۔

۸۔ سندھ کی فتح سے مسلمانوں نے سندھ کی علمی تحقیقات سے استفادہ کیا۔ ہندو علم ہیئت نجوم اور جوتش میں غیر معمولی دلچسپی لیتے آئے ہیں۔ ان کی قدیم زبان سنسکرت میں ان علوم کی بے شمار کتب موجود تھیں۔ خلیفہ منصور کے زمانہ میں ایک ہندو عالم نے علم ہیئت پر ایک مشہور کتاب "سدھانت" دربار میں پیش کی۔ ابراہیم وازی نے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ اس طرح عربوں نے ہندوؤں سے ہندسے اعداد لکھنے کا طریقہ بھی سیکھا، ریاضی داں خوازی نے اس سلسلہ میں اہل ہند کے تجربات اور علمی تحقیقات سے استفادہ کیا۔

۹۔ حضرت عمر بن العزیز (از ۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) سر برآرائے خلافت ہوئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت خلافت راشدہ کے منہاج پر تھی اور فتوحات کا مقصد ملک گیری اور مصلحت اندازی نہ تھا۔ اس بنا پر راجگانِ ہند سندھ کو تبلیغی خطوط لکھے اور ان کو اسلام قبول کر لینے کی دعوتِ عام دی، ان لوگوں کو خلیفہ، اسلام اخلاق و عادات کی اطلاع پہلے ہی ہو چکی اس بنا پر ان میں سے متعدد راجاؤں نے جن میں داہر کا بیٹا جئیشہ بھی تھا اس دعوت پر لبیک کہا اور اپنے نام بھی عربی رکھ لئے۔ [۱]

سوال :۔ برصغیر میں مسلمانوں کے نظم حکمرانی پر مفصل بحث کیجئے۔

بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ حکومت عرصہ دراز تک سندھ خلافت کا مشرق میں سب سے آخری صوبہ تھا۔ جہاں تک عام اصول کا تعلق ہے اس صوبہ کا نظام بھی وہی تھا۔ جو دوسرے صوبوں میں رائج تھا۔ اندرونی نظام صوبہ دار کی صواب دید پر منحصر تھا۔ جو والی کہلاتا تھا۔ وہ اندرونِ ملک امن و امان قائم رکھتا تھا۔ اور ایک بڑی فوج کی مدد سے بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کرتا تھا۔ فوج چھاؤنیوں میں رہتی تھی۔ جو صوبہ کے مختلف حصوں میں قائم کی گئی تھیں۔ زمانہ گذرنے پر یہ چھاؤنیاں ترقی کر کے بڑے بڑے شہر بن گئے۔ اس وجہ سے کہ عرب سپاہیوں نے دیسی عورتوں سے نکاح کر کے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، منصورہ اور محفوظہ ان نئے شہروں میں سب سے

---

[۱] فتوح البلدان ص ۴۲۹

Marfat.com

زیادہ اہم تھے۔ ان چھاؤنیوں کے لئے مقام کا انتخاب صحت اور صفائی کے برقرار رکھنے والی سہولتوں اور رسد کی آسانیوں پر منحصر تھا۔ عرب خاص طور پر اپنے گھوڑ سواروں پر بھروسہ رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس شتر سواروں کے بھی دستے ہوتے تھے۔ اور محاصرہ کی مہم کے لئے ان کے پاس منجنیقیں بھی ہوتی تھیں علاوہ تنخواہوں کے سپاہیوں کو مال غنیمت میں سے بھی حصہ دیا جاتا تھا۔

محاصل

محاصل کا سب سے اہم ذریعہ زمین کا ٹیکس تھا۔ جو اصل پیداوار کا چوتھائی حصہ ہوتا تھا۔ اور جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ باغات اور نہروں سے آب پاشی کی جانے والی زمینوں پر محصول کس قدر زیادہ تھا۔ تندرست غیر مسلموں کو جزیہ دینا پڑتا تھا اور مسلمانوں کو زکوۃ اس شعبہ انتظام کی دوسری قابل لحاظ صورت اوقاف کے بڑے رقبے یا محصول سے مستثنیٰ زمینیں تھیں ان اوقاف کی آمدنی ان مسجدوں اور مدرسوں پر صرف ہوتی تھی۔ جن کے لئے وقف کئے گئے تھے۔

قانون اور عدالت

حکومت کی طرف سے قاضی مقرر تھے۔ جو مسلمانوں کے مقدمات کا قانون شریعت کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ عام اور سیاسی جرائم کی سزا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ لیکن دیوانی مقدمات کے لئے ہندوؤں کی خود پنچایتیں تھیں جو آزاد تھیں اور ٹھیک کام کرتی تھیں۔

رواداری

سندھ میں مسلمانوں کی حکمرانی کی نمایاں اور بنیادی خصوصیت انسانی روا داری کی پالیسی تھی۔ غیر مسلموں کے ساتھ معاملت میں صاف نظر آتی ہے۔ محمد بن قاسم اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھا کہ اس نے شروع ہی میں دمشق کے علماء سے ایک فتویٰ حاصل کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مندروں کو وہی حیثیت دینا چاہیے جو عیسائیوں کے گرجوں اور یہودیوں کے معبدوں کو خلافت کے زیر حکومت دوسرے ممالک میں حاصل تھی۔ برہمنوں کو وہی اختیارات اور حقوق حاصل تھے جو انہیں اپنے ہم قوم راجاؤں کے دورِ حکومت میں حاصل تھے۔ محاصل کی تشخیص اور وصولی کے

Marfat.com

کام میں وہ آزادی کے ساتھ نوکر رکھے جاتے تھے۔ اور ان کا افسر سابق راجہ داہر کا وزیر تھا اس کو سابقہ حکومت پر مقرر کر دیا گیا۔

س :۔ محمد بن قاسم کے کردار اور صلاحیتوں پر نوٹ لکھیں۔

محمد بن قاسم نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ یہ کم عمری ہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ ایک سپہ سالار اور بہادر سپاہی کی حیثیت سے غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت کا مالک تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ ہندوستان میں زیادہ عرصہ رہتا تو ہند کا سارا شمالی علاقہ فتح کر لیتا۔ اس نوجوان کے لئے یہ بات بہت قابل تعریف ہے کہ اس نے ان لوگوں کے ساتھ جو مطیع ہو گئے تھے۔ رواداری برت کر غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ سب مورخ اس طرز حکومت کی جو اس نے مفتوحہ ممالک کے انتظام کے سلسلہ میں اختیار کیا تعریف کرتے ہیں۔

فاتح سندھ کی رواداری

بج رائے حاکم سیوستان پر محمد بن قاسم حملہ کرنے کے لئے بڑھا۔ بج رائے مقابلہ کو تیار ہوا۔ اہل شہر نے کہا۔

"مسلمانوں کا مقابلہ مناسب نہیں، صلح و آشتی سے کام لیجیے۔ مسلمان صلح کی درخواست کو رد نہیں کریں گے۔ اور وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتے لہٰذا کشت و خون کا ہنگامہ برپا کرنا فضول ہے۔"

جس روز راجہ داہر مارا گیا تو بہت سے لوگوں نے درخواست پیش کی کہ ہم بخوشی مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ داخل اسلام کیے گئے۔ مگر دوسرے ہی روز فاتح سندھ نے اعلان کرایا۔

"جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ہماری طرف سے کوئی تعرض نہیں۔"

الور فتح ہو چکا ۔ تو محمد بن قاسم نے تعجب سے دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کے بڑے بت خانے نودھار کے آگے سجدے میں پڑے ہیں ۔۔ اس کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مندر ہے

Marfat.com

اس کے اندر محمد بن قاسم داخل ہوا اور واپس آ یا ایک چیز بھی نہیں بگاڑی بلکہ نکلنے کے بعد اعلان عام کر دیا۔

اس شہر کے باشندے ہر قسم کے ٹیکس اور محصول سے معاف کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر تارا چند سندھ راجہ چچ اور محمد بن قاسم دونوں کے کردار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"چچ (داہر کا باپ) متعصب فرماں روا تھا۔ اس نے بدھ مذہب کے پیروؤں کے لیے ظالمانہ قوانین جاری کیے تھے۔ ان لوگوں کے ہتھیار بند ہوتے۔ ریشمی کپڑے پہننے گھوڑوں پر زین لگا کر سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔ علاوہ بریں اس نے حکم دے رکھا تھا کہ یہ لوگ برہنہ پا اور برہنہ سر کتوں کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلا کریں۔

Marfat.com

غزنوی خاندان

۳۲۲ھ — ۵۸۲ھ
۹۳۴ — ۱۱۸۶

س :۔ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کا مختصر حال بیان کیجئے ۔ یہ کہاں تک درست ہے کہ ان حملوں کی غرض و غایت محض حصول دولت تھی ؟

پنجاب پر حملہ

سلطان محمود بچپن سے ہندوستان کو فتح کرنے کی آرزو رکھتا تھا ۔ چنانچہ اب اس نے ترکستان کی مہمات سے فارغ ہو کر ہندوستان پر فوج کشی کا عزم کیا ۔ اور ۱۰۰۱ء میں غزنین سے دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر پشاور پہنچا ۔ جے پال بھی غافل نہ تھا ایک لشکر جرار کے ساتھ جس میں بارہ ہزار سوار تیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی شامل تھے ۔ مقابلے کے لئے آگے بڑھا ۔ دریائے اٹک کے کنارے شدید ترین معرکہ آرائی کے بعد آخر کار سلطان محمود کو فتح ہوئی اور جے پال اپنے چند عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ گرفتار ہو گیا بعد میں سلطان نے اس کو اپنا باج گذار بنا کر رہا کر دیا ۔ جے پال اسلامی لشکر سے دو مرتبہ شکست فاش کھا چکا تھا ۔ اس لئے اس زمانے کے ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق وہ سلطنت کا اہل نہ تھا اور آگ کے سوا اور کوئی چیز اسے اس گناہ سے پاک نہ کر سکتی تھی ۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے انند پال کو تخت و تاج کا مالک بنا کر خود نذر آتش ہو گیا ۔

Marfat.com

ملتان پر فوج کشی

ملتان کے قریب ایک ہندو راجہ کی راجدھانی تھی۔ جس کا نام بھاٹیہ تھا۔ اس زمانہ میں یہاں کا حکمران بھی رائے یا بھیڑا رائے نامی بڑا مغرور و متکبر تھا۔ نہ سبکتگین کے ہندوستانی نائبوں کو نظر میں لاتا تھا۔ اور نہ جے پال کی پوری اطاعت، فرماں برداری کرتا تھا۔ ۳۹۵ھ میں سلطان نے بھاٹیہ پر حملہ کیا۔ کئی روز کی مسلسل لڑائی کے بعد راجہ کو شکست فاش ہوئی اور قتل کر دیا گیا، اس کے بعد دوسرے سال سلطان نے ملتان کے حاکم ابوالفتح کو اس کی سرکشی اور الحاد پروری کی سزا دینے کے لئے ملتان پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ ابوالفتح کو اس کا علم ہوا تو اس نے انند پال سے مدد کی درخواست کی چنانچہ انند پال سلطان کا راستہ روکنے کے لئے لاہور سے پشاور آیا۔ اب سلطان کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پہلے انند پال سے ہی جنگ کی جائے۔ چنانچہ میدان کارزار گرم ہوا۔ انند پال شکست خوردہ ہو کر کشمیر کی طرف بھاگ نکلا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر سلطان نے پھر ملتان کا قصد کیا اور ابوالفتح کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا کر غزنین واپس چلا گیا۔

معرکۂ پشاور اور نگر کوٹ کی فتح

۳۹۹ھ میں سلطان نے پھر ایک لشکر کثیر جمع کر کے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس اثناء میں انند پال اپنی پراگندہ اور منتشر طاقت کو جمع کر چکا تھا اس نے مقابلہ کے لئے بڑے پیمانہ پر تیاریاں کیں اور اس کے علاوہ دوسرے راجوں مہاراجوں سے بھی مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج اور دہلی و اجمیر کے راجاؤں نے دل کھول کر مدد کی۔ پشاور کے حوالی میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ ہندو عوام میں بھی اس جنگ کی وجہ سے اس قدر جوش و خروش تھا کہ عورتوں نے بھی زیور بیچ بیچ کر لشکریوں کی مدد کی اور جو غریب تھیں انہوں نے چرخہ کات کر اور مزدوری کر کے پیسے بچائے اور ان سے چیزیں خرید کر لشکریوں کو بھیجیں۔ سلطان کو ہندوؤں کے اس جوش خروش اور ان عظیم الشان تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے لڑائی شروع کرنے میں بڑی احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیا۔ چنانچہ پہلے حکم دیا کہ لشکر کے دونوں جانب خندق کھودی جائے، تاکہ کسی طرف سے ہندوؤں کا بس

Marfat.com

نہ چلے۔ پھر لڑائی شروع ہوئی تو ایک ہزار قدر انداز آگے بڑھے۔ اور دشمن پر تیر برساتے ہوئے ان کو اپنے لشکر سے قریب لے آئے۔ جب مسلمان ان سپاہیوں کے مقابلہ میں آئے تو اس احتیاط کے باوجود بیس ہزار سپاہی عین جنگ کی اس حالت میں دونوں طرف سے یورش کر کے خندق کو پھاند گئے اور اسلامی لشکر میں گھس آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار ہزار مسلمان وہیں کام آ گئے۔ اسلامی فوج اس اچانک اور غیر متوقع حملہ سے سراسیمہ ہو گئی۔ لیکن حسن اتفاق سے دفعتہً انند پال کا ہاتھی گولے بارود کی آواز سے بگڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگا۔ اس کے سپاہی یہ سمجھے کہ راجہ نے مسلمانوں کی تیغ زنی سے ڈر کر میدان چھوڑ دیا اور راہِ فرار اختیار کر لی ہے۔ اس بناء پر ان میں دل شکستگی پیدا ہو گئی اور وہ بھی بھاگ پڑے مسلمانوں کے لشکر نے دو دن اور دو رات تک ان لوگوں کا تعاقب کیا اور آٹھ ہزار کے قریب دشمن فوج کے سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ سلطان نے اس فتح کے بعد آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور نگر کوٹ (ضلع کانگڑہ) کا قلعہ بھیم کو سر کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ یہ قلعہ راجہ بھیم کے زمانہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا۔ یہ قلعہ مخزنِ اصنام تھا۔ ہر ایک راجہ نقد روپیہ، اشرفیاں، جواہرات اور قسم قسم کی عمدہ اور بیش قیمت چیزیں بطور نذرانہ یہاں بھیجتا تھا۔ اس بناء پر اس کی دولت و ثروت کا کوئی حساب نہ تھا۔ سلطان نے یہاں پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ قلعہ نے تیسرے دن ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ محمود نے ان سب کی جان بخشی کی۔

تھانیسر کی فتح

۴۰۵ھ مطابق ۱۰۱۴ء میں سلطان نے تھانیسر پر حملہ کیا اور یہاں کے مندروں اور بتوں کو منہدم کر کے اور بہت کچھ مالِ غنیمت لے کر غزنین واپس ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے دہلی کو مسخر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن مشیران کار نے کہا کہ دہلی کو فتح کرنے سے پہلے پنجاب کے سارے صوبہ پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اور چونکہ اس وقت انند پال کے ساتھ معاہدہ کے باعث ایسا ہونا مناسب نہ تھا۔ اس لئے اس ارادہ کو ترک کر دیا کہتے ہیں۔ تھانیسر کی مہم سے فارغ ہو کر سلطان غزنین گیا ہے تو اس کے ہمراہ تقریباً دو لاکھ لونڈی اور غلام تھے۔

کشمیر پر حملہ

۴۰۶ھ میں سلطان نے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور حدود کشمیر

میں پہنچکر قلعہ لوہ کوٹ کا جو بلندی اور مضبوطی میں مشہور تھا۔ محاصرہ کیا۔ لیکن موسم کی شدت اور سخت برف باری کے باعث فوج یہاں زیادہ قیام نہ کر سکتی تھی۔ اور ادھر اہل قلعہ کو کشمیر کی دارالسلطنت کی طرف برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ اس بنا پر سلطان نے محاصرہ اٹھا کر غزنین کا رخ کیا۔ واپسی میں اصل راستہ سے بھٹک جانے کے باعث لشکر کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ایک بڑی تعداد ہلاک ہوگئی

قنوج کی فتح

۴۰۹ھ میں قنوج پر فوج کشی کی یہاں کا قلعہ نہایت مضبوط اور بلند تھا اور پھر راجہ جے پال کا اس زمانہ میں لوہا بھی مانا جاتا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اسے مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ سلطان کی خدمت میں ایلچی بھیج کر اطاعت فرماں برداری کا عہد وپیمان کیا ایک روایت یہ بھی ہے کہ راجہ مسلمان ہوگیا تھا۔ لیکن اس کی تائید مستند تاریخوں سے نہیں ملتی۔

قنوج میں تین روز قیام کے بعد سلطان نے ایک دو معرکے اور سر کئے اس اثنا میں اس نے متھرا کی شہرت سنی تو عنان عزیمت اس طرف موڑ دی اور بلا مقابلہ فتح کر لیا۔

فتح سومنات

اس سے فارغ ہو کر وہ چند اور قلعوں اور کالنجر کی فتوحات میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ ۴۱۶ھ[1] میں سلطان نے سومنات اور اس کے بت خانہ کی شہرت سنی اور وہ اس کو فتح کرنے کے ارادہ سے بڑے ساز و سامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ راستہ میں اجمیر اور پٹن گجرات پر حملہ کر کے بہت کچھ مال و اسباب حاصل کیا۔ سومنات کا قلعہ نہایت بلند اور مضبوط تھا۔ دریا کا پانی اس کی فصیل تک پہنچتا تھا۔ لیکن مسلمان فوجی کسی طرح سیڑھیاں باندھ کر قلعہ کے اوپر پہنچ گئے اور اہل قلعہ پر چاروں طرف سے حملہ آور ہو گئے۔ سخت ترین معرکہ آرائی کے بعد آخر کار سلطان کو عظیم الشان فتح ہوئی اور بیش قیمت اموال غنیمت ہاتھ آئے اس سلسلہ میں بعض

---

[1] محمد قاسم فرشتہ نے فتح سومنات کا ۴۱۵ھ لکھا ہے۔ لیکن ابن اثیر نے اس کا ذکر ۴۱۶ھ کے واقعات میں کیا ہے اور مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے بھی تاریخ فرشتہ کے اپنے حواشی ج ۱ صہ ۱ میں اس کو صحیح بتایا ہے۔

Marfat.com

مورخین نے زیب داستان کے لئے عجیب و غریب قسم کی تفصیلات بیان کیں، جن کا اس موقع پر تذکرہ کرنا غیر ضروری ہے۔ جس سال سلطان نے سومنات فتح کیا، بغداد میں خلافت عباسیہ کا تخت نشین القادر باللہ تھا۔ خلیفہ بغداد نے فتح سومنات کی خبر سے مسرور ہو کر محمود کے پاس ایک "العقاب نامہ" بھیجا اور خراسان ہندوستان اور نیمروز و خوارزم کا سوائے سلطنت بھی عطا کیا۔ اس نامہ میں خلیفہ نے محمود اور اس کے بیٹوں اور بھائیوں تک کو القاب عطا کئے[1] چنانچہ سلطان کا لقب "کہف الدولہ دارا سلام" تھا[1]

حملوں کا مقصد

بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ سلطان بڑا حریص اور طماع تھا۔ اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں۔ ان کا مقصد اسلام کو فروغ دینا نہ تھا بلکہ طلب زر اور دنیا بھر کے احوال و امتعہ کو فراہم کرنا تھا۔ اس کے برعکس عام مورخین کا جو رجحان ہے۔ وہ اسی سے ظاہر ہے کہ غازی کا لقب سلطان کے نام کا جزو ہو گیا ہے اس کا نام سنتے ہی بت شکنی کا تصور ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے اس باب میں ہماری رائے یہ ہے کہ دونوں فریق افراط اور تفریط کا شکار ہیں اور انہوں نے سلطان کے اخلاق و عادات اور اس کے رجحان و عواطف کا جائزہ تاریخی بیانات کی روشنی میں غیر جانب داری سے نہیں لیا۔ جہاں تک سلطان کے حریص ازر و سیم ہونے کا تعلق ہے۔ بڑی حد تک اس کو اس الزام سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ابن اثیر بھی سلطان کے مجاہدانہ کارناموں سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود لکھتے ہیں، "سلطان میں کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ وہ ہر طریقہ سے اموال لینے کی کوشش کرتا تھا اس کے بعد یہ واقعہ لکھا ہے کہ سلطان نے سنا، نیتاپوری ایک بہت متمول اور دولت مند شخص ہے۔ سلطان نے اس کو غزنین بلایا اور کہا مجھے خبر ملی ہے کہ تو قرامطہ کا ہم خیال ہے"۔ یہ شخص سلطان کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔ "میں قرامطی تو نہیں ہوں، البتہ میرے پاس دولت ہے اس میں سے جتنی دولت آپ چاہیں لے سکتے ہیں"۔ سلطان نے اس کی ساری دولت پر قبضہ کر لیا اور اس کو صحت عقیدہ کی سند لکھ کر دے دی[2]۔ لیکن بایں ہمہ یہ کہنا غلط ہے۔ سلطان محض ایک ڈاکو اور صرف لٹیرا تھا۔ اس کی لڑائیوں کا مقصد بجز زر و سیم جمع کرنے کے کوئی اور نہ تھا۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود کے زمانہ میں ہندوستان میں راجپوت آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور پنجاب کے ہندو

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۱۴ [2] تاریخ الکامل ج ۹ صد ۱۲۹

Marfat.com

شاہیہ خاندان نے عام طور پر اپنی متشددانہ پالیسی اور جابرانہ حکومت کے ذریعہ عوام میں بددلی پیدا کر رکھی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خود سلطان کی فوج میں ہندو کثرت سے شامل تھے اور سلطان ان پر اتنا بھروسہ کرتا تھا کہ اس نے ایک مرتبہ مسلمان جنرل نیا تیگن کو اس کی بغاوت اور سرکشی کی سزا دینے کے لئے اپنی فوج کے ہندو کمانڈر تلک کو بھیجا تھا۔ ؎

کچھ ہندوستان کے ان اندرونی اضطراب انگیز حالات اور عام بے چینی کے باعث اور کچھ ہندوؤں کے اس خیال کو باطل کرنے کی نیت سے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہوتا ہے۔ وہ بتوں کے منشا اور ارادہ سے ہی ہوتا ہے اور تمام نفع وضرر کی کنجیاں انہیں کے قبضہ میں ہیں۔ محمود نے ہندوستان پر پے درپے حملے کئے اور ان حملوں میں اس کی توجہ کا بڑا مرکزدہ مقامات رہے جہاں بڑے بڑے شان دار مندر اور بت خانے تھے۔ اس سلسلہ میں محمود کا سب سے مشہور اور بڑا کارنامہ فتح سومنات ہے۔ سلطان نے یہ حملہ کیوں کیا اور اس سے اس کا مقصد کیا تھا۔ علامہ ابن کثیر نے اس کی جو وجہ لکھی ہے۔ اس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں "یمین الدولہ محمود جب کبھی ہندوستان میں کوئی فتح حاصل کرتا اور کسی بت کو توڑتا تھا، ہندو کہتے تھے" سومنات ان بتوں سے ناراض ہوگیا ہے۔ ورنہ اگر وہ ان سے راضی ہوتا تو ان لوگوں کو ہلاک کر دیتا جو ان بتوں کے ساتھ بُرا سلوک کر رہے تھے۔ سلطان کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے سومنات کو ہلاک کر دینے کا عزم کر لیا۔ کیونکہ اس کا گمان یہ تھا کہ ہندو سومنات سے محروم ہو جائیں گے اور اپنے جھوٹے دعویٰ کو آنکھ سے دیکھ لیں گے تو اسلام میں داخل ہو جائیں ؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان کا طریقۂ جنگ اور اس کے بعد اس کی بے دریغ لوٹ مار، عام قتل و اسیر اور عبادت گاہوں کا ہدم یہ وہ چیزیں ہیں، جن کو احکام اسلام کے ساتھ مطابقت کا شرف حاصل نہیں ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا قطعاً بے بنیاد ہے کہ اس کے کارناموں میں مذہبی جذبہ کو ذرا دخل نہیں تھا۔ اور اس کی غرض صرف لوٹ مار اور غارت گری تھی۔ سلطان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے قول و قرار کا کتنا پاس اور لحاظ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ تھانیسر کی فتح کے بعد جب سلطان نے دہلی پر حملہ کا ارادہ کیا۔ تو ارکان دولت نے کہا کہ دہلی اسی وقت فتح ہو سکتی ہے۔ جب کہ تمام صوبہ پنجاب پر اسلامی قبضہ ہو جاتے اور انند پال کی طرف سے کوئی

؎ الکامل ج ۹ ص ۱۳۹ ؎ تاریخ الکامل ج ۹ ص ۱۱۸

Marfat.com

خدشہ اور خطرہ باقی نہ رہے۔[1] لیکن اس وقت چونکہ انند پال کے ساتھ معاہدہ تھا اور اس نے اب تک معاہدہ کے خلاف کوئی بات نہ کی تھی۔ اس لئے سلطان نے دہلی کو فتح کرنے کی غرض سے انند پال پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور تسخیر دہلی کا ارادہ ہی ترک کر دیا علاوہ بریں سلطان کے حالات میں مورخین جگہ جگہ لکھتے ہیں کہ وہ شدید جنگ کے دوران یا اس کے شروع ہونے سے پہلے بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو جاتا اور اپنی فتح کے لئے دعائیں مانگتا تھا۔ اس کے اس جذبہ احترام دین واہل دین کا اثر تھا۔ اس نے طوس میں حضرت علی بن موسی الرضا کے مشہد کی دوبارہ تعمیر کرائی تھی۔ جس کو اس کے باپ ناصر الدین سبکتگین نے ویران کر دیا تھا۔[2] بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سلطان خلیفہ بغداد کا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس الزام کی حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ محمود نے عباسی خلیفہ بغداد القادر باللہ سے درخواست کی تھی کہ سمرقند مجھے دے دیا جائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو مسترد کر دیا اور جواب میں ایک نہایت تہدید آمیز خط لکھا۔ محمود نے اس پر غصہ سے برانگیختہ ہو کر ایلچی سے کہا۔ تم لوگ غالباً یہ چاہتے ہو کہ میں ہزاروں کوہ پیکر ہاتھیوں سے دار الخلافت کو روند ڈالوں اور بارگاہ خلافت کی خاک ان ہاتھیوں پر لاد کر غزنین لے آؤں۔ غالباً محمود کے اس فقرہ سے مورخین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ خلافت عباسیہ کے ایک علاقہ (سمرقند) کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اسی واقعہ میں یہ مذکور ہے کہ محمود کے اس فقرہ کے جواب میں جب خلیفہ بغداد نے پھر ایک ایلچی ایک خط کے ساتھ بھیجا، جس میں اصحاب فیل کی طرف اشارہ کر کے محمود کو اس سے خبردار کیا گیا تھا۔ اگر اس نے واقعی خلافت عباسیہ پر ہاتھیوں کی مدد سے حملہ کیا تو اس کا حشر وہی ہوگا، جو قرآن مجید کے بیان کے مطابق مکہ پر ہاتھیوں سے حملہ کرنے والوں کا ہوا تو محمود کو اس درجہ تاثر ہوا کہ وہ خط کا یہ مضمون معلوم کرتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پھر جب ہوش میں آیا تو بہت رویا، ایلچی سے اپنی پچھلی غلطی کی معذرت کی اور اسے بیش قیمت تحفے تحائف دے کر بغداد واپس کیا،،[3]

اثرات

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگرچہ سلطان محمود نے ہندوستان پر

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۸۴ [2] تاریخ الکامل ج ۹ ص ۱۳۶

[3] تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۸۶

Marfat.com

پے در پے سترہ حملے کر کے یہاں کی فوجی طاقت کو بہت کمزور کر دیا اور پنجاب کو دولت غزنویہ سے ملحق کر کے اور وہاں اپنا ایک نائب اور ایک دستہ فوج مقرر کر کے بعد میں آنے والوں کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنے اور اپنی مملکت کو وسیع تر کرنے کے امکانات پیدا کر دیئے۔ تاہم اس نے خود ہندوستان میں کوئی مستقل اسلامی نظام قائم نہیں کیا۔ اس کے بے پناہ حملوں کے اثر سے کچھ لوگ برضا و رغبت اور کچھ جبراً و قہراً مسلمان ضرور ہوئے۔ لیکن بحیثیت مجموعی سوسائٹی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ یعنی یہ کہ سلطان محمود کے حملے اس تیز و تند آندھی کی طرح ہوتے تھے۔ جو بڑی تیزی سے گرد و غبار کا جھنکار اڑاتی درختوں کو گراتی اور شکستہ و خستہ دیواروں کو شکست و ریخت کرتی آتی ہے اور گذر جاتی ہے اور اپنے پیچھے تخریب و بربادی کے چند نقوش کے سوا اور کوئی چیز بطور یادگار نہیں چھوڑتی۔

س ۳۔ سلطان محمود غزنوی کے کردار کا ایک عظیم جرنیل اور علم و ادب کے سرپرست کی حیثیت سے تفصیلی جائزہ لیجئے ص ۲۶۶

محمود کی شاندار فتوحات برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے غزنہ کی افواج کے لئے یہ علاقہ بالکل اجنبی تھا۔ اور یہاں کے حالات کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود تھیں اس کے باوجود ہندوستان میں وہ دور تک گئیں اور ہر جگہ ان کو کامیابی ہوئی۔ محمود غزنوی کا شمار دنیا کے عظیم الشان جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ اس کی فوجی قابلیت اور مہارت بے مثال تھی۔ اس نے تلواروں کے سایہ میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ جنگوں میں شریک ہوتا تھا۔ اس طرح اسے عملی جنگ کا تجربہ حاصل ہوا۔ اس کا باپ اس کے بچپن میں ہی اس کی جنگی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ محمود جسمانی اعتبار سے بڑا مضبوط اور صحت مند آدمی تھا۔ اس کی تیس سالہ مسلسل جدوجہد سے بھرپور زندگی اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ ہندوستان کی مہمات کے دوران اس نے کئی پر خطر سفر طے کئے۔

ایک عظیم اور کامیاب جرنیل کی حیثیت سے یورپ کے بہت سے تاریخ دانوں نے اسے "نہ تھکنے والا سورما" کے نام سے یاد کیا ہے۔ کچھ مورخوں نے تو اسے نپولین کا ہمسر قرار دیا ہے اس کی جنگی صلاحیت اور فاتح کی حیثیت سے اس کے مقابلہ میں تاریخ سے بہت کم نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ میدان جنگ میں ہمیشہ وہ صف اول میں دکھائی دیتا اور سفر کی تکالیف سپاہیوں کی مانند

Marfat.com

نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ اس کے عزم کو دیکھ کر سپاہیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے تھے اور وہ نہایت بہادری اور بے جگری سے دشمن سے لڑتے تھے۔

محمود غزنوی کے ایک بہترین جرنیل ہونے کا یہ بہت بڑا ثبوت کہ اس کے جسم پر لڑائیوں میں لگنے والے کوئی بہتر (۷۲) کے قریب زخموں کے نشانات تھے۔ اس سے نتیجہ ہے کہ وہ ہر لڑائی میں خود شریک ہوتا اور لڑائی لڑتا، اس نے ہندوستان پر سترہ کے قریب حملے کئے لیکن اسے ایک بار بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔ ایک انگریز مورخ نے سلطان محمود کی جنگی صلاحیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی بہادری اور دلیری سے زیادہ اہم بات یہ قابل قدر ہے کہ وہ اتنی فوجوں کو جب آمد و رفت کے ذرائع اس قدر دشوار تھے ہزاروں میل دور کیسے لے آتا تھا اور پھر ایک بار نہیں بلکہ کئی دفعہ ان فوجوں کا لانا اور لے جانا کیوں کر ممکن ہے۔

محمود ایک زبردست فاتح تھا اس کے حملوں میں بجلی کی سی سرعت ہوتی تھی وہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع کم دیتا تھا۔ اور برق رفتاری کے ساتھ دشمن کے سر جا پہنچتا تھا۔ ان پر مکمل فوجی تیاری کے بعد حملہ کرتا تھا۔ وہ ایک پیدائشی جرنیل تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی ریاست کو صرف طاقت کے ذریعہ ایک وسیع اور خوش حال سلطنت میں تبدیل کر دیا تھا۔

ایک انگریز مورخ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ محمود غزنوی نے مشرق میں سکندر اعظم کی فتوحات کا مقابلہ کیا۔ بلکہ اس سے بھی سبقت لے گیا۔ اصفہان سے لے کر بندھیل کھنڈ تک اور سمرقند سے لے کر گجرات تک اس نے ہر مخالف کو مطیع کیا اور ہر مرتبہ اپنے حریف کو شکست دی۔

سومنات پر حملہ کرنے کے بعد جاٹوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تو دریائے سندھ پر اس نے جنگی کشتیوں کی تیاری کا حکم دیا۔ ہر جنگی کشتی میں بیس بیس کے قریب بہترین تیر انداز اور آتش بازی کا سامان رکھ دیا کیونکہ جاٹوں کے پاس بھی جنگی کشتیاں تھیں۔ اس موقع پر جنگی کشتیوں کے بیڑے کا تیار کرنا اس کی جنگی مہارت اور دور بینی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

علم و ادب کے سرپرست کی حیثیت سے

سلطان محمود اسلامی تاریخ کا گوہر شب چراغ ہے۔ وہ جس حیثیت کا فاتح اور کشور کشا تھا اسی حیثیت سے علم دوست اور علم پرور تھا۔ وہ عالم شاعر اور مصنف تھا۔ اس کے دربار میں فردوسی سے شاعر البیرونی سے حکیم اور اس کے عہد کے علماء اور فضلاء

Marfat.com

کا مجمع رہتا تھا۔ علم و فضل میں وہ کسی سے کم نہ تھا۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ عربی سے بھی واقف تھا فقہ و ہیئت اور عجم و عرب کی تاریخ میں پوری دستگاہ رکھتا تھا اس کی ہیئت دانی کے متعلق ابن خلکان کا بیان ہے" علم ہیئت کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کا سماع کرتا تھا اس کے متعلق علما سے سوالات کرتا تھا [۱]

ابن اثیر کا بیان ہے" وہ علما اور اصحاب کمال کا قدر دان تھا۔ ان کا اعزاز و اکرام کرتا اور ان کے ساتھ سے پیش آتا۔ دور دور سے علما آ کر اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ جنھوں نے اس کے لئے کتابیں بھی لکھیں" [۲]

تاریخ الفسٹن میں ہے" محمود کے فخر اور اعزاز کا واقعی سبب یہ تھا کہ وہ سپہ گری اور بہادرانہ زندگی کے باوجود علوم و فنون کے ترقی دینے میں بڑا سرگرم تھا۔ یہ اس کے دور کی عجیب و غریب خوبی تھی اور آج تک کوئی بادشاہ علوم پروری میں اس سے سبقت نہ لے جا سکا۔ باوجودیکہ محمود نہایت کفایت شعار تھا مگر علوم و فنون کے باب میں بڑا فیاض واقع ہوا تھا۔ اس نے خاص غزنی میں ایک بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا۔ اور مختلف زبانوں کی عجیب و غریب کتابیں جمع کیں۔ اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے اس نے بہت سا روپیہ مقرر کیا اور طلبہ اور ارباب کمال کے وظائف مقرر کئے، علما و مشاہیر کے ساتھ اس احترام سے پیش آتا تھا کہ اس کے دارالسلطنت میں ارباب کمال اتنے جمع ہو گئے تھے کہ ایشیا کے کسی بادشاہ کو یہ فخر نہ حاصل تھا" [۳]

محمود نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔ جس میں بہترین کتب کا ذخیرہ جمع کیا۔

علمی دربار میں علما سے فقہ و حدیث و کلام کے مسائل دریافت کرتا جو مسلک پسند آتا، اختیار کرتا۔ چنانچہ استوا علی العرش کے مسئلہ پر متکلم کا مسلک پسند آیا اور قبول کیا۔ [۴]

محمود خود بلند مرتبہ کا شاعر تھا، پاکیزہ مذاق رکھتا تھا۔ اس نے شاعری کا محکمہ قائم کیا اس کا عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر افسر مقرر کیا۔ چار سو شعرا دامن دولت سے وابستہ تھے۔

حمد اللہ کا بیان ہے" محمود علماء و شعراء کا قدر داں تھا۔ چار لاکھ دینار سالانہ ان پر صرف کیا کرتا تھا۔

---

[۱] ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۸۶
[۲] ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۲۶۱
[۳] تاریخ الفسٹن ترجمہ اردو صفحہ ۵۵
[۴] البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۰

Marfat.com

غوری اور ان کے غلاموں کی سلطنت

س ۸:۔ برصغیر میں شہاب الدین محمد غوری کی مہمات کا مختصر حال بیان کیجئے۔

ہندوستان پر حملہ آوری کے مقاصد

سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر پے درپے حملے کئے ہندوستان پر اس کے حملہ آور ہونے کے کئی مقاصد تھے۔

اولاً وہ دیندار مسلمان تھا۔ اس زمانہ میں ملتان اور سندھ کے بعض حصوں میں ملحد قرامطہ نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اور ان کے ذریعہ سے بے دینی کی اشاعت ہو رہی تھی۔ سلطان نے ان سے اقتدار کو ختم کرنا چاہا۔

دوسرے غوری سلطنت کی بنیاد غزنوی سلطنت کے کھنڈروں پر قائم کی گئی تھی۔ وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے پنجاب سے غزنوی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے ہندوستان میں مستحکم سلطنت کے قائم کرنے کا تخیل بھی اس کے پیش نظر تھا۔ ان گوناگوں مقاصد کے لئے اس نے ہندوستان پر مسلسل حملے کئے اور یکے بعد دیگرے اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل کرتا گیا۔

قرامطہ کی بیخ کنی

چنانچہ سب سے پہلے اس نے ۱۱۷۵ء / ۵۷۱ھ میں ملتان پر حملہ کیا پھر سندھ کے شہر اوچھ کو فتح کیا ان دونوں مقاموں سے اس نے قرامطہ کی حکومت کی بیخ کنی کر دی۔

Marfat.com

غزنوی سلطنت کو مٹانا

اس کے بعد اس نے ہندوستان سے غزنوی سلطنت کے نشان کو مٹانے کیلئے پے در پے حملے کئے۔ اس غرض سے اس نے جموں کے راجہ چکر دیو سے دوستی کرلی تھی اور اس کی دعوت پر آکر غزنوی سلطنت پنجاب کے خلاف اس نے اپنی فوجی مہم کا آغاز کیا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں سب سے پہلے اس نے پشاور کی شہر پناہ پر دستک دی۔ ۱۱۷۹ء / ۵۷۵ھ میں پشاور پر قبضہ کرلیا۔ دو سال کے بعد اس نے لاہور پر چڑھائی کی۔ پھر ۱۱۸۰ء/۵۸۱ھ میں وہ دوبارہ پنجاب آیا اور ۵۸۲ھ میں اس نے لاہور فتح کرکے غزنوی شاہزادے خسرو ملک کو گرفتار کرلیا اور ہندوستان سے غزنوی سلطنت کا نشان مٹ گیا۔

ہندوستان میں مستحکم سلطنت کی بناء تاسیس

تیسرے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے سب سے پہلے ۱۱۷۸ء/۵۷۴ھ میں گجرات پر چڑھائی کی اور اس کے صدر مقام نہلواڑہ کا محاصرہ کیا۔ مگر گجرات کے راجہ مول راج اور اس کے چچا راجہ بھیم بگھیلا نے اس کو شکست دی۔ دوسرا حملہ اس نے ۱۱۹۱ء/۵۸۷ھ میں بھٹنڈا پر کیا اور اس کو فتح کیا۔ یہ مقام دلی کے راجہ پرتھوی راج کے قبضہ میں تھا۔ سلطان کی واپسی میں پرتھوی راج نے اس کا تعاقب کیا۔ تراوڑی کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ غوری نے شکست کھائی اور بھٹنڈا اس کے قبضہ سے نکل گیا ایک سال کے بعد ۱۱۹۲ء/۵۸۸ھ میں سلطان دوبارہ آیا اور اسی تراوڑی کے میدان میں ان دونوں کا مقابلہ ہوا۔ پرتھوی راج لڑائی میں مارا گیا اور دہلی اور اجمیر کی سلطنتیں اس کے قبضہ میں آگئیں اور مشہور قلعے سرستی، ہانسی، سمانہ اور کرام وغیرہ اس سلطنت کی حدود میں داخل ہوگئے۔ سلطان نے پرتھوی راج کے قدیم خاندانی اعزاز کو برقرار رکھا۔ اس کے لڑکے کو اجمیر کے تخت پر بٹھا دیا اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت بنا کر غور واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک نے پہلے کرام پھر دلی کو اپنا پایہ سلطنت بنایا۔ اس کے بعد قطب الدین نے اپنے طور پر فتوحات میں اضافہ کیا۔ اسی سال میں ۱۱۹۲ء/۵۸۸ھ میں میرٹھ فتح ہوا۔ ۱۱۹۴ء/۵۸۹ھ میں علی گڑھ قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد ۱۱۹۵ء/۵۹۰ھ سلطان شہاب الدین پھر ہندوستان آیا اور اٹاوہ کے قریب چنداور میں قنوج کے راجہ جے چند کو

Marfat.com

شکست دی وہ لڑائی میں مارا گیا۔ قنوج سے بنارس تک کا علاقہ غوری سلطنت کے حدود میں داخل ہو گیا۔ پھر قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۴ء/۵۹۱ھ میں گجرات کے پایۂ تخت پٹن کو فتح کیا اور ۱۱۹۵ء (۵۹۲ھ) میں اس نے انہلواڑہ کو لوٹا۔ راجہ بھیم نے شکست کھائی۔ پھر تیسرے سال ۱۱۹۶ء/۵۹۲ھ میں تیسری مرتبہ گجرات پر حملہ کیا اور اپنے مقبوضات کے لئے نائب حکومت مقرر کر کے چلا گیا مگر گجرات پھر قبضہ سے نکل گیا۔ دوسری طرف ۱۱۹۵ء/ ۵۹۳ھ میں چندراولی آبو اور ناگور کے راجاؤں نے اجمیر پر قبضہ کرنا چاہا۔ مگر ایبک نے سب کو شکست دے دی۔ اسی طرح ۱۱۹۷ء/۵۹۳ھ میں اس نے بیانہ کو فتح کیا اور گوالیار کے محاصرہ میں وہاں کے راجہ نے خراج دینا منظور کیا۔ پھر اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی کو فوج دے کر بھیجا۔ جس نے ۱۱۹۹ء/۵۹۶ھ میں بہار کو فتح کیا پھر آگے بڑھ کر بنگال کے پایۂ تخت ندیا پر قبضہ کر لیا دوسری طرف کالنجر کے راجہ پر حملہ ہوا۔ اس نے اطاعت قبول کر لی۔ پھر مہوبہ کالپی اور بدایوں اسلامی اقتدار میں داخل ہوئے یہاں تک ۱۲۰۵ء/۶۰۲ھ میں سلطان شہاب الدین غوری آخری مرتبہ ہندوستان آیا۔ اس وقت ہندوستان کی اسلامی سلطنت پشاور سے بنگال تک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔

س: شہاب الدین محمد غوری کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالئے۔ راجپوتوں کے مقابلہ میں اس کی کامیابی کے اسباب تحریر کیجئے؟

شہاب الدین محمد غوری، ۱۱۴۲ء/۵۳۲ھ میں غور میں پیدا ہوا اور اپنے بھائی غیاث الدین محمد کے بادشاہ ہونے پر اس کا شریک سلطنت بنا۔ پھر بھائی کی وفات کے بعد پوری سلطنت کا مالک بنا۔ سلطان شہاب الدین متقی دیندار، شجاع، عدل پرور تھا۔ رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔ اور ان کے معاملات کا منصفانہ فیصلہ کرتا تھا۔ غزنی کا قاضی ہر ہفتہ میں شنبہ سے سہ شنبہ تک چار دن اس کی موجودگی میں امیر، حاجب و امیر داد کے مشترکہ اجلاس میں مقدمات و معاملات کی سماعت کرتا تھا اور اگر کوئی صاحب معاملہ براہ راست توجہ سلطانی کو منعطف کرانا چاہتا تھا تو اس کی سماعت خود کرتا تھا اور قوانین احکام شریعت کے مطابق نافذ کئے جاتے تھے وہ خود صاحب علم تھا۔ فقہاء و علماء اس کی مجلس میں پابندی سے شریک رہتے تھے اور فقہ اور دیگر علوم دین کے مسائل زیر بحث رہتے تھے وہ مذہباً شافعی تھا۔ صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی کو سلطان سے تقرب حاصل تھا۔ وہ عقیدت مندی کے ساتھ ان سے پیش آتا، ہفتہ میں ایک دن شاہی محل میں

Marfat.com

مجلس وعظ منعقد ہوئی امام رازی کے بیان سے کبھی کبھی روتے روتے اس کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔

غزنی کے دربار میں علماء و شعراء اور فضلاء بہ کثرت موجود تھے۔ جن میں سے بعض اہل علم شہاب الدین غوری کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے اور علم عرفان کی خدمت کے لیے یہیں توطن اختیار کیا۔

چنانچہ سید کمال الدین عثمان ترمذی مشہور علماء دین میں سے تھے وہ سلطان شہاب الدین کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے، کیتھل میں اقامت اختیار کر کے علم کی خدمت میں مصروف رہے۔ سنہ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

اس دور کے دوسرے اہل علم شیخ سراج الدین محمد بن عثمان جوزجانی ہیں۔ وہ فقہ اصول اور علوم دینیہ میں دست گاہ رکھتے تھے۔ سلطان شہاب الدین نے ۵۸۳ھ میں لاہور کی قضاۃ عسکر پر مامور کیا۔

اس طرح شیخ خطیر الدین محمد بن عبد الملک جرجانی اس عہد کے ممتاز اہل علم و ارباب صلاح میں سے تھے۔

محمد غوری اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ صرف ایک لڑکی تھی اسے یہ شوق تھا کہ غلاموں کو خرید کر خود اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتا اور انہیں اپنی اولاد کی مانند پالتا تھا۔ یہ غلام اس کی تربیت پا کر بڑی شخصیت کو پہنچے۔ اور وہی اس کے جانشین بن کر غوری سلطنت کے دعویدار ہوئے اور وہ سلطان تاج الدین یلدوز، سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان ناصر الدین قباچہ تھے۔ ان میں سے اول الذکر یلدوز نے غزنی میں اس کی جانشینی کی اور پشاور کے اس پار کا علاقہ اس کے زیر تصرف رہا۔ قطب الدین ایبک دہلی کی سلطنت پر بیٹھا اور ناصر الدین قباچہ کا تعلق بھی ہندوستان ہی سے تھا۔ اس نے سندھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ دنیا کی کسی قوم نے غلاموں کو اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کا شرف نہیں بخشا، سلطان انہیں اپنی اولاد ہی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک امیر نے جب اولاد نرینہ نہ ہونے کا افسوس کیا تو سلطان نے اپنے غلاموں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ بادشاہوں کے یا دو فرزند ہوتے ہیں۔ میرے چالیس فرزند ہیں۔ جو میرا نام اور میری حکومت قائم رکھیں گے،

راجپوتوں کے مقابلہ میں کامیابی کے اسباب محمد غوری میں اعلیٰ درجہ کی عسکری صلاحیتیں

Marfat.com

تھیں۔ اور وہ بہترین جنگی پلان کی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ ایک انتہائی بلند حوصلہ اور انتھک اور دور اندیش تھا اس کے کردار میں زبردست قوت مدافعت اور لمبے عرصہ تک مصائب مشکلات برداشت کرنے کی خصوصیات موجود تھیں اس کے بالمقابل راجپوتوں کے جرنیلوں میں وہ استعدادیں اور صلاحیتیں موجود نہ تھیں۔ اس وجہ سے جب ان کا مقابلہ سلطان کے ساتھ ہوتا تو وہ ناکامی کا منہ دیکھتے۔

۲۔ مسلمان جب ہند کی سرزمین میں قدم رکھتے تو ان کے دلوں میں جہاد فی سبیل اللہ کا جوش موجزن ہوتا تھا۔ ان کے دل جذبہ ایمانی سے لبریز ہوتے تھے۔ اس جاندار نظریئے نے مسلمانوں کے دلوں سے موت کا خوف دور کر دیا تھا۔ بلکہ ان کا اس بات پر ایمان تھا کہ اگر میدان جنگ میں مارے گئے تو وہ شہید ہوں گے۔ اس جذبہ نے مسلمانوں کے دلوں میں اس قدر بہادری اور شجاعت بھر دی تھی کہ باوجود قلیل تعداد اور غریب الوطنی کے باطل کی بڑی سے بڑی قوت سے بلا خوف ٹکرا جاتے اور باطل کو پاش پاش کر دیتے۔

۳۔ پنجاب کی سرزمین دفاعی لحاظ سے اور وسائل کی فراوانی کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتی تھی کوئی بھی دور اندیش حملہ آور شمالی حکومت حاصل کرنے کے لئے پنجاب پر قبل از دیگر فتوحات، قبضہ کرنا فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ سرہند لاہور اور دہلی کے مابین دفاعی پوزیشن رکھتا تھا۔ لہٰذا غوری نے پنجاب اور سرہند پر پہلے قبضہ کر لیا۔ جس نے محمد غوری کے دفاع کو مضبوط کر دیا۔

۴۔ افغانستان غزنی اور غور کے لوگ مضبوط، جسم اور زبردست قوت مدافعت کے مالک تھے۔ میدان جنگ میں وہ برق رفتار اور تیز تھے۔ ہندی سپاہی کاہل اور آرام پسند تھے۔ ہندوؤں کے جنگی ہاتھی خود ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے تھے۔

۵۔ راجپوت بہادر قوم تھے۔ لیکن نفاق کی بیماری نے ان کی قوت کو بے کار کر دیا تھا۔ پرتھوی راج حاکم دہلی اجمیر اور جے پال حاکم قنوج ایک دوسرے کے شدید مخالف اور دشمن تھے۔ شہاب الدین کے مقابلہ میں متحد نہ ہو سکے۔ پرتھوی راج اگرچہ بہادر تھا۔ لیکن دور اندیش نہیں تھا۔

س: قطب الدین ایبک کے حالات زندگی بیان کیجیے اور اس کے کارناموں پر مفصل بحث کیجیے۔

قطب الدین ایبک نسلاً ترک تھا۔ ایبک کے معنی شل ہونا ہیں، چونکہ اس کا ایک ہاتھ شل تھا

Marfat.com

اس لیے اسے ایبک کہتے تھے۔ جب اسے نیشاپور سے لایا گیا۔ تو یہاں کے ایک قاضی القضاۃ فخر الدین عبدالعزیز الکوفی نے جو امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے تھے۔ خرید کر لیا اور اپنی اولاد کی طرح اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔ مکتب میں داخل ہو کر قطب الدین نے قرآن مجید، ضروری مسائل فقہ اور ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ایک شخص قاضی فخر الدین سے خرید کر اسے غزنین لایا اور سلطان محمد غوری کے سامنے پیش کیا۔ سلطان بڑا مردم شناس تھا۔ اس نے جوہر قابل سمجھ کر خرید کر لیا اور پھر اپنے اہتمام سے اس کو فوجی اور انتظامی تعلیم و تربیت دی۔ چنانچہ صاحب طبقاتِ ناصری کا بیان ہے کہ "اگرچہ قطب الدین صورۃً خوبصورت نہ تھا۔ تاہم اس کے اخلاق و عادات نہایت عمدہ تھے۔ وہ بڑا شہ سوار، بہادر، عقلمند فیاض، سخی، بزرگانہ، خصائل کا مالک، درست کار اور راست باز انسان تھا۔ لوگ عام طور پر اس کی مدح کرتے تھے۔[1]

قطب الدین ایبک کے کارناموں کا جائزہ

قطب الدین کی زندگی کے القابات سے ظاہر ہے کہ وہ ایک بہادر سپاہی اور قابل جرنیل تھا۔ مقبوضہ علاقوں کے انتظامات کے سلسلہ میں اس نے جس صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کے لئے اپنے آقا کا جس حد تک اور جس طریقہ سے ہاتھ بٹایا۔ اس نے یقیناً اس کو مورخوں کی تحسین کا مستحق بنا دیا ہے۔ اس نے متعدد لڑائیاں لڑیں اور ایک عرصہ تک میدان جنگ میں کارہائے نمایاں دکھلاتا رہا، لیکن یہ امر قابل غور ہے۔ اس نے بلا ضرورت انسانی خون بھی نہیں بہایا۔ اگرچہ ضرورت کے وقت وہ سختی برتنے کی اہلیت رکھتا تھا، حربی فتوحات کے علاوہ قطب الدین نے دہلی کے پہلے سلطان کی حیثیت سے ایک نئی اور عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی، یہ معمولی کارنامہ نہ تھا۔ قطب الدین ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا، اور اس بات کا خواہاں تھا کہ اسلام کی اشاعت ہو، لیکن اس نے مذہب میں تعصب سے کام نہیں لیا اور غیر مسلموں کے ساتھ رواداری برتی اس کی انصاف پسندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مورخوں نے اس کی حکومت کے متعلق لکھا ہے "بھیڑیا اور بکری اس کی سلطنت میں ایک ہی دریا کے کنارے پر پانی پیتے تھے۔ جس طرح ابتدائی دور میں اس نے ایک بہادر سپاہی اور قابل جنرل کی حیثیت سے

---

[1] بحوالہ ظفر الوالہ ج ۲ ص ۶۸۴

Marfat.com

شہرت حاصل کی اسی طرح تخت نشینی کے بعد اس کا شمار کامیاب اور انصاف پسند سلاطین میں کیا جاتا ہے جہاں تک اس کے انتظامیہ کارنامہ کا تعلق ہے۔ فخر الدین مبارک شاہ نے اس ضمن میں کہا ہے "قطب الدین نے تمام غیر شرعی محصولات کو ختم کر دیا اور صرف شرعی محصولات کو باقی رہنے دیا۔ اس کے مطابق بعض حالات میں عشر ۱/۱۰، اور بعض حالات میں اس کا بھی نصف لیا جاتا تھا" ڈاکٹر ثریا سمی نے اس بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔ قطب الدین ایبک کی حکومت کی پالیسی اس میں شبہ نہیں کہ قیا فانہ تھی کیونکہ وہ ایک مفصل دستور قانون پر سختی سے ہونا چاہئی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی قانون کی رو سے محصول کی جو مختلف صورتیں اور مقداریں مقرر کی گئی ہیں۔ ان میں سے کونسی صورت اختیار کی گئی، بہر حال جو شکل بھی ہو وہ محصولات کی اس نوعیت سے بہت قریب تھی جو اس زمانہ میں ہندوستان میں رائج تھی۔

قطب الدین ایبک کا یہ کارنامہ تھا۔ اس نے جنگ و جدل کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مقبوضات میں تعمیری اور مثبت اقدام کئے اور ہندو مسلم فرق و تفاوت کو نظر انداز کر کے ایک ہمہ گیر اور غیر جانبدار حکومت کا قیام کیا۔ وہ ایک وسیع نظر اور رواداد حکمران تھا۔ اور گذشتہ سالوں تک بے پناہ قتل و غارت کے باوجود مفتوحہ علاقوں کے عوام کے ساتھ اس نے ایک عادل شفیق اور غیر جانبدار حکمران کا برتاؤ کیا

تاج المآثر کا مصنف حسن بن نظامی ایبک کے نظام حکومت پر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اس کے پرسکون دور میں خزانوں کی حفاظت کے لئے کسی محافظ کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تک کہ بھیڑ بکریوں کے گلے گڈریئے کی نگہداشت کے محتاج نہ تھے۔ ہندوستان کی سرزمین پر قطب الدین ایبک نے بعض عمارتیں بطور نشانی چھوڑی ہیں۔ جن کی خصوصیت یہ ہے وہ پائیدار ہیں اور ایک عزم کا اظہار کرتی ہیں یہ پائیدار ہیں۔ اور عزم قطب الدین ایبک کے کردار کی خصوصیت ہے۔ دہلی میں مسجد قبۃ الاسلام جو مسجد قوۃ الاسلام کے نام سے مشہور ہے۔ قطب مینار جو مسلم قوت کی نمائندگی کرتا ہے۔ التمش نے مکمل کروایا تھا۔ اجمیر میں بھی ایک مسجد تعمیر کروائی جو روایتاً "اڑھائی دن کا جھونپڑا" کے نام سے مشہور ہے۔ غالباً یہ اڑھائی دن میں مکمل ہوئی تھی۔ اس نسبت سے اس کا یہ نام مقبول ہو گیا۔

قطب الدین نے ملک کی سرحدوں کو بیرونی حملوں سے محفوظ کیا۔ تاج الدین یلدز حاکم غزنی اس سے شکست کھا چکا لیکن اس کے حملے کا خدشہ مستقبل قریب میں موجود تھا۔ قطب الدین نے اس کی لڑکی سے شادی کر کے اس کی پیش قدمی کو روک دیا۔ دوسری طرف ناصر الدین قباچہ حاکم سندھ اور ملتان جو محمد غوری کے علاقوں پر دعوی رکھتا تھا۔ قطب الدین نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دی اس کی دشمنی

Marfat.com

کو دوستی میں بدل دیا۔

جنگی کارنامے

سب سے پہلے اس کو جاٹوں کے خلاف ہانسی پر حملہ کرنا پڑا، اس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا تو بہت سے لوگ بھاگنے کی کوشش میں تھے کہ اس نے ان کا تعاقب کر کے لڑائی کے لئے مجبور کیا۔ اس علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کہرام کی طرف واپس آ گیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے میرٹھ کے شہر کو فتح کر لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جمنا کے مشرق جانب اس کو ایک اچھا اور مضبوط فوجی اڈہ بنانے کا موقع مل گیا، میرٹھ ہی سے روانہ ہو کر وہ دہلی پہنچا اور ۱۱۹۳ء کے شروع میں اس نے اس پر بھی قبضہ کر لیا اور اسی کو اپنا دارالخلافہ بنایا قطب الدین کی دوسری اہم مہم اجمیر کے خلاف تھی۔ پرتھوی راج کی شکست کے بعد سلطان معز الدین نے اس کے ایک بیٹے راجہ کولا کو اجمیر کا حاکم مقرر کیا تھا۔ راجپوتوں نے کولا کے چچا ہری راج کی سرکردگی میں اس کے خلاف بغاوت کی۔ اور رنتھنبور کو جو ایک مسلم سردار کی نگرانی میں تھا واپس لے لیا۔ لیکن جب اس کو یہ خبر ملی کہ ایبک آ رہا ہے تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔ ایبک اجمیر میں داخل ہوا ۵۹۲ھ میں چندراوتی آبو اور ناگور کے راجوں نے مل کر اجمیر اس سے چھین لینا چاہا۔ اس نے اجمیر میں قیام کر کے انتظام کرنا شروع کیا اور تازہ دم امدادی فوج بلوا کر ان کو شکست دی۔

۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء میں اس نے دوبارہ گجرات فتح کیا اور وہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے واپس آیا۔ مگر گجرات کے راجہ نے اس سے ملک چھین لیا۔ قطب الدین اس وقت قباچہ اور یلدوز سے لڑائی میں مشغول تھا۔ اس لئے وہ اس کی طرف توجہ نہ کر سکا۔

اس کے ایک بہادر افسر محمد بختیار خلجی نے ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء میں بہار اور بنگال کو فتح کر کے اس کی حکومت میں ملا دیا۔

لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ۶۰۲ھ/۱۲۱۰ء میں مر گیا۔

Marfat.com

س ۔ سلطان شمس الدین التمش کو تخت نشین ہوتے ہی کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر قابو پانے کے لیے اس نے کیا اقدامات کیے۔

یا

التمش خاندان غلاماں کا اصل بانی تھا۔ دلائل دے کر ثابت کیجیے۔

عہد اسلامی کا ہندوستان

شمس الدین التمش نے غیر معمولی مشکلات کے ساتھ زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ آرام شاہ کے خاتمے سے اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ایبک کا حریف ناصر الدین قباچہ ابھی زندہ تھا اور خصوصاً ایبک کی وفات کے بعد ہندوستان کے تاج و تخت کے لئے جو سلطان شہاب الدین غوری کا ترکہ تھا۔ اپنے کو مستحق سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی مملکت کو ملتان بھٹنڈا، کرم اور سرستی تک وسیع کر لیا۔ اور آرام شاہ کے بعد اس نے لاہور پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ اسی طرح ایبک کا دوسرا حریف تاج الدین یلدز نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ایبک کے بعد دلی کے تخت کا دعویدار بنا اور آگے بڑھکر پنجاب کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف بنگال میں علی مرداں خان نے بختیار خلجی کے قتل کے بعد سلطان علاؤ الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا۔ اسی طرح راجپوتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جالور اور رنتھمبور وغیرہ کے اہم قلعوں پر قبضہ کر لیا، اور خود پایۂ تخت دلی بھی التمش کے مخالفوں سے خالی نہ تھا۔ آرام شاہ کے حمایتی افسروں کی سازشوں کا جال یہاں پھیلا ہوا تھا۔

التمش نے اپنے حریفوں اور مخالفین پر اجمالی نگاہ ڈالی اور بڑی دانشمندی اور حکمت عملی سے راہ عمل طے کی۔ اس نے سب سے پہلے مغربی سرحد سے یکسوئی حاصل کرنے کے لئے تاج الدین یلدز کی طرف دست مصالحت بڑھایا اور یلدز کو مطمئن کر کے قباچہ پر فوج کشی کی ۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء میں لاہور کو اس سے چھین لیا۔ اس طرح اپنی حدود حکومت مغرب میں شوالک پہاڑی اور مشرق میں بنارس تک رکھنے اور ان کے انتظام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد جب مغربی سرحد پر خوارزمیوں نے اس کے حریف یلدز کو پسپا کیا اور وہ لاہور آکر پناہ گزین ہو گیا اور ملتان بھٹنڈا اور کرام تک اس کے اثرات

Marfat.com

پھیلے اس موقع پر اس نے تاج الدین کے قصہ کو پاک کر لینا چاہا۔ چنانچہ اس پر فوج کشی کی اور اس کو گرفتار کر کے بدایوں کے قلعہ میں قید کر دیا۔ جہاں اس نے وفات پائی اس کے بعد قباچہ نے پھر لاہور پر قبضہ کر لیا اور التمش کی فوج نے اس کو بھی زیر کر کے اس سے پنجاب کو خالی کرا لیا۔ ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں پہلی مرتبہ التمش کا گورنر پنجاب میں مقرر ہو سکا۔ اس کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کی فتوحات اور اثر و نفوذ کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا اس نے مشرق میں بنارس سے آگے بڑھ کر اڑلیسہ کے راجہ جے سنگھ پر فوج کشی کی اور اس کو باج گزار بنایا پھر ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں بنگال کی سمت گیا۔ جہاں علی مرداں خاں کے بعد حسام الدین عوض ملقب بہ سلطان غیاث الدین اپنا سکہ و خطبہ جاری کیے تھا۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ نذرانہ پیش کر کے اطاعت کی۔ التمش نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو بنگال کا گورنر بنایا اور صوبہ بہار کو علیحدہ کر کے ملک عزالدین کے سپرد کیا۔ غیاث الدین نے التمش کی واپسی کے بعد سر اٹھایا تو ملک عزالدین نے ۶۲۳ھ میں فوج کشی کر کے اس کا خاتمہ کیا

ناصر الدین محمود نے ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء میں وفات پائی۔ تو التمش تعزیت کے نام سے دوبارہ مشرقی بنگال گیا اور ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء میں علاؤالدین خان کو یہاں کی حاکمیت تفویض کی۔ مشرقی صوبوں سے یکسوئی حاصل کر کے وہ مشرقی راجپوتانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں قلعہ رنتھمبور اور جھتور سر ہوئے، پھر مغربی راجپوتانہ میں قلعہ منڈور ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں فتح ہوا۔ اس کے بعد ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں سندھ پر حملہ آور ہوا اور نہ صرف اوچ قبضہ میں آیا بلکہ ناصر الدین قباچہ نے پسپا ہو کر دریا میں کود کر جان دے دی اور پورا علاقہ سندھ ایک بار اس مرتبہ دلی سلطنت کے ماتحت آگیا۔ اس طرح کوہستانِ سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالہ سے بندھیاچل تک وسیع رقبہ مرکزی سلطنت دہلی کی عملداری میں آگیا۔

اس طرح اس نے ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں گوالیار اور ۶۳۱ھ/۱۲۳۴ء میں مالوہ اور قلعہ بھیلسا پر اور ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء میں اجین پر اقتدار حاصل کیا اس طرح سلطنت دہلی کے جنوبی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہو گئے۔

غرض التمش ہندوستان میں ایک عظیم تر سلطنت کا بانی بنا اس زمانہ کی رسم کے مطابق اس کے نام ہندوستان کی شہنشاہی کا پروانہ دربار خلافت بغداد سے بھی آگیا۔

س: سلطان شمس الدین التمش کی سیرت اور کردار پر روشنی ڈالیے۔

شمس الدین التمش ترکی قبیلہ البری کا خان زادہ تھا۔ اس کا باپ ویلم اس قبیلہ کا بڑا سردار تھا اور التمش سے غیر معمولی محبت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے رشک و حسد سے اس

Marfat.com

کو ایک پردیسی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جس سے بخارا کے جمال الدین چست قبا نے اس کو خریدا اور بیچنے کے لئے غزنی کے بازار میں لایا وہ خوش رو ترک بچہ تھا۔ جمال الدین نے گراں قیمت چاہی۔ شہاب الدین غوری نے اس کی خریداری کی ممانعت کر دی۔ پھر تیسرے سال ایبک کو اجازت دی کہ وہ غزنین کی حدود سے باہر جا کر اس کو خرید سکتا ہے۔ چنانچہ جمال الدین اس کو دلی میں لایا۔ یہیں وہ خرید لیا گیا۔ غزنی میں اس کے خریدے جانے کی ممانعت اور دلی میں اس کی خریداری کے واقعہ کا پیش آنا گویا قدرت کو یہ اشارہ کرنا تھا کہ مستقبل میں وہ غزنی سے بے تعلق رہے گا۔ اور دلی ہی سے اس کو شرف توطن کا فخر حاصل ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان میں اسلام کی تعلیم مساوات کے ہاتھوں ترقی کی اور مسند حکومت پر بیٹھا۔

سلطان شمس الدین التمش عجیب وغریب اوصاف وخصائص کا انسان تھا۔ ایک طرف وہ نہایت مدبر اور بیدار مغز اور بہترین سیاستدان اور بہادر تھا۔ جس نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلے سندھ اور بنگال کے باغی گورنروں کی سرکوبی کی پھر ہندوؤں کی خود مختار ریاستوں کی طرف توجہ کی، اور راجپوتانہ پر حملہ کیا رنتھمبور اور گوالیار حلقوں کی تسخیر کی۔ مالوہ کا قدیم اجین فتح کیا۔ علاوہ بریں نظم ونسق اور ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ بقول ڈاکٹر تریپاٹھی کے اس کو ہندوستان میں اسلامی خود مختار حکومت کا اولین موسس اور بانی کہا جا سکتا ہے۔ [۱]

ان اوصاف کے ساتھ ہی دوسری جانب وہ نہایت عابد و زاہد، صوفی منش اور فقیر پسند طبیعت کا مالک تھا۔ چنانچہ خزائن الاصفیاء کے مصنف کا بیان ہے "اگرچہ بظاہر تعلق بہ پادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود" یعنی اگر بظاہر اس کا تعلق بادشاہی سے تھا۔ لیکن دل سے وہ فقیر پسند اور فقر دوست تھا۔

فرائض ونوافل کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ ہو جانے کے بعد بڑے سے بڑے اہم سیاسی کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود وہ نماز ترک نہ کرتا تھا۔ مولف طبقات اکبری کا بیان ہے "سلطان شمس الدین اطاعت وعبادت مدام بود و روز ہائے جمعہ بمسجد رفتے و بہ اداے فرائض ونوافل قیام نمودے، یعنی بادشاہ شمس الدین اطاعت الٰہی اور عبادت میں دوام اختیار کرتے۔ جمعہ کے دن مسجد میں جاتے، فرائض اور نوافل کی ادائیگی کے لئے قیام کرتے۔

---

[۱] بحوالہ اسلامک کلچر ج ۲ صفحہ ۱۶۶

Marfat.com

وعظ سننے کا اسے بڑا اشتیاق تھا۔ ہفتہ میں تین مرتبہ اور ماہ رمضان المبارک میں روزانہ وعظ سنتا تھا۔ سیر العارفین کی روائت ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد سلطان اپنے محل میں ایک اجتماع منعقد کرتا تھا۔ جس میں اکابر و اشراف و مشائخ شریک ہوتے تھے۔ اس اجتماع میں شرکائے بزم پوری آزادی سے بادشاہ اسلام کے فرائض اور واجبات پر اظہار خیال کرتے اور بادشاہ ان کو سب سے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتا تھا۔ فرائض و عام نوافل کے علاوہ وہ رات رات بھر ذکر الٰہی اور وظائف میں مشغول رہتا تھا۔

سلطان کے کمال تصوف و درویشی کے ثبوت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی، کہ خواجہ عثمان ہرونی جو خود بڑے پایہ کے بزرگ اور صوفی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیر و مرشد ہیں، سلطان کو انسان کامل سمجھتے تھے۔ انہی وجوہ سے سلطان کو علماء مشائخ اور خصوصاً صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے عہد میں درہ خیبر کے راستہ سے کثرت سے مشائخ و صوفیاء ہندوستان آئے، جب سلطان کو ان میں سے کسی کے دہلی آنے کی اطلاع ہوتی تھی۔ تو استقبال کے لئے خود میلوں تک پا پیادہ جاتا تھا۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ ملتان سے دہلی آئے تو سلطان نے حضرت خواجہ کا بڑا شاندار استقبال کیا اور شاہی محل میں ہی قیام کرنے کی درخواست کی۔ لیکن جب قطب صاحب نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا اور شہر سے باہر ایک خانقاہ میں قیام فرمایا تو سلطان اکثر و بیشتر آپ کی ملاقات کے لئے خانقاہ میں آتا تھا اور آپ سے پند و نصیحت کی باتیں سنتا تھا۔ سلطان کو قطب صاحب سے کس درجہ عقیدت اور ارادت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود حضرت قطب صاحب کا بیان ہے "ایک رات سلطان مجھ دعاگو کے پاس آیا اور آتے ہی میرے پاؤں پکڑ لئے میں نے کہا کیا کوئی تکلیف ہے؟ اگر کوئی حاجت ہے تو بیان کیجئے۔"

سلطان نے جواب دیا "حاجت! حاجت تو اس خدا کے فضل و کرم سے جس نے مجھ کو یہ مملکت و سلطنت دی ہے کوئی نہیں ہے۔ مجھ کو البتہ صرف یہ بتا دیجئے کہ قیامت کے روز میرا حشر کس گروہ کے ساتھ ہوگا؟"

خلافت راشدہ کے بعد غالباً مشکل سے ہی کوئی بادشاہ ایسا نکلے گا۔ جو شمس الدین التمش کی طرح سجہ و شمشیر دونوں کے کمالات کا بیک وقت جامع ہو۔ بہترین مدبر اور سیاست دان ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا صوفی اور صاحب معرفت و طریقت بھی التمش نے ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں وفات پائی اور قطب صاحب کی مسجد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

Marfat.com

س ۱۰ ملکہ رضیہ سلطانہ کی سیاسی زندگی کا مختصر جائزہ لیجیے۔ نیز یہ بھی لکھیے کہ وہ منصب سلطانی کے لیے کس حد تک اہل تھی۔

رضیہ سلطانہ کی سیاسی زندگی کا پس منظر

التمش نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کے مسئلہ کو کسی قدر پیچیدہ بنا دیا تھا۔ عام اصول کے مطابق اس نے اپنے بیٹے فیروز کو امور مملکت میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھایا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں اس کو بدایوں کے صوبہ کی گورنری دی، مگر اس کے طور طریقے ایسے تھے کہ وہ اس کی نظر میں اس کی جانشینی کے لائق قرار نہ پا سکا۔ اس لیے اس نے ایک دوسرے موقع پر فیروز کی موجودگی میں گوالیار کی مہم پر جاتے ہوئے اپنی بیٹی رضیہ کو دہلی کی زمام حکومت سپرد کی اور واپس آکر وزیر اعظم تاج الملک محمود سے کہا کہ وہ رضیہ کی ولیعہدی کا اعلان کر دے۔ اگرچہ ترکوں میں نامور حکمران خواتین گزر چکی تھیں۔ مگر ہندوستان کی روایات کا لحاظ کر کے ترک افسروں نے دبی زبان سے اس تجویز سے اختلاف کیا۔ مگر التمش نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ اس کے بیٹے فیروز میں سلطنت کا بارگراں سنبھالنے کی صلاحیت نہیں انہیں خود تجربہ ہو جائے گا کہ رضیہ بڑی دانشمندی اور تدبر سے اس منصب کی اہل ثابت ہوگی۔ چنانچہ ۶۲۹ھ میں اس کی ولی عہدی کا اعلان ہو گیا۔ اور اس کے نام کا سکہ بھی اسی کی زندگی میں جاری کر دیا گیا۔ اور فیروز کو عین الملک محمود کی نگرانی میں جس نے رضیہ کی ولی عہدی کی مخالفت کی تھی۔ لاہور کی صوبہ داری پر بھیج دیا۔ اور اس طرح گویا اس کو دارالسلطنت سے دور کر کے پایہ تخت کو آئندہ پیش آنے والے خطرے سے بچایا گیا مگر فیروز کی ماں ترکان خاتون بھی بڑی ہوشمند ملکہ تھی۔ وہ فیروز کے حق ولیعہدی سے دستبردار نہیں ہوئی اور ترک افسروں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔

رکن الدین کی تخت نشینی

چنانچہ جب التمش آخری مرتبہ لاہور سے واپس آیا۔ تو فیروز کو اپنے ساتھ لیتا آیا اس طرح اگرچہ اس کی ولی عہدی کا اعلان نہ ہو سکا۔ مگر یہ مسئلہ گویا نئے سرے سے ارباب حکومت کی توجہ کا مرکز بن گیا اور جب التمش نے وفات پائی تو

Marfat.com

ملکہ ترکان خاتون اپنے بیٹے کو ترک افسروں کی مدد سے دہلی کے تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہوگئی اور اس کا لقب رکن الدین قرار پایا۔

رکن الدین جیسا کہ التمش کو خطرہ تھا تخت پر بیٹھتے ہی کاروبارِ سلطنت سے غافل ہو کر عیش و طرب میں مشغول ہوگیا۔ شاہی خزانے کو بیدردی سے برباد کرنے لگا۔ ترکان خاتون نے سلطنت کی زمام گویا اپنے ہاتھ میں لے لی۔ سوکنوں کو ہلاک کرایا۔ ایک سوتیلے بیٹے کی آنکھ میں سلائی پھروائی اور ملک میں ابتری شروع ہوئی سلطان رکن الدین کا چھوٹا بھائی غیاث الدین محمود اودھ کا حاکم تھا۔ اس نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ لکھنوتی سے آنے والے شاہی خزانہ کو اودھ میں روک لیا۔ اس طرح بدایوں، لاہور، ملتان اور قلعہ ہانسی کے صوبہ داروں کی باہمی مراسلت سے رکن الدین کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سلطان رکن الدین ان خودسروں کو سزا دینے کے لئے دہلی سے نکلا۔ ان گورنروں کی فوج مقابلہ کے لئے آئی۔ اس اثنا میں خود رکن الدین کی فوج کے افسر چند ممتاز ساتھیوں کو قتل کر کے دہلی لوٹ آئے۔ اب رضیہ نے اپنے لئے فضا ساز گار دیکھی۔ وہ شجاعت سے مظلوموں کا لباس پہن کر جامع مسجد میں آئی۔ التمش کی مہربانیاں یاد دلائیں اور کہا کہ وہ بھائی کے قصاص کے لئے اٹھی ہے ایک بھائی نے ایک دوسرے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ فضا رکن الدین کے خلاف ہو چکی تھی۔ التمش کا رضیہ کو ولی عہد بنانا لوگوں کو یاد آیا اور افسروں نے یہ کہہ کر کہ اگر یہ بھائیوں سے بہتر ثابت ہوئی تو تاج و تخت کی یہ مالک رہے گی۔ اس کو تخت پیش کر کے تاجدار بنا دیا۔ ترکان خاتون کو گرفتار کر کے قید کرا دیا گیا۔ رکن الدین نے یہ حالات سن کر دہلی کا رخ کیا۔ تو سلطانہ رضیہ نے پیش قدمی کر کے اس کو شکست دی اور گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ رکن الدین فیروز صرف ۶ مہینے آٹھ دن حکمران رہا اور ہندوستان میں پہلی مسلمان خاتون صاحب تخت و تاج بنی۔

سلطانہ رضیہ نے مردانہ لباس پہن کر بے نقاب تخت سلطنت پر جلوس کیا اور تدبر و ہوش مندی سے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ سلطان رکن الدین کو شکست صوبائی گورنروں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے دہلی تک چلے آئے۔ اب وہ سلطان کی نامزدگی کو اپنا حق تصور کرنے لگے اور وہ دربار دہلی کے امراء کی رائے سے اتفاق نہ کر سکے۔ اس طرح ارباب سیف کے دو مستقل گروہ قائم ہوگئے۔ صوبہ داروں کے گروہوں میں سے اودھ کے حاکم نے رضیہ کی حمایت کرنا چاہی مگر وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ سلطانہ نے شہر سے نکل کر جمنا کے کنارے خیمہ لگایا۔ دوسری طرف ترک امراء بھی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ مگر رضیہ کے حسن تدبیر سے مخالفین کو شکست ہوئی ان گورنروں میں سے اکثر مارے

Marfat.com

گئے اور کچھ روپوش ہوگئے۔ رضیہ نے پورا تسلط قائم کرکے حکومت کے نظم و نسق پر توجہ کی مختلف صوبوں میں گورنر بھیجے اور لکھنوتی سے دیول و سندھ تک کا علاقہ اس کا مطیع و منقاد ہوگیا۔

رضیہ کی کامیاب سیاسی زندگی

رضیہ نے تین سال تک امن و امان کی حکمرانی کی۔

بعض قلعے جو پہلے سے قبضہ سے نکل گئے تھے۔ وہاں مہم بھیج کران پر قبضہ کیا۔ وہ امور جہانداری سے بخوبی واقف تھی۔ مردانہ لباس میں باہر نکلتی سوار ہوکر میدان جنگ میں جاتی۔ گھوڑے پر سوار ہوتی۔ عدالت و انصاف کے لئے بیٹھتی تو عادلانہ فیصلے کرتی، لیکن اسلامی ملکوں میں عورتوں کی بادشاہی کا رواج نہ تھا۔ اس کے کئی بھائی بھی موجود تھے۔ اس کے خلاف شورش پیدا کرنے کے لئے محض کوئی بہانہ چاہیئے تھا۔ دربار میں ترک افسروں میں سے اس کا ایک مخالف گروہ جو اگرچہ کمزور ہوچکا تھا۔ مگر پھر بھی موجود تھا۔ اس کے دربار میں رفتہ رفتہ ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ ترک ملک و امراء کو اس کا اقتدار ناگوار گزرا وہ اگرچہ سلطنت کے سارے کام مردانہ شجاعت سے انجام دیتی تھی۔ مگر اس کی نسوانیت بہرحال اس میں موجود تھی اور اس کے مخالفین کے پاس اس کے خلاف بھڑکانے کے لئے بڑا سان حربہ موجود تھا۔ چنانچہ اندر ہی اندر اس کے خلاف تحریک ہوئی اور وہ ایک شورش بن کر اٹھی یاقوت حبشی گرفتار کرکے قتل کیا گیا اور رضیہ کو جب وہ بھٹنڈا پر فوج کشی میں مصروف تھی۔ خود اس کے ہمراہیوں نے سازش سے گرفتار کرکے بھٹنڈہ میں قید کرایا اس نے بھٹنڈہ کے قلعہ دار سے شادی کرکے وہاں سے نکلنے اور گکھروں اور جاٹوں کی مدد سے دہلی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوسکی آخر دہلی کے اطراف میں ماہ ربیع الاول ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء قتل کردی گئی۔ اس کو تین سال چند مہینے حکمرانی کا موقع مل سکا۔

رضیہ کی نسبت فرشتہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سلطانہ رضیہ میں تمام صفات جہانداری موجود تھے۔ عقل و فہم اور حسن تدبر و سیاست میں یہ عورت اپنے زمانہ کے بہترین مردوں کے ہم پلہ تھی۔ انسانی فضیلتوں سے جانچنے والوں کو رضیہ میں سوا نسوانیت کے اور کوئی ایسا عیب نہ ملتا تھا۔ جو حکمران کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے میں اسکا حائل ہوسکے۔

التمش کے زمانہ سے ہی رضیہ کا ہاتھ مہمات سلطنت کے انجام دینے میں کام کررہا تھا

Marfat.com

شمس عہد کے اکثر پیچیدہ مہمات سلطنت رضیہ کی صائب رائے سے ہی طے ہوتے تھے۔۔۔۔۔ التمش کے گوالیار کے جشن فتح میں اسے چند خاص امیروں کے سامنے رضیہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا" میں اپنے بیٹوں کے عادات واطوار سے خوب واقف ہوں۔ اس وقت بھی جب کہ وہ میرے دست نگر میں دن رات شراب خوری اور عیاشی میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ سلطنت کا بار اٹھا سکیں۔ بخلاف اس کے رضیہ اگرچہ عورت ہے۔ لیکن فہم وفراست کے اعتبار سے حقیقتاً مرد ہے۔ اور اسی وجہ سے میں اسے اپنے بیٹوں پر ہر طرح ترجیح دیتا ہوں" [۱]

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ رضیہ واقعی بڑی عقل مند سمجھ دار اور فرض شناس تھی

---

[۱] تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ ج ۱ صفحہ ۲۵۷

Marfat.com

س :- سلطان ناصر الدین محمود کا دور دراصل غیاث الدین بلبن کا دور تھا۔ ان الفاظ سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟ دلائل سے واضح کیجئے۔

ناصر الدین کے اخلاق و عادات

ناصر الدین محمود اخلاق و عادات اور مذاق طبعیت کے لحاظ سے سلطان شمس الدین التمش کا عکس تھا۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے "یہ بادشاہ شجاعت، عبادت اور سخاوت میں اپنے زمانہ میں بے مثل تھا۔ بادشاہ نے اپنے ذاتی مصارف کا بار کبھی شاہی خزانہ پر نہیں ڈالا۔ اپنے ذاتی مصارف قرآن مجید کی کتابت کر کے پورے کرتا تھا۔ [1]

نظام الدین احمد مولف طبقات اکبری کا بیان ہے۔

سلطان ناصر الدین ہر سال دو قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اور ان ہی کا ہدیہ سلطان کے ذاتی خورد و نوش میں صرف ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ کے لکھے ہوئے قرآن کو ایک امیر نے معمول سے زیادہ رقم دے کر ہدیہ لیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ آئندہ سے اس کے لکھے ہوئے نسخہ ہائے قرآن مجید کو پوشیدہ طریقہ پر بھی اس کا نام بتائے بغیر رائج الوقت ہدیہ پر کیا جاتے۔ بادشاہ کے گھر میں اس کی بیوی کے سوا کوئی لونڈی یا خادم کام کرنے کو نہ تھی۔ ایک روز بیوی نے امور خانگی سے تنگ آکر لونڈی خریدنے کی فرمائش کی تو بادشاہ نے جواب دیا "بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے۔ میں اس کا مجاز نہیں ہوں کہ اس میں سے کچھ روپیہ لے کر اپنے ذاتی آرام کے لئے لونڈی خریدوں، دنیا کی مصیبتوں پر صبر کرو، خدا آخرت میں اس کا بدلہ دے گا۔" [2]

سلطان کی طبیعت چونکہ عبادت اور گوشہ نشینی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس لئے اس نے سلطان شمس الدین التمش کے محبوب غلام (اور بقول فرشتہ داماد بھی) غیاث الدین بلبن کو خانِ اعظم الغ خان کا خطاب عطا کر کے عہدۂ وزارت تفویض کر دیا اور سلطنت کے اہم امور میں اس پر اعتماد کرنے لگا۔ وزیر سلطنت مقرر کرتے وقت اس نے بلبن سے کہا "میں نے تمہیں

---

[1] جلد اول صفحہ ۲۶۸ [2] بحوالہ تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۲۷۷

Marfat.com

اپنا نائب مقرر کیا ہے اور خلق خدا کی باگ تمہارے ہاتھ میں دی ہے تم کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ مجھے خدا کے سامنے جواب دہ اور شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ قراختائی نسل کا ترک اور اسی قوم کے ایک قبیلہ البری کا فرزند تھا۔ جب مغلوں کا سیلاب فتوحات ترکستان کی حدود میں پہنچا تو بلبن بھی ایک مغل کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ مغل نے ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور سوداگر نے بغداد لاکر اسے یہاں کے ایک مشہور و متدین بزرگ خواجہ جمال الدین کے ہاتھ بیچ دیا۔ خواجہ جمال بلبن اور چند ترکی غلاموں کو ساتھ لے کر ہندوستان پہنچے اور سلطان شمس الدین التمش کی خدمت میں انہیں پیش کیا۔ التمش نے از بس قیمتیں دے کر ان سب غلاموں کو خرید لیا۔ لیکن بلبن میں آثار رشد و ہدایت پاکر التمش نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔ وہ سلطان التمش کے عہد میں "بازدار" یا "خاصہ دار رہا" رکن الدین کے زمانہ میں تمام ہندوستانی ترکوں کا افسر ہوکر پنجاب کے باغیوں کی سرداری کرتا رہا۔ رضیہ سلطانہ کے عہد میں شاہی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر نظر بند کر دیا گیا لیکن کچھ دنوں بعد رہا ہو کر میر شکار ہوگیا۔ معز الدین بہرام شاہ کے ایام حکومت میں میر شکار کے عہدہ سے ترقی کرکے امیر اخور کے عہدہ پر فائز ہوا۔ اس دور میں اس کو ہانسی اور رولٹری کے پرگنے جاگیر میں ملے تو اس نے ان غیر مسلم مواتیوں کو زیر کیا جو دارالخلافت کو لوٹ مار سے تاراج کیا کرتے تھے۔ بلبن کے اس کارنامہ نے اس کی شجاعت اور مردانگی کا سکہ بٹھا دیا بہرامی دربار میں اسے ایک امتیاز خاص حاصل ہوا اور وہ امیر حاجب کی حیثیت سے سلطنت کے اہم امور و قضایا کا انصرام و انتظام کرتا رہا۔ بعد ازاں سلطان ناصر الدین کے عہد میں وہ جس خود مختاری اور آزادی کے ساتھ وزیر مملکت کی حیثیت سے حکومت کا کام چلاتا رہا۔ اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ نام ناصر الدین محمود کا تھا اور باقی سب کام بلبن ہی کرتا تھا۔

غیاث الدین بلبن نے اپنی قابلیت اور لیاقت کے علاوہ بادشاہ کے ساتھ اپنی ایک لڑکی کا نکاح کرکے اس کا اور مزید اعتماد بھی حاصل کر لیا۔ اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر اپنے ہی معتمد رشتہ داروں کو فائز کرکے اپنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کر لیا۔ چنانچہ اسکا چھوٹا بھائی کشلو خان امیر صاحب اور اس کا چچیرا بھائی شیر خان لاہور اور بھٹنڈا کا گورنر مقرر ہوا۔ ایک مختصر رفقہ کے علاوہ جس میں سلطان نے عماد الدین نامی ایک شخص اور اس کی جماعت کے کہنے سننے سے بلبن اور اس کے آدمیوں کو عارضی طور پر مناصب حکومت سے الگ کرکے دہلی تک چھوڑ دینے کا حکم دے دیا تھا۔ بلبن ناصر الدین کے آخر زمانہ حیات تک سلطان معتمد علیہ رہا اور امور سلطنت خود مختاری کے ساتھ انجام

Marfat.com

دیتا رہا۔ بلبن سلطنت کے سیاہ وسپید کا اندلس کے حاجب المنصور عامر کی طرح مالک تھا۔ اس لئے سلطان محمود کی حکمرانی کا زمانہ اگرچہ بیس سال تک رہا مگر اس عہد کی سیاسیات کی پوری تاریخ گویا بلبن ہی کی حکمرانی کی تاریخ ہے۔

بلبن کے عملی اقدام

بلبن نے اپنی قابلیت اور دور اندیشی سے ان تمام باغی عناصر کا قلع قمع کردیا۔ جنہوں نے ناصر الدین محمود کے خلاف قدم اٹھایا۔ جب ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا تھا تو امرا کی پارٹی بندی کا سلسلہ ختم نہیں ہوسکا تھا۔ ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء تک کا زمانہ بغاوتوں کے فروکرنے میں گزرا، عماد الدین ریحانی نے بھی بغاوت کی اور قتل کیا گیا۔ اس طرح مرکز میں سیاسی ہلچل سے فائدہ اٹھا کر حاکم بنگال طغرل خان نے گویا اپنی خود مختاری قائم کرلی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کڑا مانک پور اور اودھ کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا، یہ گویا مرکزی حکومت کے لئے اس کی طرف سے ایک مستقل چیلنج تھا۔ بلبن کے اودھ کے گورنر تمرخان کو اشارہ کیا اور ایسے موقع سے کہ اڑیسہ کی غیر مسلم ریاست جاج نگر سے طغان خان شکست کھا کر واپس جارہا تھا کہ تمرخان ۶۴۲ھ ۱۲۴۴ء میں پایۂ تخت لکھنوتی میں داخل ہوگیا۔

پھر ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء میں تمرخان اور طغان خان کی وفات کے بعد ازبک خان نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ یہاں تک ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء میں ارسلان خان حاکم کڑا نے اچانک حملہ آور ہوکر بنگال پر قبضہ کرلیا اسی طرح اودھ، سندھ، پنجاب میں مقامی حالات درپیش آتے گئے۔ بلبن نے دوبارہ قلمدان وزارت سنبھال کر ان سب صوبوں کی سیاست پر عبور حاصل کیا۔ اور یکے بعد دیگرے اپنا اقتدار قائم کیا۔

اس طرح ۶۲۴ھ ۱۲۳۵ء سے ۶۶۳ھ ۱۲۶۵ء تک کے زمانہ میں مختلف غیر مسلم طاقتوں نے جاج نگر، بہار وغیرہ میں اپنی سطوت قائم رکھی اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کی بہار میں مسلمان حکمرانوں کے اثرات شاہ آباد، پٹنہ، مونگر اور بھاگل پور وغیرہ میں قائم ہوئے تھے، لیکن جنوبی بہار میں ~~بدھ گیا~~۔ رہتاس گڑھ وغیرہ کا وسیع علاقہ غیر مسلم حکمرانوں کے قبضہ میں تھا۔ اور موقع پاکر ان کی تاختیں مسلم علاقوں پر جاری تھیں۔ چنانچہ تاج الدین تسخیر کویت خان بہار میں مارا گیا۔ لیکن بلبن زمانہ تک ۶۶۳ھ ۱۲۶۵ء میں بہار دوبارہ مسلمانوں کے اقتدار میں آگیا اور غیر مسلم طاقتیں کمزور پڑ گئیں اور گیا میں بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ چنانچہ ۶۶۷ھ ۱۲۶۸ء میں گیا کے ایک مصنف کی سنسکرت تصنیف میں بلبن کا نام حکمران کی حیثیت سے آیا ہے۔ تیرھویں صدی میں گیا کو دوسرے مذہبی مقاموں کی طرح ترکوں

Marfat.com

کے اقتدار سے نکالنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوسکی۔ ترکی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو یہاں کے وہ راجہ بھی قبول کرنے پر مجبور ہوئے جو خود مختاری سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوتے تھے۔ اس طرح ریوا کالنجر وغیرہ میں راجپوتوں نے سر اٹھایا۔ مگر وہ بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کرسکے اگرچہ بندیل کھنڈ۔ اور بعض جنوبی مقاموں پر ان کا قبضہ ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء سے ۶۷۹ھ ۱۲۸۰ء تک برقرار رہا۔ اسی طرح گوالیار، نردا، مالوہ، گجرات، مارواڑ وغیرہ کے بعض علاقوں پھر اودھ میں قنوج و تارڈلی وغیرہ میں خود مختار حکومتیں ایک مختصر مدت کے لئے قائم ہوئیں، بلبن نے ان مسلم وغیر مسلم ابھرنے والی طاقتوں کو یا تو اپنی نیابت کے زمانہ میں یا آگے چل کر اپنی بادشاہی کے زمانہ میں زیر کرلیا۔ اس طرح بلبن اپنے دور کا ایک کامیاب حکمران تھا۔

س :۔ بحیثیت حکمران غیاث الدین بلبن نے کون سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ وہ برصغیر کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے ؟

بلبن کے کارہائے نمایاں

غیاث الدین بلبن نے تخت نشینی کے بعد سلطنت کے وفد کو قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے فوج کو از سرِنو منظم کیا۔ اعلیٰ عہدوں اور منصبوں میں اپنی پسند کے آدمیوں میں رد و بدل کیا۔ پایۂ تخت کے قریب کے ان جنگلوں کو جہاں سرکش کمین گاہیں بناتے تھے صاف کیا۔ پایۂ تخت کے نظم سے فارغ ہو کر وہ دوآبہ اور اودھ میں آیا اور سارے علاقے کو فوجی علاقوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح مقاموں میں جنگلوں سے گزر کر سڑکیں نکالیں اور پھر موقع موقع سے سرکشوں کو سزائیں بھی دیں۔ ان حفظ ماتقدم کی تدابیر سے ملک میں امن و امان پیدا ہوا۔ اور لوگ زندگی کے مختلف کاموں کاشت کاری اور صنعت و حرفت وغیرہ میں امن و سکون سے لگ گئے۔

اس کے ساتھ اس نے اپنی حکومت کی داخلی حکمت عملی میں بھی نمایاں تبدیلی کی۔ اس نے سوچا کہ جب تک مغل غزنی پر قابض ہیں اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی طاقت ان میں موجود ہے۔ اس وقت تک ہندوستان کے چھوٹے بڑے جو بھی اس وقت تک خود مختار ہیں

Marfat.com

انہیں زیر کرنا اور ان سے لڑائی مول لینا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے صرف اس علاقہ کو زیر حکومت رکھا جو پنجاب سے لکھنوتی تک اس کے قبضہ میں موجود تھا۔

بنگال کی بغاوت

سلطان علاء الدین کے زمانہ میں بنگال میں طغا خان کے بعد قرابیگ تیمور خان پھر ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں ملک جلال الدین پھر ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں ارسلان خان اور اس کی وفات کے بعد تاتار خان یہاں کے والی یکے بعد دیگرے ہوئے۔ بلبن نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں اس کو برقرار رکھا۔ پھر ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء اور بروایت ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں اس کو مرکز کی خدمات کے لئے بلا لیا۔ اور اپنے ایک غلام طغرل خان کو یہاں کی گورنری سپرد کی۔ اس نے قوت بہم پہنچا کر جاج نگر پر فوج کشی کر کے بے شمار دولت حاصل کی۔ اسی اثناء میں ملتان پر مغلوں کے حملے شروع ہو گئے۔ پھر سلطان کی علالت کی خبر موت کی افواہ میں بدل کر مشہور ہو گئی۔ ادھر مرکزی حکومت نے ہندوستان کے خود مختار حکمرانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری نہ رکھنے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ ان اسباب سے طغرل خان میں خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس نے سلطان مغیث الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا سلطان غیاث الدین کے لئے یہ اطلاع غیر متوقع تھی۔ اس نے اودھ کے گورنر محمد امین کو فوج کشی کا حکم دیا۔ اس نے شکست کھائی، تو ملک ترمیتی کو مامور کیا اس کو بھی ہزیمت ہوئی اور کچھ لوگ طغرل سے مل گئے تو سلطان اپنی پیرانہ سالی کا خیال نہ کر کے خود کمر ہمت چست کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دو لاکھ فوج اس کے ہم رکاب ہوئی۔ سخت سے سخت بارش میں بھی سفر جاری رکھا۔ لکھنوتی کے قریب پہنچا۔ تو طغرل خان فرار ہو گیا۔

سلطان نے کہا جب تک طغرل خان کی گرفتاری عمل میں نہ آجائے وہ واپس نہ ہوگا۔ آس پاس کے غیر مسلم جاگیر داروں نے بھی اس کی تلاش میں مدد دی۔ اتفاق سے سلطان فوج کے ایک ہراول دستہ نے اچانک طغرل کو دیکھ لیا اور وہ فرار ہوا تو تیر کا نشانہ لگا کر گرایا اور سر کاٹ کر سلطان کے پاس لے آیا۔ سلطان نے لکھنوتی کے بازار میں دو رویہ سولیاں نصب کرائیں اور باغی سرداروں اور طغرل کا ساتھ دینے والوں کو منظر عام پر سولی پر لٹکایا۔ پھر لکھنوتی کی ولایت اپنے بیٹے بغرا خان محمود کو سپرد کی۔ اور وصیت کی کہ وہ دہلی کے بادشاہ کا ہمیشہ تابع فرمان رہے چاہے بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ ہو یا اس کا رشتہ دار، کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے

Marfat.com

ہی فاصلہ پر ہو۔ وہ دلّی کے مضافات میں ہمیشہ داخل رہے گا۔ اس کے بعد دہلی واپس چلا گیا۔

سرحد کی حفاظت

منگلوں کی خبر رکھنے کے لئے شاہزادہ محمد کو سرحد پر بھیجا۔ کیونکہ سرحد کی حفاظت اہم ترین مسائل میں سے تھی۔ اس لئے منگل اس وقت ایشیا پر چھا گئے تھے۔ بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کو تباہ و برباد کر چکے تھے۔ ہندوستان کی سمت بھی وہ آئے مگر ترکوں کی آب دار تلوار نے انکا منہ موڑ دیا۔ ہندوستان کی سرزمین کو منگولوں کی پامالی سے بچانے میں بلبن کی اہم خدمات تھیں۔

منگولوں کا تعلق ہندوستان

جس زمانہ میں ہندوستان میں سلطان التمش کا ستارہ اقبال عروج پر تھا۔ وسط ایشیا کے میدانوں کا خانہ بدوش قبیلہ منگول چنگیز خاں کی سالاری میں اٹھا اور خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء میں خوارزم کا بادشاہ جلال الدین بھاگ کر دریائے سندھ کے کنارے آیا۔ چنگیز خاں سے یہاں معرکہ ہوا۔ پھر وہ شکست کھا کر دہلی میں پناہ گزین ہو گیا پھر ملتان اور اوچھ سے گزر کر ہندوستان سے نکل گیا۔ اس کے بعد منگلوں کی مستقل یورش کا سلسلہ جاری ہوا۔ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء میں وہ لاہور تک آگئے اور اس کو تباہ کیا اس طرح ان میں پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے حملے کرتے رہے۔ چنانچہ ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء میں بلبن نے ملتان کو ان کے حملہ سے بچا لیا۔ اور باوجودیکہ یہ خونخوار قوم سارے ایشیاء میں تہلکہ مچائے ہوئے تھی۔ مگر ہندوستان کی سلطنت کو بلبن کے مضبوط ہاتھوں میں دیکھ کر ہلاکو خان کو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ چنانچہ ۶۵۷ھ / ۱۲۵۸ء میں اس کے سفیر ہندوستان آئے۔ بلبن نے ان کا ایسے تزک و احتشام سے استقبال کیا کہ منگولوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اگرچہ اس سفارت کا کوئی پائیدار اثر نہیں نکلا۔ مگر انہیں اس کا حوصلہ نہ ہو سکا کہ وہ دہلی کے تخت پر بھی نگاہ ڈال سکیں۔ بایں ہمہ وہ پنجاب کے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے اس پر شدید حملے کرتے رہے۔ غیاث الدین بلبن نے شاہزادہ محمد کو مقابلہ کے لئے متعین کر دیا تھا۔ وہ ۶۶۳ھ / ۱۲۶۵ء میں

Marfat.com

جب کہ سندھ و ملتان کا امیر تھا، مغلوں سے ایک لڑائی میں کام آگیا۔ با ایں ہمہ ہندوستانی لشکر نے مغلوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ یہ فتنہ اگرچہ کچھ دنوں کے لئے دب گیا۔ مگر پنجاب میں اس کی چنگاری کسی نہ کسی طرح سلگتی رہی۔

دوآبہ کے راجپوتوں کی گوشمالی

دوآبہ کے راجپوتوں کی کارروائیں کر دیکھ دہلی اور مشرقی صوبجات کے درمیان راستوں کو محفوظ کر دیا۔

کھوکھروں کے خلاف کارروائی

۱۲۶۸ء میں پنجاب کے پہاڑی علاقوں کے کھوکھروں کا صفایا کر کے اس علاقہ کو دفاعی لحاظ سے مضبوط کیا۔

روہیل کھنڈ کی بغاوت کا خاتمہ

بدایوں اور امروہہ کے نواح میں روہیل کھنڈ کے باغی راجپوت علاقہ پر ایک غیر معروف راستہ سے حملہ کر کے امن قائم کر دیا۔

ترک امرا کا خاتمہ

بلبن کو ایک مصیبت ترک امرا کی بھی تھی۔ جن کی سازشوں اور بغاوتوں نے سلطنت کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا تھا۔ مگر بلبن ان کا بھی حریف غالب ثابت ہوا۔

قلعوں اور سڑکوں کی تعمیر

اس نے تمام ایسے مقامات میں جہاں فتنہ پردازوں کو فساد پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا، قلعے تعمیر کرائے چوکیاں قائم کیں۔ اور اس طرح ان تمام راستوں کو صاف اور پُر امن بنا دیا۔ جو بقول ضیا برنی ساٹھ سال سے قزاقوں کا مسکن بنے ہوئے تھے اور لوگوں کی آمد و رفت وہاں مسدود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظام نرمی اور آسانی سے نہ ہو سکتا تھا اس

Marfat.com

لئے جب بلبن کو کسی ایسے گروہ کا پتہ چلا تو وہ شیر کی طرح وہاں پہنچ گیا اور شیر ہی کی طرح دشمنوں اور فتنہ برپا کرنے والوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس غرض سے اس نے بہت سے جنگل کٹوا کر سڑکیں بنوا دیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی۔

حکومت بلبن پر ایک عمومی تبصرہ

بلبن ادنیٰ درجے سے ترقی کر کے وزیر پھر بادشاہ بنا اور چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کا زمانہ خیر و برکت کا زمانہ تھا۔ انتظام سلطنت عدل و انصاف بیدار مغزی دور اندیشی علم و کرم، علم پروری، فرض شناسی غرضیکہ ہر اعتبار سے بلبن اپنا جواب نہ رکھتا تھا، رعایا مسرور مطمئن تھی۔ عمال امین و متدین تھے۔ علماء و فضلاء شعراء و مشائخ کا ہجوم تھا۔ علم و فضل کا چشمہ ہر جگہ ابلتا ہوا نظر آتا تھا۔ ملک میں ہر جگہ امن و سکون کی حکومت تھی۔ تمام ایشیا کے بڑے بڑے شاہزادے، امراء و شعراء دربار کی رونق بڑھا رہے تھے اور حضرت امیر خسرو کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ اس وقت بخارا بھی جو وسط ایشیا کا بہت بڑا مرکز علم و ہنر تھا۔ دہلی پر رشک کر رہا تھا۔

س :۔ غیاث الدین بلبن کے شخصی اوصاف، سیاسی نظریات اور کردار کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ وہ مجموعہ اضداد تھا

شخصی اوصاف

ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ صرف ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا اس وقت وہ عیش و تفریح کی طرف مائل تھا۔ بذلہ سنج ندیم، اور خوش گو مغنی اس کی محفل میں رہتے تھے۔ اور وہ بھی بادہ خواری اور قمار بازی اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل میں مصروف نظر آتا تھا۔ لیکن جب بادشاہ ہوا۔ تو اس نے اپنی زندگی کا ورق ہی الٹ دیا نہ کہیں محفل عیش و طرب تھی نہ بادہ خواری وہ حد درجہ متین و سنجیدہ ہو گیا۔ شراب خوری کو نہ خود ترک کیا بلکہ عام طور سے اس کے استعمال کی سخت ممانعت کر دی۔ نماز روزہ کا سختی سے پابند ہو گیا۔ یہاں تک کہ اشراق و تہجد کی نماز بھی وہ ترک نہ کرتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا بغیر علماء و صلحاء کی صحبت کے کھانا نہ کھاتا۔ ہمیشہ ان

Marfat.com

سے مسائل شرعیہ دریافت کرتا رہتا اور مشائخ کے مکانوں پر خود حاضری دیتا، لوگوں کی تعزیت کرنا۔ اکابر کے جنازوں میں حاضر رہتا اور اگر راستہ میں مجلس وعظ برپا دیکھتا تو تعظیماً سواری سے اتر پڑتا اور کچھ دیر سنتا۔ یہ تھا اس کے زہد و ورع کا عالم "

فیاضی و دریادلی

—— ملحقات طبقات ناصری مصنفہ شیخ عین الدین بیجاپوری کے حوالے سے فرشتہ نے لکھا ہے۔ فتنہ چنگیز خانی سے بھاگ کر ترکستان، ماوراء النہر، خراسان و عراق، فارس اور روم و شام وغیرہ پندرہ شاہزادوں نے بلبن کی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ بلبن نے ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک محلہ الگ کر دیا تھا۔ اور سب کے سالانہ وظائف مقرر کر دیئے تھے۔

عدل پروری

—— بلبن کی عدل پروری کا یہ عالم تھا کہ وہ انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا۔ اور نہ کسی کی سفارش کو مانتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر کبھی تمہارے طرف سے ظلم و ستم ظاہر ہوگا تو میں بغیر سزا دیئے ہوئے نہ چھوڑوں گا۔

ایک بار ملک نعیق وسہ جامدار نے جو امراء کبار میں سے تھا اور ولایت بدایوں اس کی جاگیر میں تھی، حالت مستی میں ایک خراش کو اس قدر درے مارے کہ وہ مر گیا۔ جب سلطان بلبن بدایوں پہنچا تو خراش کی بیوی دربار عام میں حاضر ہوئی۔ سلطان بلبن نے اسی وقت سب کے سامنے ملک نعیق کو طلب کیا اور اس قدر درے لگوائے کہ وہ بھی مر گیا اور بدایوں کے بریدوں (پرچہ نگاروں) کو جنہوں نے اس واقعہ کی اطلاع اسے نہیں دی تھی۔ شہر کے پھاٹک پر سولی دے دی۔

سیاسی نظریات

—— بلبن کے سیاسی نظریات اس نصیحت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جو اس نے ایک بار اپنے بیٹوں کو کی۔ فرمایا " دیکھو ایک بادشاہ کی نجات چار باتوں پر منحصر ہے ایک یہ کہ وہ خدا سے ڈر کر رعایا کے آرام و سکون کا انتظام کرے۔ دوسرے یہ کہ فسق و فجور کا ملک سے استیصال کلی کر دے، تیسری یہ کہ خدمات حکومت ہمیشہ خدا ترس امین

Marfat.com

اور شائستہ لوگوں کے سپرد کرے، چوتھی بات یہ کہ ظلم و ستم نہ ہونے دے اور انصاف کرنے میں کسی کی رعایت نہ کرے۔[1]

اس کے علاوہ غیاث الدین بلبن میں ایک سیاسی خوبی یہ تھی کہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند امیروں نے گجرات اور مالوہ اور بعض اور مقامات جو ایک اور التمش کے زمانہ میں اسلامی دائرہ حکومت میں داخل تھے۔ لیکن اب وہ سرکش ہوگئے تھے ان علاقوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی، لیکن بلبن نے مملکت کے اندرونی اور بیرونی حالات کے باعث دہلی کو چھوڑنا قرین مصلحت نہ سمجھا اور امراء کی درخواست مسترد کر دی۔[2]

اخلاق وعادات کے لحاظ سے مجموعۂ اضداد

اخلاق وعادات کے لحاظ سے

غیاث الدین بلبن مجموعہ اضداد تھا۔ یعنی ایک طرف اس کے لطف و کرم کا یہ عالم تھا کہ مغل حملوں کی بلا انگیزی کے باعث جو بادشاہ اور شہزادے ترکستان ماوراء النہر، خراسان، آذربائیجان، فارس، روم اور شام وغیرہ ملکوں سے تباہ حال ہو کر ہندوستان آ گئے تھے۔ بلبن نے ان سب کو اپنے دامن میں پناہ دی اور ان کو اپنے دربار کے امرائے کبار میں شامل کیا۔ ان میں سے دو شہزادے جو خلفائے بنی عباس کی نسل میں سے تھے پایہ تخت کے قریب بیٹھتے تھے۔ بلبن کی عادت تھی کہ اس قسم کا کوئی مہمان اس کے پاس آتا تھا۔ تو اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ وہ ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتا تھا۔ اور بسا اوقات کسی محلہ کا نام بھی مہمان کے نام پر ہی رکھ دیتا تھا۔ چنانچہ مورخ فرشتہ نے اس قسم کے پندرہ محلوں کے نام درج کیے ہیں۔ علاوہ بریں وہ علماء مشائخ اور ارباب ہنر کا بڑا قدر دان تھا علماء کے ساتھ اس کی عقیدت و ارادت اس درجہ کی تھی کہ بقول فرشتہ نماز جمعہ پڑھ کر ان کے گھر جاتا اور شیخ برہان بلخی مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی ایسے بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوتا تھا۔ طبیعت میں غم زدہ لوگوں سے ہمدردی کرنے کا جذبہ اس قدر تھا کہ علاوہ نماز جنازہ میں شریک ہونے کے میت کے گھر پر جاتا تھا اور مرحوم کے پس ماندگان کو صبر اور راضی برضا رہنے کی تلقین کرتا تھا اور یتیم بچوں کی پرورش کے لئے گراں بہا وظیفے مقرر کرتا

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ جلد صـ ۲۸۴

[2] تاریخ فرشتہ ج ۱ صـ ۲۸۵

Marfat.com

تھا۔ راستہ میں چلتے چلتے اگر کہیں مجلس وعظ نظر آتی تھی تو فوراً گھوڑے سے اتر کر مجلس میں شریک ہوتا اور وعظ میں خدا اور رسول کے احکام بغور سن کر زار زار روتا تھا [۱]

بایں ہمہ اسے سلطنت کا وقار اور حکومت کا دبدبہ وحشم قائم رکھنے کا بھی بڑا خیال تھا۔ اس بنا پر کسی مخالفت اور قانون کی خلاف ورزی کو ذرا برداشت نہ کرسکتا۔ باغیوں اور سرکشوں کو سخت سے سزائیں دیتا تھا۔ چنانچہ شمسی خاندان کے جن لوگوں پر اس کو اپنا حریف ہونے کا شبہہ تھا۔ ان سب کو کسی نہ کسی طرح قتل کرادیا، قانون کے احترام میں چھوٹے بڑے کسی کی ذرا رو رعایت نہ کرتا تھا۔ یہ درشتی اس کے زاہدانہ زندگی سے میل نہیں کھاتی۔ اس وجہ سے اس کا کردار خوف و احترام کی ملی جلی کیفیات کا مجموعہ تھا۔

س: مملوک سلاطین کے نظم مملکت پر مختصر تبصرہ کیجئے؟

اس دور میں مسلمان سلاطین کی سلطانی کا استناد خلفاء کی منظوری سے حاصل ہوتا تھا ہندوستان کے یہ سلاطین بھی خلفاء سے اپنا رسمی رشتہ قائم رکھتے تھے۔ اور رسماً خلیفۃ المسلمین کو سب پر تفوق حاصل تھا۔ اور یہ سلاطین گویا اس کی طرف سے نیابۃً حکومت کرتے تھے۔ اس کے خطبہ میں خلفاء اسلام کے ساتھ ان کے نام لئے جاتے تھے۔ مملوک سلاطین بھی اپنی سلطانی کی استناد خلفاء کی منظوری سے حاصل کرتے تھے۔

حکومت کے شعبے

سلطان کے بعد قدرۃً وزراء کو اہمیت حاصل تھی۔ جنہیں نظام الملک مویدالملک، صدر الملک، عین الملک وغیرہ کے خطابات دیئے جاتے تھے۔ لیکن یہ وزراء صرف کشوری امور کے مالک تھے۔ شعبہ عسکری، شعبہ مال، دیوان، انشار، معاملات خارجہ، اطلاعات اور وزارت انصاف کے شعبے علیحدہ قائم تھے۔ ان کے علاوہ امیر، حاجب، وکیل، دار، سارجاندار اور کبھی نائب مملکت کے عہدہ دار مقرر ہوتے پھر آخر میں نیابت کے عہدے مستقل کردیئے گئے جس میں نائب وزیر، نائب وکیل عہدہ دار تھے۔

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۲۸۶ اردو ترجمہ

Marfat.com

فوج

فوج کی کئی قسمیں تھیں، ایک تو شاہی فوج تھی جو ملک اور خصوصاً سرحد کی حفاظت پر مامور تھی۔ دوسرے صوبائی فوجیں صوبہ داروں کے ماتحت تھیں، کبھی ضرورت کے وقت بھرتی ہوتی تھی۔ فوج کے افسروں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ البتہ جاگیریں سپرد تھیں۔ البتہ قائم فوج کے سپاہیوں کی تنخواہیں مواجب کہلاتی تھیں۔

آئین و عدالت

قانون شریعت بنیادی آئین سمجھا جاتا تھا۔ مگر ضرورت کے مطابق اس کے خلاف عمل ہوا کرتا تھا ہندوؤں کے لئے ہندو کوڈ کے مطابق قوانین نافذ تھے۔ خصوصاً پرسنل لا میں انہیں کامل آزادی حاصل تھی۔ صدر جہاں کا عہدہ ہندوستان کی مرکزی عدالت کے چیف جسٹس کے لئے تھا۔ امرا وزرا سے رتبہ و احترام میں اس منصب کا درجہ اونچا تھا۔ چنانچہ مورخین نے فہرست پر شاہزادوں کے بعد ان کے نام لکھے ہیں۔ وہ صدر جہاں کے علاوہ قاضی القضاۃ، قاضی ممالک یا شیخ الاسلام بھی کہے جاتے ہیں۔ عدالتی نظام و انصرام و تقرر کے سارے اختیارات اس کو حاصل تھے [1]

پھر اس کے ماتحت عہدہ دار تھے۔ دیوانی مقدمات قاضی اور فوجداری کے مقدمات امیر داد سماعت کرتے تھے۔ کوتوال اور محتسب پولیس کا کام کرتے تھے۔ زکوٰۃ کا نظم بھی قائم تھا۔ اور دوسرے محاصل بھی لئے جاتے تھے۔ جنسی، تقرئی اور طلائی سکے کئی قسم کے جاری تھے۔

ڈاک کا نظم

ڈاک کے نظم کا بڑا عہدہ دار "وزیر برید ممالک" کہا جاتا تھا۔ اس کا صدر دفتر پایۂ تخت میں تھا اس کے ماتحت راستوں کا معقول نظم قائم رہتا تھا۔

صوبوں کا نظم

صوبوں کا نظم اس طرح تھا، کہ صوبہ دار اپنے حدود کے کامل ذمہ دار ہوتے

[1] طبقات ص ۱۲۵، ۱۷۷ - برنی ۲۴، ۱۲۶

Marfat.com

تھے۔ کبھی نائب والی بھی مقرر ہوتے تھے۔ صوبوں میں بھی چھوٹے پیمانہ پر حکومت کے وہ سب شعبے موجود تھے۔ جو مرکز میں قائم تھے۔ اس زمانہ میں صوبوں کے لئے اقسطاع کی اصلاح قائم تھی۔ صاحب اقسطاع کو عدالتی نظام میں دخل دینے کا اختیار نہ تھا۔ صوبہ دار شحنہ کوتوال کی مدد سے نظم و امن قائم رکھتا تھا۔ اور مرکزی حکومت کی طرف سے خطبہ و سکہ جاری رہتا تھا۔ کبھی باجگذار صوبے اپنا سکہ علیحدہ بھی جاری کرتے تھے۔

سلاطین کا طرز بود و ماند

مورخین نے مملوک سلاطین کے شاہانہ طرز بود و ماند کی نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے سلطان کے گرد صدہا نقیب و چاؤش پیادہ و سرہنگ امراء و فوجی سردار جمع رہتے تھے اور ایسا دبدبہ چھایا رہتا تھا کہ بڑی بڑی سلطنتوں کے امراء و سفراء "خاک بوسی" یعنی سلام کے وقت شدت تاثر سے لڑکھڑا کر گرتے اور بے ہوش ہو جاتے تھے۔ حالانکہ خود پرستی و عظمت نمائی کے یہ طریق اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی تھے۔ لیکن بلبن خود کہتا ہے کہ ان کو جائز اس لئے رکھا گیا ہے کہ قیام امن و عدل میں ان سے مدد ملتی ہے۔ [1] مظلوموں کی داد رسی ان سلاطین کا خاص شیوہ رہا۔ نیز وہ امور دین میں دینداری کو راہ دینے کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی حکومت کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

---

[1] برنی صفحہ ۳۱، ۳۲

Marfat.com

خلجی خاندان

س ۱۔ سلطان جلال الدین فیروز شاہ اگرچہ خاندان خلجی کا بانی تھا۔ لیکن بحیثیت حکمران وہ ناکام رہا۔ ان الفاظ کے پیش نظر اس کی شخصیت و کردار کا جائزہ لیجیے۔

بلبن کی وفات کے بعد اس کا پوتا کیقباد جو بغرا خان گورنر بنگالہ کا بیٹا تھا۔ نہایت نالائق تھا۔ دربار میں حسین و جمیل سازندوں و مطربوں کا ہجوم رہنے لگا۔ مسخروں اور بھانڈوں کی قدر ہونے لگی آخر کار ساڑھے تین سال تک اس طرح حکومت کے بعد چند ترکوں نے اس کو جب کہ وہ مرض فالج میں گرفتار تھا۔ قتل کر دیا اور اس کے بعد جلال الدین خلجی جو پنجاب کا گورنر تھا۔ سب کے اتفاق سے تخت نشین ہوا۔ اس طرح ۸۴ سال کے بعد خاندان غلاماں کا خاتمہ اور خلجی سلطنت کا آغاز ہوا۔ جلال الدین فیروز شاہ کو بڑھاپے میں دہلی کا تخت نصیب ہوا۔ لیکن چونکہ عام طور پر لوگ جلال الدین کی بادشاہت کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے اس نے کیلوکھری میں قیام کر کے ایک شہر نو کی بنیاد ڈالی اور شہر دہلی میں آکر تخت شاہی پر جلوس نہیں کیا۔ لیکن بقول صاحب طبقات اکبری جب لوگوں کو جلال الدین کی خدا ترسی بردباری حیا اور عدل و احسان کا علم ہوا تو چھوٹے بڑے سب شہر سے آئے اور جلال الدین کے ہاتھ پر بیعت کی [1] اب سلطان بڑے جاہ و حشم اور ایک آراستہ و پیراستہ لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ اور دولت خانہ میں پہنچ کر گھوڑے سے اترا، دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور پھر تخت شاہی پر جلوس کرنے کے بعد کہا "میں نے سال ہا سال تک اس تخت کے آگے سر جھکایا لیکن آج میں اس پر پاؤں رکھ رہا ہوں۔ اس احسان خداوندی کے شکر سے کس طرح عہدہ برا ہو سکوں گا۔ جلال الدین نہایت نیک طینت منکسر المزاج اور حلیم و بردبار تھا۔ تخت نشینی کے دوسرے سال بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے بغاوت کی اور خطبہ و سکہ اپنے نام جاری کر کے سلطان مغیث الدین کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ بہت سے امراء اس کے حامی ہو گئے۔ اب اس نے دہلی کا رخ کیا

---

[1] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۱۷

Marfat.com

سلطان جلال الدین اپنے فرزند اکبر خان خانان کو شہر دہلی میں اپنا قائم مقام بنا کر ملک چھجو کے مقابلہ کے لئے شہر سے نکلا شدید معرکہ آرائی کے بعد دشمن کو شکست فاش ہوئی اور اکثر اہلیان و امراء گرفتار کر کے خدمت سلطانی میں روانہ کر دیئے گئے۔ ملک چھجو بھی اسیر ہو کر بارگاہ شاہی میں پیش کیا گیا، سلطان نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ بلکہ ان میں سے چند خاص لوگ جو سلطان بلبن کے یہاں قدر و منزلت رکھتے تھے۔ ان کے متعلق اس نے حکم دیا کہ ان کو حمام میں لے جا کر غسل کرایا جائے۔ اور خلعت ہائے خاصہ پہنا کر ان کے عطر ملا جائے یہ لوگ سلطان کے وفور کرم سے حد درجہ نادم تھے۔ اور شرم کے مارے ایک لفظ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ سلطان نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا" تم لوگوں نے اپنے ولی نعمت کا حق ادا کرنے کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اب رہا ملک چھجو تو اس کو محامہ پر سوار کر کے ملتان بھیج دیا اور تاکید کر دی کہ اسے بحرمت تمام وہاں پہنچا دیا جائے اور عیش و عشرت کی جو چیزیں درکار ہوں وہ اس کو مہیا کر دی جائیں۔ ملک احمد صاحب اور دوسرے امراء نے کہا" ملک چھجو اور اس کے ساتھی سب کے سب واجب القتل تھے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ رو رعایت اور کرم و نوازش کا معاملہ کرنا آئین جہاں داری کے خلاف ہے تو بادشاہ نے جواب دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہے لیکن میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں کسی مسلمان کا خون نہیں بہانا چاہتا۔

۶۸۹ھ میں سلطان نے قلعہ رنتھنبور کو فتح کرنے کے لئے لشکر کشی کی۔ راجہ قلعہ بند ہو بیٹھا تو چند روز محاصرہ کرنے کے بعد سلطان نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا اور کہا یہ قلعہ اتنا اہم نہیں ہے کہ اس کو فتح کرنے کے لئے ایک جان کی قربانی بھی پیش کی جا سکے اور بالفرض اگر میں نے یہ قلعہ فتح کر بھی لیا اور خدا کے بندوں کو قتل کرا دیا تو کل جب عورتیں بیوہ ہو کر اور بچے یتیم ہو کر میرے سامنے آئیں گے اور میری نظر ان پر پڑے گی تو میرا کیا حال ہو گا۔ قلعہ کی فتح کی ساری لذت مجھ پر زہر سے زیادہ تلخ ہو جائے گی۔[1]

ایک مرتبہ سلطان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے مغلوں سے بارہا جنگیں کی ہیں اور ان میں کامیاب رہا ہوں پھر کیوں نہ مجھ کو خطبہ میں المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی ملکہ جہاں سے کہا کہ کسی تہنیت کی تقریب سے اعیان و اکابر محل میں آئیں تو بیگم ان سے کہیں کہ

---

[1] طبقات اکبری ج ۱ صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸

Marfat.com

لوگ مجھ سے خطبہ میں اس خطاب کے استعمال کرنے کا ذکر کریں اور اس کے لئے مجھ سے اجازت کریں، لیکن جب اس قرار داد کے مطابق قاضی فخرالدین نے جو علامہ عصر نے اعیان واکابر کی نمائندگی کرتے ہوئے سلطان کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو سلطان کو تنبیہ ہوا اور اس نے کہا مجھے معلوم ہے آپ لوگ میرے کہنے کے مطابق ملک جہاں کے ایما سے یہ کہہ رہے ہیں۔ لیکن مجھ کو اسی وقت یہ خیال آیا تھا کہ میں نے دشمنان خدا سے جتنی لڑائیاں لڑی ہیں ان میں سے کوئی جنگ بھی ایسی نہیں ہے جو نہی بے غرض دنیوی کے شائبہ کے بغیر محض خدا کے لئے لڑی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں اپنی خواہش پر پشیمان ہوا اور اب میں نے اپنے ارادہ سے رجوع کر لیا ہے [1]

اس حد درجہ نرم خوئی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک میں فتنہ و فساد اٹھ کھڑا ہوا اور شہری زندگی کا امن وامان فنا ہو گیا۔ چور اور راہزن سلطان کے دربار میں گرفتار کر کے لائے جاتے تھے۔ اور سلطان ان کو کسی قسم کی سزا دیئے بغیر محض آئندہ کے لئے چوری نہ کرنے کی قسم لے کر رہا کر دیتا تھا۔ لوگ شراب کے نشہ سے بدمست ہو کر سلطان کے خلاف سخت باغیانہ باتیں کہتے تھے ان تمام باتوں کا علم ہونے کے باوجود سلطان یہ کہہ کر چشم پوشی کر لیتا تھا کہ ان لوگوں نے مستی کے عالم میں یہ باتیں کہی ہیں۔ اس لئے ان کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس قسم کے اور دوسرے لوگ جو سلطان کی علانیہ ہجو کرتے تھے۔ جب دربار میں پکڑ کے لائے جاتے تھے۔ تو سلطان نہ صرف یہ کہہ کر انہیں رہا کر دیتا تھا بلکہ انہیں اپنا ندیم خاص بنا لیتا اور انہیں خلعت و اکرام دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک شخص "مندا ہری" نے جلال الدین کی گورنری سامانہ کے زمانہ میں اس کے چہرہ پر ایک ایسا کاری زخم لگایا تھا کہ اس کا نشان آخر عمر تک رہا۔ لیکن اس کے باوجود جلال الدین بادشاہ ہو جانے کے بعد جب یہ شخص، دربار میں گرفتار کر کے لایا گیا تو سلطان نے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف جلال الدین یہ کہتا ہے کہ چند روزہ سلطنت کے لئے میں احکام اسلامی سے سرتابی کیوں کروں اور دوسری جانب اس کے محل میں شراب خوری کا دور بھی چلتا تھا۔ امیر خسرو ہر روز ایک نئی غزل لکھ کر لاتے تھے۔ اور سازندے اسے ساز پر گا کر سناتے تھے۔

ضیاء الدین برنی نے ان مجالس کا تذکرہ بڑے آب و تاب کے ساتھ کیا ہے۔ بادشاہ کی حد سے زیادہ نرم خوئی اور اس کی مجالس کا چرچا ملک میں عام ہوا تو لوگوں میں اس کی طرف

---

[1] طبقات اکبری ج ۱ صفحہ ۱۲۴

Marfat.com

سے عام بددلی پیدا ہوگئی اور انہوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص اصول جہاں دار اور بادشاہی نہیں جانتا" اس اثنا میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا کہ سیدی مولا جو ایک بڑے بزرگ تھے۔ اور جن کی دہلی میں ایک بڑی خانقاہ تھی۔ بغاوت اور بادشاہ کے خلاف سازش کے شبہ پر بڑے دردانگیز طریقہ پر سلطان کے ایما سے قتل کیے گئے اس واقعہ نے تمام ملک میں آگ لگا دی۔

ایک طرف ملک میں جلال الدین کے متعلق اس قسم کی باتیں مشہور تھیں۔ جن سے اس کو ہر دلعزیزی حاصل رہی تھی۔ اور دوسری جانب بادشاہ کا بھتیجہ علاءالدین خلجی متعدد فتوحات کی وجہ سے زور پکڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مکمل اور گہری سازش کے ماتحت اس نے چچا کو گڑھ بلایا اور وہاں نہایت بے رحمی کے ساتھ جب کہ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اور جلال الدین مسافر ہونے کے باوجود روزہ سے تھا۔ اسے قتل کرا دیا اور اس کے سر بریدہ کو ایک نیزہ پر آویزاں کر کے شہر کی گلی کوچوں میں گشت کرایا۔

س :۔ علاؤالدین خلجی کے دور کی اہم فتوحات کا مختصر حال بیان کیجئے۔

۶۹۷ھ / ۱۲۹۷ء میں گجرات کے راجہ کا وزیر مادھو جو راجہ سے ناراض ہو کر دہلی آیا تھا۔ دربار میں حاضر ہوا اور گجرات فتح کرنے کا شوق دلایا، سلطان علاءالدین نے ملک نصرت اور الغ خان کو اس کے لیے روانہ کیا ان دونوں نے بیس ہزار فوج سے گجرات فتح کر لیا۔ راجہ کرن باگھیلا بھاگ کر دکن پہنچا۔ الغ خان کامیاب لوٹا۔ راجہ کی رانی کملا دیوی اور اس کی لڑکی دیول دیوی بھی دہلی پہنچ گئیں۔ دیول دیوی کی شادی شاہزادہ ولی عہد خضر خان سے کر دی گئی۔ اسی سال مغلوں نے دو لاکھ فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ کیا۔ علاؤالدین کو قلعہ بند ہونے کا مشورہ دیا گیا۔ مگر مغلوں کے ڈر سے دہلی میں اس قدر مخلوق جمع ہو گئی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ علاءالدین اپنی فوج لے کر باہر نکلا اور بڑی بہادری سے لڑ کر مغلوں کو ایسی شکست دی کہ ایک مدت تک ان کو ہندوستان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی مگر اس کا بہترین سپہ سالار ظفر خان اس لڑائی میں شہید ہو گیا۔ ۶۹۹ھ / ۱۲۹۹ء میں اس نے الماس بیگ الغ خان کو رنتھبور فتح کرنے کے لئے بھیجا جو اسی سال فتح ہو گیا۔

۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء میں اس نے چتوڑ پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اور راجہ مالدیو کو اس کا حکم سنایا۔ ملک کافور جو کھنبات کے ایک بغدادی سوداگر سے چھین کر دہلی لایا گیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ بلند درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ ۷۰۶ھ / ۱۳۰۶ء میں اس کے ماتحت ایک زبردست فوج دکن فتح کرنے کے لئے اس نے روانہ کی

Marfat.com

مالوہ سے یہ فوج دکن کی طرف ایک سیلاب کی طرح بڑھی۔ اور دیکھتے دیکھتے تمام دکن پر چھا گئی۔ ۷۱۲ھ (۱۳۱۲ء) تک کافور نے دھور سمند (متصل میسور) پر ابھی فتح کا نقارہ بجایا اور ایک مسجد یادگار کے طور پر بنائی، جو جہانگیر بادشاہ کے زمانہ تک موجود تھی۔ کافور سارے دکن کو فتح کر کے بڑی آسانی کے ساتھ دہلی پہنچا۔

اب علاؤالدین بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کی صحت روز بروز خراب ہونے لگی۔ بیماری سے مزاج میں فرق آ گیا۔ اس کی سخت گیری بڑھتی گئی۔ ادھر ملک کافور نے اس کو سب لوگوں سے بدگمان کر دیا یہاں تک کہ اس کے بیٹوں اور بیگموں کو بھی اس کی نظروں میں مشکوک بنا کے محل میں قید کرا دیا اور پھر اپنے حریف گجرات کے حاکم الپ خان کو بھی قتل کرا دیا غرض اسی حالت میں ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء) میں علاؤالدین انتقال کر گیا۔ بنگال سے گجرات تک اور پنجاب سے دکن تک اس کی سلطنت پھیلی تھی۔ یہ گویا پورے ملک ہندوستان کا پہلا مسلمان شہنشاہ تھا۔

س : علاءالدین خلجی نے کونسی اصلاحات نافذ کیں۔ مفصل بحث کیجئے۔

ملکی اصلاحات

فتوحات اور وسعتِ مملکت کے اعتبار سے یہ قول شیخ محمد اکرام صاحب آئی۔ سی۔ ایس کے ہندوستان کا جتنا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔ برطانوی حکومت سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوا ہے لیکن وہ جتنا بڑا بہادر سپاہی دلیر اور جنگ کے معاملہ میں حوصلہ مند تھا۔ اتنا ہی بیدار مغز اور منتظم بھی تھا۔ اس نے محکمہ جاسوسی کو اس درجہ ترقی دی کہ ملک کی ایک ایک[1] بات سے باخبر رہتا تھا۔ رات کو امراء کے گھروں میں جو بات چیت ہوتی صبح کو جب یہ لوگ دربار میں آتے تھے تو حرف بحرف ان کو شب کی گفتگو سنا دیتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر کسی کے دل میں بادشاہ کے خلاف کوئی شکایت یا برائی ہوتی بھی تھی تو وہ راز کی مجلس میں بھی اس کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ معاملات مملکت کے متعلق کافی غور و خوض اور ارباب رائے سے مشورہ کے بعد اپنی پالیسی متعین کرتا تھا۔ اور اس پر سختی سے کاربند رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ لشکروں کے حالات سے باخبر

---

[1] چشمہ کوثر ص ۱۲۹

Marfat.com

رہنے کے لیے اس نے یہ انتظام کیا تھا کہ جب وہ کہیں لشکر روانہ کرتا تھا۔ تو وہاں سے لشکر کی فرودگاہ تک ڈاک چوکی جس کو پہلے زمانہ میں بام کہا جاتا تھا۔ بٹھائی جاتی تھی۔ اور ہر کوس پر دو پیادے جن کو ہندی میں "پایک" کہتے تھے۔ متعین کیے جاتے تھے۔ تاکہ میدان جنگ کے حالات روزانہ قلم بند کر لئے جائیں۔ راستے اس قدر پر امن تھے کہ سوداگر بے یار و مددگار راتوں کو سفر کرتے تھے[1] سڑکوں کا انتظام اس قدر اعلیٰ تھا کہ "بنگالہ کے راستہ دریائے شور کے کنارے تک اور سندھ اور گجرات کی راہیں تلنگانہ اور مالا بار تک اور لاہور کی سڑکیں کابل و کشمیر تک دہلی اور سیری کی گلی کوچوں کا نمونہ بن گئیں۔ راہ گیر جس قدر مال چاہتے تھے۔ اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ اور جس جنگل میں ان کا جی چاہتا۔ اس کا خانہ ہفت حصار سمجھ کر مال کو زمین پر پھینک دیتے تھے۔ اور خود بے خوف و خطر رات کو آرام سے سوتے تھے۔ مسافر غریب الوطن اور اجنبی اشخاص جس گاؤں میں پہنچتے تھے۔ اس کا چودھری اور دوسرے اہل قصبہ ان لوگوں کی مہمان نوازی کرتے تھے"[2] عام طور پر اخلاقی مصائب اور فتنہ و فساد شراب نوشی سے پیدا ہوتے ہیں۔ علاء الدین خلجی نے ادھر بھی توجہ کی چنانچہ پہلے خود شراب سے توبہ کی پھر تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص کھلم کھلا یا پوشیدہ طور پر شراب پیے گا۔ اسے شدید ترین سزا دی جائے گی۔ بدایوں میں ایک خاص کنواں اس لئے تھا کہ جو شخص اس اعلان کے بعد بھی شراب نوشی کے جرم میں گرفتار ہوتا تھا۔ اس کنویں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک سے اس ام الخبائث کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ علاؤالدین نے یہ حکم بھی جاری کر رکھا تھا کہ شاہی امیر اور درباری رئیس حکم سلطانی کے بغیر ایک دوسرے سے رشتہ قرابت قائم نہ اور نہ باہم ضیافت اور مہمان واری کا سلسلہ جاری رکھیں۔

اقتصادی اصلاحات

ہمارے زمانہ میں دو چیزیں مملکت کے حسن انتظام اور رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ دولت کی تقسیم مساوی ہونی چاہئے تاکہ سرمایہ دار لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں غریبوں پر بے جا ظلم و ستم اور زیادتی نہ کر سکیں اور دوسرے یہ کہ اجناس اور دوسری چیزوں کے نرخ حکومت کی طرف سے مقرر کر دیئے جائیں اور ان چیزوں کی فراہمی کا کام بھی حکومت کے سپرد ہونا چاہئے۔ تاکہ دولت مند اور ارباب اغراض حد سے زیادہ نفع خوری کی لعنت میں مبتلا ہو کر عوام کے

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۳۷۴ [2] تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ ۳۷۴

Marfat.com

لئے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ عجیب بات ہے کہ علاؤالدین خلجی کی بھی ان دونوں باتوں کی طرف توجہ ہوئی۔ اور اس نے ان کا اتنا اچھا انتظام اور بندوبست کیا کہ ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ یا ہندو راجہ کے عہد میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ اس نے امیر زدل یعنی ملک سے سرمایہ داری ختم کرنے اور لوگوں کو محنت سے پیسہ کمانے کا خوگر بنانے کے لئے یہ کہا کہ ہر قصبہ جو معافی یا وقف یا کسی اور طرح پر رعیت کے قبضہ میں تھا۔ املاک شاہی میں شامل کر لیا اور ہر مسلم اور غیر مسلم غریب و امیر پر جا و بے جا ہر طرح کا دباؤ ڈال کر جو کچھ ان کی پونجی تھی ان سے لے کر خزانہ میں داخل کی فرشتہ کا بیان ہے۔

علاءالدین نے چاہا کہ سلطنت میں چند ضابطے ایسے جاری کرے جس سے کمزور اور طاقت ور لوگوں میں بالکل مساوات ہو جائے اور گاؤں کے چودھریوں کو جو فوقیت رعایا پر حاصل ہے۔ وہ باقی نہ رہے" [1]

اب رہی دوسری چیز یعنی اشیاء کی نرخ بندی ان کی قیمتوں اور ان کی فراہمی کی نگرانی تو کوئی شبہہ نہیں کہ اس زمانہ میں آمد و رفت اور خبر رسانی کا کام نہایت ہی مشکل تھا۔ لیکن علاءالدین خلجی نے اسے جس طرح رائج کیا اور اس کے لئے جو قواعد و ضوابط بنائے وہ یقیناً اس زمانہ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے نرخ بندی کا یہ نظام اشیاء خوردنی و نوشیدنی کپڑا، لباس، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل تھا۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمین کے مدارج و مراتب قائم کرکے ہر مرتبہ اور درجہ کے لئے الگ الگ تنخواہوں کی تعداد مقرر کر دی گئی تھی۔ جس میں نہ کمی ہو سکتی تھی اور نہ زیادتی حد یہ ہے کہ ارباب نشاط، سازندوں گویوں کے لئے بھی ان کے مختلف مدارج کمال کے اعتبار سے نرخ مقرر کر دیا گیا۔ جس سے زائد وہ ایک پیسہ وصول نہیں کر سکتے تھے۔ اشیاء کی درآمد و برآمد کے لئے اس نے ایک محکمہ سرائے عدل کے نام سے قائم کیا تھا۔ سوداگر باہر سے جو چیزیں لاتے تھے۔ اس محکمہ کے علم اور اجازت کے بغیر اس کی مقرر کی ہوئی قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ فرشتہ نے اس پورے نظام کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر صرف غلہ کا نرخ نامہ نقل کرتے ہیں۔ اس سے دوسری اشیاء کے نرخناموں کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

گیہوں	فی من	۷½ چیتل
جو	؍؍	۴ چیتل

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۷۶

Marfat.com

چنا	فی من	پانچ جیتل
دھان	″	″ ″
ماش	″	″ ″
موٹھ	″	تین[1] ″

علاء الدین کے آخری زمانہ تک غلہ کا یہ نرخ قائم رہا۔ البتہ کبھی کبھی بارش کی کمی یا دوسرے اسباب قحط کی وجہ سے اس میں کچھ فرق ہو جاتا تھا۔

مالگذاری کے اصول

علاء الدین خلجی کے زمانہ کا دور شروع ہونے تک مالگذاری کے انتظام کی صورت یہ تھی نہ مقدم اور چودھری سے وصول مالگذاری کا معاملہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ لوگ رعایا کو سخت تباہ کر رہے تھے۔ چنانچہ سلطان نے پیمائش زمین کے مطابق مالگذاری فی بسوہ مقرر کی اور حکم دیا کہ نصف پیداوار بلا کسی استثناء و کمی کے سب سے وصول کر لی جائے۔ علاوہ اس کے مقدموں سے جو وصولی ہو وہ خزانہ میں داخل کیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص خواہ مقدم ہو، یا معمولی کاشتکار چار بیل دو بھینسیں، دو گائیں اور بارہ بکریوں یا بھیڑوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ پھر چرائی بھی مقرر کی۔ اور آباد گھروں کا کرایہ بھی معین کیا۔ اگر کوئی محرر یا عامل بددیانتی کرتا یا ان احکام کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی اور اگر سوائے چارہ کے وہ کوئی اور چیز گاؤں سے حاصل کرتا تو پٹواری کے کاغذات دیکھ کر اس کی قیمت وصول کر لی جاتی۔ اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خائن عمال و محرر ملازمت سے بیزار ہو کر نوکریاں ترک کرنے لگے۔ اور تمام مقدم چودھری جو معزز اور امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بالکل محتاج ہو گئے اور ان کی عورتیں محنت و مزدوری کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ زمین کی پیمائش اور پیداواری اہلیت کے لحاظ سے مالیہ کی شرح مقرر کی۔ مالیہ نہ ادا کرنے والی جاگیریں

---

[1] سید ہاشمی صاحب فرید آبادی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک من جیسا کہ فرشتہ نے خود تصریح کی ۹۶۰ تولہ (یعنی ہمارے ۱۲ سیر) کے برابر ہوتا تھا۔ (حوالتی تاریخ سکر ج ص۱۲) اب رہا جیتل تو وہ ہمارے ادھے کے ہم وزن از قیمت تنکہ (یا روپیہ) چالیسواں حصہ سمجھا جاتا تھا۔ حوالتی تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۰۰)

Marfat.com

ضبط کرلیں۔

فوجی اصلاحات

جب علاؤالدین بازار کا سارا انتظام مکمل کر چکا اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں حسب ذیل مقرر کیں۔

سپاہی درجہ اول دو سو چونتیس تنکہ (تقریباً ۲۴ پونڈ طلائی موجودہ سکہ کے مطابق) ماہوار

سپاہی درجہ دوم ——— ۱۵۶ تنکہ ماہوار

سپاہی درجہ سوم ——— ۸۷ تنکہ ماہوار

جس کے پاس دو گھوڑے ہوتے اس کو ۷۸ تنکہ اور زیادہ ملتا تھا۔

علاؤالدین نے اپنی بادشاہت کی بنیاد فوجی قوت پر رکھی تھی اس کے علاوہ اس کو تخت نشینی کے فوراً بعد منگولوں کی بہت بڑی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا اس لئے اس نے ایک عظیم الشان اور طاقت ور فوج بنائی۔

منگولوں کے حملے کو روکنے کے لئے اس نے سرحدی پالیسی کو مضبوط بنایا۔ سرحدی قلعوں کی دوبارہ مرمت کروائی، سرحدوں پر تربیت یافتہ فوج متعین کی وہاں سامان حرب اور خوراک کے ذخیرے جمع کئے گئے۔ اور آزمودہ جرنیلوں کو سرحدوں پر متعین کیا۔ فوج کا صحیح اندازہ کرنا تو مشکل ہے، لیکن تاریخوں سے یہ ثابت ہے کہ صرف سواروں کی تعداد چار لاکھ بہتر ہزار تھی۔

داغ وچہرہ کا نظام

فوجی تنظیم میں گھوڑ اسوار فوج کو سب سے زیادہ موثر اور اہم ترین مقام حاصل تھا۔ کوئی جنگ اس حصہ کے بغیر لڑی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لئے "گھوڑا" وہ بنیادی عنصر تھا کہ جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جاگیردار اپنی جاگیروں کے عوض حکومت کو جنگ کے موقع پر مقررہ تعداد جنگی گھوڑے فراہم کرتے تھے۔ یہ تعداد عام طور پر پہلے سے ہی مقرر ہوتی تھی، ایک یہ طریقہ بھی تھا کہ حکومت کی طرف سے جاگیردار سرکاری زمینوں پر گھوڑے پالتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے بددیانتی اور دھوکہ دہی سے کام لینا شروع کر دیا۔ حکومت کے معائنہ کے وقت اِدھر اُدھر سے ناکام جانور اکٹھے کر کے ان کی نمائش کر دی

Marfat.com

جاتی تھی۔ علاء الدین خلجی نے اس بدعنوانی کا موثر سدباب کیا۔ اس نے ایسے تمام گھوڑوں کو داغ کر نمبر لگانے کا طریق رائج کر دیا۔ ان کی درجہ بندی بلحاظ خصائل و کارکردگی کر دی۔ باقاعدہ تحریری طور پر ان کا حساب رکھنے کا حکم دیا۔ اس طریق کو داغ و چہرہ یا داغ و حلیہ کا طریق کہا گیا ہے۔ علاء الدین کا یہ طریق بڑا مدد رس اور پائیدار ثابت ہوا اور جدید دور تک اس کو برقرار رکھا ہے۔

فوج کی جاگیردارانہ نوعیت کا خاتمہ

فوجی اصلاحات کے ضمن میں ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے جاگیرداری نظام کو محدود کر کے امراء کی فوجی قوت کا خاتمہ کر دیا مرکز کا کنٹرول فوج پر زیادہ ہوگیا۔ باقاعدہ تنخواہیں اور نظم و ضبط کے قوانین لاگو کر دیئے۔

س :۔ علاء الدین خلجی کی شخصیت و کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیئے۔

عزم و ثبات

سلطان علاء الدین بے انتہا سخت اور ظالم ہونے کی حد تک سخت گیر تھا۔ لیکن وہ ایک بے مثل سپاہی اور بڑے زبردست عزم کا بادشاہ تھا۔ جس وقت علاء الدین کو معلوم ہوا کہ قتلغ خواجہ پسر دوا خان (ماوراء النہر کا بادشاہ) دو لاکھ مغلوں کی جمعیت سے دریائے سندھ کو عبور کر چکا ہے۔ اور اب تسخیر دہلی کے لئے آرہا ہے اور اس مغل سے خائف ہو کر ہزاروں آدمی قرب و جوار کے بھاگ بھاگ کر روزانہ دہلی میں پہنچ رہے تھے گلیوں بازاروں، مسجدوں اور محلات میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو پناہ گزینوں سے نہ بھر گئی ہو، غلہ اور تمام اشیاء سخت گراں ہو گئی تھیں۔ چنانچہ علاء الدین نے امراء کو جمع کر کے سب کی رائے طلب کی، چونکہ دہلی کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ مغلوں کی مدافعت آسانی سے ہو سکتی اس لئے اکثر امراء نے یہی رائے دی کہ جہاں تک ممکن ہو۔ صلح و آشتی سے کام لے کر اس فتنہ کو دفع کر دینا چاہیے علاء الدین نے یہ سن کر کہا کہ "جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ صحیح ہے لیکن یہ بتایئے کہ میں دنیا کو اپنی صورت کیونکر دکھا سکوں گا۔ کیا منہ لے کر گھر میں جاؤں گا۔ اور میں کیا سلطنت کروں گا۔ نتیجہ جو کچھ ہو۔ میں ان مغلوں سے جنگ کروں گا۔"

Marfat.com

چنانچہ اس نے الغ خاں اور ظفر خان کو سپاہ بیکراں کے ساتھ روانہ کیا اور شہر کا مناسب انتظام کیا۔ علائی فوج نے لاہور کے حدود میدان کیلی میں مغلوں سے ایسا مردانہ وار مقابلہ کیا کہ تاریخ میں اس کی دوسری نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو سخت شکست ہوئی اور علاءالدین تاج فتح مندی سر پر رکھے ہوئے دلی واپس آیا اور اپنے نام کے خطبہ میں سکوں میں سکندر ثانی کے لقب کا اضافہ کیا۔ [۱]

علاءالدین خلجی ایک مستقل مزاج اور انتھک آدمی تھا۔ میدان عمل میں اس کا حوصلہ اور ولولہ کبھی متزلزل نہ ہوا وہ ایک ناقابل شکست ارادے کا مالک تھا۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر برسرپیکار رہا اور ہر محاذ پر کامیابی نے اس کے پاؤں چومے۔

علاءالدین خلجی تعمیر و ترقی کا بے پناہ جذبہ رکھتا تھا۔ اقتصادی اصلاحات اس کا بڑا تعمیری کارنامہ تھا۔ جن کو مجملاً یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ اہل بازار کو نرخ مقرر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ صرف بادشاہ نرخ مقرر کرے گا چنانچہ تمام مملکت میں نرخ مقرر کر دیئے گئے۔

۲۔ ملک قبول الغ خاں منڈی کا ڈلمدو غز یا سخنہ مقرر کیا گیا جس کا کام صرف یہ تھا کہ مقررہ نرخ میں کوئی تفاوت نہ ہونے دے۔

۳۔ دوآب کے تمام خالصہ دیہات کی مالگذاری غلہ کی صورت میں وصول کی جائے۔ اور سلطنت کی طرف سے غلہ کے انبار محفوظ رہیں۔ اگر بازار کا غلہ کم ہو جائے تو شاہی غلہ کو بازار کے نرخ سے فروخت کریں۔

۴۔ سلطنت کے تمام سفری غلہ فروشوں کو طلب کر کے ساحل جمن پر آباد کیا جائے اور ان سے معاہدہ لیا جائے کہ باہر سے غلہ منگا کر شہر میں مقررہ نرخ سے فروخت کریں گے۔

۵۔ غلہ جمع کرنے کی سخت ممانعت کر دی اگر کوئی شخص غلہ جمع کرتا تو بحق سلطنت قرق کر لیا جاتا اور سخت تنبیہہ کی جاتی ولایت دوآبہ کے افسران مال سے اقرار نامہ لیا گیا کہ کوئی شخص ان کے علاقہ میں غلہ جمع نہ کرے۔

۶۔ افسران مال (ریونیو) سے اقرار نامہ لیا گیا کہ وہ کھیتوں ہی پر بنجاروں سے قیمت دلا کر غلہ دے

---

[۱] بدایونی ۷۴۔ فرشتہ ۱۰۳ طبقات اکبری ۷۰

Marfat.com

دیں ۔ اور سوائے اپنے ضروری خرچ کے غلہ کا ایک دانہ بھی کوئی کاشت کار گھر نہ لے جائے ۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ غلہ فروشوں کو غلہ آسانی سے ملنے لگا اور بازار میں افراط ہوگئی ۔

۷ ۔ منڈی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے تین عہدہ دار مقرر کئے ۔ شحنۂ منڈی ، دوسرے برید منڈی ، تیسرے جاسوس منڈی ، ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ بازار کے حال اور منڈی کے نرخ سے روزانہ بادشاہ کو اطلاع دیتا ۔

۸ ۔ اسی طرح کپڑے کا نرخ مقرر کیا گیا ۔

۹ ۔ سوداگران شہر و اطراف کے نام دفتر میں درج کئے گئے اور ان سے اقرار نامہ لیا گیا کہ اس قدر کپڑا اور اس قسم کا ہر سال لاکر سرائے عدل میں مقررہ نرخ پر فروخت کریں ۔

الغرض علاء الدین نے بازار کا مستحکم اور عجیب و غریب انتظام کیا ۔ اس کی حالت میں پھر کوئی تغیر نہیں ہوا ۔ اور کبھی کسی نے قانون مقررہ کی خلاف ورزی نہیں ۔

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے علاء الدین کی شخصیت کے بعض عمدہ اور مثبت پہلو سامنے آتے ہیں ۔ دور جدید میں دو چیزیں مملکت کے حسن انتظام اور رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں ایک یہ کہ دولت کی تقسیم مساوی ہونی چاہیئے تاکہ سرمایہ دار لوگ اپنی دولت کے غرور میں غریبوں پر بے جا ظلم و ستم اور زیادتی نہ کرسکیں اور دوسرے یہ کہ اجناس اور دوسری ضروری چیزوں کے نرخ حکومت کی طرف سے مقرر کئے جائیں اور ان چیزوں کی فراہمی کا کام بھی حکومت کے سپرد ہونا چاہیئے ۔ علاء الدین خلجی کو بھی ان دونوں باتوں کی طرف توجہ ہوئی اور ان کا اتنا اچھا انتظام اور بندوبست کیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی ۔

علاءالدین کی خودسری اور انانیت

جہاں علاء الدین کے دماغ میں جہاں گیری اور کشور کشائی کا یہ سودا ایک رہا تھا اور دوسری جانب چونکہ وہ جاہل اور ان پڑھ تھا اور مذہب سے واقفیت نہ رکھتا تھا ۔ اس لئے اس کے سر پر اس بات کا جنون بھی سوار ہوا کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوت و شوکت سے شریعت قائم کی اور آپ کے خلفاء اربعہ کے ذریعہ اسے استحکام نصیب ہوا اسی طرح وہ بھی ایک نیا مذہب اختیار کرے اور اپنے مشیران کار کی مدد سے اس کو رائج کرے علاء الدین سمجھتا تھا کہ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کا نام

Marfat.com

دنیا میں قیامت تک باقی رہے گا۔ ؎

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ علاء الدین جو کچھ کرتا تھا اس میں صحیح مذہبی جذبہ کا دخل نہ تھا۔ بلکہ اس کے کارناموں اور فتوحات کا اصل مقصد شہرت و نام پروری اور جمع دولت و ثروت تھا۔ خوش قسمتی سے علاء الدین کو کوتوال علاء الملک اور قاضی مغیث ایسے حق گو اور صداقت شعار لوگ مل گئے۔ جن کی وجہ سے علاء الدین کو گمراہی اور غلطی پر فوراً تنبیہ ہوا اور وہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کی تقویت سے محفوظ رہا۔

علاء الدین نے قاضی مغیث سے بعض دینی اور شرعی مسائل کے بارے میں سوال کئے اور ان میں خود اپنے طرز عمل اور اس کے شرعی جواز کے بارے میں پوچھا قاضی موصوف نے صاف طور اس کے بعض اقدام کو خلاف قانون اور اسلام کے منافی قرار دیا۔ بادشاہ قاضی مغیث کے جوابات پر اگرچہ بہت غصہ آیا لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو برملا قاضی مغیث کی حق گوئی اور سچائی کا اعتراف کیا اور کہا اگرچہ میں علم سے بالکل بے بہرہ ہوں اور فرائض اور نوافل کے مسائل سے نابلد ہوں لیکن مسلمان ہوں اور مسلمان زادہ ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ بالکل صحیح ہے لیکن ملک کے خاص حالات کے پیش نظر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ نظم و نسق کی خاطر مجرموں کو شدید ترین سزائیں دی جائیں بہرحال میری نیت بخیر اور اس کا مقصد خلق اللہ کی سربلندی ہے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ سے عقیدت

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سلطان علاء الدین خلجی کو حضرت سلطان نظام الدین اولیاء سے بڑی عقیدت اور ارادت ہوگئی تھی۔ جب کبھی اسے کوئی مہم پیش آتی تھی تو وہ حضرت کی طرف رجوع کرتا تھا۔ اور خطوط کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ اپنے خطوط میں ہمیشہ یک جہتی اور خلوص کا اظہار کرکے حضرت شیخ کے انوار باطن سے مدد طلب کرتا تھا۔

سیاہ دھبے

ان اوصاف کے باوجود علاء الدین خلجی کے دامن پر کچھ سیاہ دھبے ہیں۔

؎ طبقات اکبری ج ۱ صہ ۱۴۴ - ۱۴۵

Marfat.com

وہ دھبے بعض دردناک قتل ہیں۔ جلال الدین فیروز شاہ اور اس کے لڑکوں اور امراء کو جس دردناک طریقہ سے علاء الدین نے قتل کروایا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ منگول نومسلم جو دہلی میں آباد تھے۔ ان کو بڑی سفاکی سے محض اس لئے قتل کروایا کہ ان کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ وہ بادشاہ کے خلاف باغیانہ خفیہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں ان کی عورتوں اور بچوں کو دہلی کے گلی کوچوں میں فروخت کر دیا گیا۔ یہ سب مظالم علاء الدین نے یا تو حکومت کے حصول کے لئے یا پھر اس کے تحفظ کے لئے کیے۔

Marfat.com

خاندان تغلق

س :- سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت اور کارناموں پر تبصرہ کیجیے۔

خسرو جان کو تخت حکومت پر بیٹھے ابھی پانچ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ غازی ملک فخر الدین جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا اور جو اس زمانہ میں پنجاب کا گورنر تھا۔ ایک لشکر جرار و کثیر کے ساتھ سیل تند و تیز کی مانند دہلی کی طرف بڑھا اور تمام لعنتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا ہوا لے گیا۔ خسرو جان اور اس کے حوالی وموالی سیر و تیغ کر دیئے گئے۔ اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کو مطلع حیات پر مصائب و آلام کے جو بادل چھا گئے تھے وہ یک بیک چھٹ گئے غازی ملک کے اس کارنامہ سے دہلی کے چھوٹے بڑے سب کو بڑی مسرت ہوئی اور انہوں نے حاضر ہو کر مبارک باد پیش کی دوسرے دن غازی ملک نے کوشک ہزار ستون میں اجلاس کیا۔ تمام بڑے بڑے امراء اور اعیان اور ارکان موجود تھے۔ امرا نے غیاث الدین کے بہادرانہ کارناموں کا شمار کر کے باصرار تمام کہا کر اب تخت شاہی پر جلوس کرنے کا حق آپ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ تغلق نے اس کے جواب میں ایک نہایت موثر تقریر کی، جس کا خلاصہ امیر خسرو کے بیان کے مطابق یہ ہے۔ "میرا تاج و تخت میرا تیر و کمان ہے۔ خسرو لجان کے انسانیت سوز مظالم کو سن کر دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہو گئی اور مجھے اپنی زندگی پر شرم آنے لگی میں نے اسی وقت تین باتوں کا عزم صمیم کر لیا۔ ایک یہ کہ دین اسلام کو اس کفر زار میں دوبارہ زندہ کروں۔ دوسرے یہ کہ اس سرزمین کو اس کمینہ اور بد ذات پند و بچہ کے ہاتھ سے چھین کر ان شہزادوں کو مراتب سلطنت پر متمکن کر دوں جو اس کے اہل ہیں۔ اور تیسرا عزم یہ تھا کہ جن بدبختوں اور نمک حراموں نے نسل شاہی کو اس بے رحمی سے برباد کیا ہے انہیں کیفر کردار کو پہنچا دوں۔ یہ تینوں ارادے محض خدا کی رضا جوئی کے لیے تھے۔ اور خدا کا بڑا فضل و کرم ہے کہ میری مضبوط ہمت نے ان تینوں عزائم کو پورا کیا۔ میں تخت شاہی کا بھوکا نہیں ہوں اور سوائے دینی جہاد کے تلوار نہ کھینچوں گا۔ اب اگر نسل شاہی میں سے کوئی شخص بھی زندہ ہے تو یہ تخت اسی کے نام لکھا جائے۔ اور اگر ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا ہے تو یہاں اور بہت سے بڑے بڑے امیر موجود ہیں۔ مجھے اپنا گھوڑا اور دیپالپور

Marfat.com

کا ویرانہ سب سے زیادہ پسند ہے۔

اس تقریر کے بعد اکابر ملک نے تغلق کے پاؤں چومے اور بڑے اصرار سے کہا بادشاہی آپ کے لئے ہے تغلق نے پھر انکار کیا۔ آخر بڑے ردوکد کے بعد اس نے بادشاہ ہونا منظور کر لیا۔ چنانچہ یکم شعبان ۷۲۰ھ کو صبح کے وقت تخت شاہی پر جلوس کیا اور سلطان غیاث الدین شاہی خطاب قرار پایا۔

تخت نشین ہونے کے بعد خسرو خان کے نامی گرامی اعوان و انصار کو سپرد تیغ کیا اور خاص خسرو خان کے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ قصر ہزار ستون میں ٹھیک اس جگہ پر جہاں اس بدبخت نے اپنے آقا و مولی نعمت کو قتل کرایا تھا۔ اس کو بھی قتل کرایا اور اسی طرح اس کا سر کاٹ کر نیچے پھنکوا دیا[۱]

اصلاحات

ان فتنہ پردازوں کا قلع قمع کرنے کے بعد وہ ملک کے اصلاحی اور انتظامی امور کی طرف متوجہ ہوا۔ تو بقول نظام الدین احمد بخشی کے جو کام دوسروں سے سالہا سال میں انجام پذیر ہو سکتے تھے۔ وہ اس نے ایک ہفتہ میں انجام دے دیئے[۲] اپنی رعایا میں جس شخص کو پریشان حال دیکھتا اس کا حال پوچھتا اور اس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جو امر خلق کی تکلیف کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس سے احتراز کرتا۔ اور جو شخص مخلص نظر آتا اس کی حوصلہ افزائی کرتا۔

غیاث الدین تغلق نے اور امور کے ساتھ ملک کے نظام مالی کی بھی اصلاح کی۔ اس میں اس نے میانہ روی کو ملحوظ رکھا تھا۔ اگر کوئی سرکاری گماشتہ مقررہ محصول سے زیادہ وصول کر لیتا تو اسے الزام ثابت ہو جانے کے بعد سخت سزا دی جاتی تھی۔ خسرو خان نے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے خزانہ شاہی کو بے دریغ لٹایا تھا۔ اس خزانہ کی رقوم جس جس کے پاس تھیں اور بادشاہ کو اس کا علم ہو گیا۔ انہیں واپس لے لیا اور روپیہ کو خزانہ میں داخل کر دیا۔

اس نے خراج کے اصول از سر نو منضبط کیے اور پیداوار کے دسویں یا گیارہویں حصہ سے زیادہ محصول لینے کی سخت ممانعت کر دی اس کی کوشش یہ تھی کہ ہر سال رقبہ زراعت بڑھتا جائے اور مقدم و چودھری کاشت کاروں پر جبر نہ کر سکیں۔ جن امراء و ملوک کے پاس جاگیریں تھیں ان کی انتظامی حالت کی بھی نگرانی کرتا اور جبر و تشدد پر سخت باز پرس کرتا۔

---

[۱] مثنوی تغلق نامہ ص ۱۵۱ [۲] طبقات اکبری ج ۱ صد ۱۹۱

Marfat.com

مالیات کے وصول کرنے میں بھی وہ نہایت نرمی سے کام لیتا لاکھوں کے مطالبہ میں اگر ہزاروں بھی وصول ہو جاتے تو غنیمت سمجھتا اور حد درجہ نرمی و آشتی سے کام لے کر معاملات کو طے کرتا وہ نہ معمولی باتوں پر کسی کو حد سے زیادہ انعام دیتا اور نہ ضرورت سے زیادہ سختی عمل میں لاتا۔

اس نے نہریں کثرت سے کھدوائیں باغات تعمیر کرائے، ویرانوں کو آباد کیا۔ بنجر زمین کو تردد سے قابل کاشت کیا اور متعدد عمارات قائم کرادیں۔ حصار تغلق آباد اس بادشاہ کی یادگار ہے۔

فتوحات

فتوحات کے لحاظ سے بھی اس کا عہد کامیاب ثابت ہوا اور بنگال و دکن کی طرف عساکر سلطانی نے کافی کامیابیاں حاصل کیں ۷۲۱ھ میں تلنگانہ اور ورنگل کے راجہ نے خراج دینے سے تامل کیا تو غیاث الدین نے اپنے بیٹے جونا خان کو (جسے اب الغ خان کا خطاب عطا ہو گیا تھا) اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور ہر چند ایک بار مفسدین کے اغوا سے لشکر میں برہمی پیدا ہو گئی لیکن دوسری بار کامیابی حاصل ہوئی، ورنگل فتح ہوا۔ اور اس کا نام سلطان محمد رکھا گیا اسی طرح جب ۷۲۴ھ میں لکھنوتی (بنگال) اور ستار گاؤں (ڈھاکہ) کی طرف سے جبر و ظلم کی شکایات موصول ہوئیں تو غیاث الدین نے اپنے بیٹے کو ورنگل سے طلب کر کے دار السلطنت کا انتظام سپرد کیا اور خود لشکر عظیم لے کر لکھنوتی کی طرف کوچ کیا۔ غیاث الدین کی سطوت و جبروت سے اس وقت سارا ہندوستان آگاہ تھا۔ اس لئے ناصر الدین فرمانروائے لکھنوتی تحائف وغیرہ لے کر خود حاضر ہوا اور بہادر شاہ کو جو ستار گاؤں کا فرمانروا تھا اور بہت متکبر و مغرور ہو گیا تھا۔ گرفتار کر کے حضور میں پیش کیا۔ سلطان غیاث الدین نے ازراہ لطف و عنایت ناصر الدین کو "چتر و دورباش" عنایت کر کے نہ صرف لکھنوتی کا فرمانروا تسلیم کیا بلکہ ستار گاؤں کو بھی اس کے سپرد کر دیا اور قلعہ ترہٹ فتح کرتا ہوا۔ دار الحکومت کی طرف واپس آیا اور ایک اتفاقی حادثہ سے مر گیا۔

جونا خان نے تین دن میں ایک قصر تعمیر کرایا۔ اس میں بادشاہ نے قیام کیا بجلی کی کڑک سے وہ گر گیا۔

غیاث الدین کا زمانہ حکومت صرف چار سال اور چند ماہ رہا۔ ۷۲۵ھ میں اس نے انتقال کیا اور الغ خان کو اپنا جانشین چھوڑ گیا۔

Marfat.com

س :۔ محمد بن تغلق اپنے اعلیٰ تخیل اور بلند افکار کے باوجود اپنے منصوبوں میں ناکام رہا" آپ کو اس سے کہاں تک اتفاق ہے۔

سلطان محمد بن تغلق نے اپنے ستائیس سالہ دور حکومت میں ملکی انتظام کو بہتر بنانے کے لئے بعض مشکلات پر قابو پانے کے لئے چند ایسے اقدام کئے جو نظریئے اور تجربے کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئے اور انوکھے تھے اور جو اس لئے ناکام ہوئے کہ ان کی بنیاد غلط تھی بلکہ اس لئے ناکام ہوئے کہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہ تو موثر انتظامیہ مشینری موجود تھی۔ اور نہ ہی بادشاہ کے اپنے کردار میں مستقل مزاجی اور استقلال موجود تھا۔ محمد بن تغلق بلاشبہ ایک بلند تخیل کا مالک تھا۔ اور اس کے ذہن نے ایسے منصوبے اختراع کئے جن کی افادیت جدید دور میں تسلیم کر لی گئی ہے۔ لیکن اس دور کے تقاضے اور تھے۔

اسباب ناکامی

جس وقت غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوا تو خزانہ شاہی معمور تھا۔ اور سلطنت کی حالت نہایت اچھی تھی لیکن اس میں کلام نہیں کہ محمد تغلق کے عزائم اور جذبات بذل و سخا کو دیکھتے ہوئے خزانہ اور حکومت کی تمام موجودات بہت کم تھی۔ محمد تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی جو نصب العین مقرر کیا وہ یہ تھا کہ ساری دنیا اس کے قبضہ میں چلی آئے اور لوگوں کو اتنی دولت تقسیم کر دے کہ کوئی شخص محتاج وغریب نہ رہے، چنانچہ اس نے بیدریغ دولت لٹانی شروع کر دی۔ اور تسخیر ایران وچین کے لئے کثیر افواج فراہم کر کے اور بھی خزانہ کو خالی کر دیا۔ چونکہ روپیہ برابر صرف ہو رہا تھا اور آمدنی کم تھی۔ اس نے محمد تغلق نے اس کے لئے دو تدبیریں اختیار کیں ایک یہ کہ دوآبہ کے خراج میں ۴، ۵ فیصد اور اضافہ کر دیا اور خراج سے رعایا سخت بددل ہو گئی اور کاشت کاروں نے کاشت چھوڑ دی۔ بادشاہ نے سختی سے خراج وصول کرنے کا حکم دیا۔ عمّال نے تشدد سے کام لے کر خراج وصول کرنا شروع کر دیا اور رعایا بھاگ نکلی۔ گاؤں ویران ہو گئے۔ زراعت بالکل مسدود ہو گئی، سارا ملک تباہ ہو گیا اس وقت نہایت سخت قحط پڑ گیا۔ جس نے ان تباہیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ ہر چند محمد تغلق نے انسداد گرانی کے لئے پوری کوشش کی اور شاہی ذخیرہ سے لوگوں کو غلہ تقسیم کیا۔ ان تدابیر سے مصیبت دور نہیں ہو سکی۔ چنانچہ خراج کی تدبیر سخت ناکام ثابت ہوئی۔ پھر سلطان نے اس امر کی کوشش کی کہ ویران گاؤں آباد ہو جائیں۔ کاشت کی حالت بہتر ہو جائے اور اس کے لئے اس نے خزانہ شاہی

Marfat.com

سے لاکھ تنکہ بطور تقاوی کے رعایا کو تقسیم کیا، لیکن کارکنوں نے بہت کچھ اس میں سے خود غصب کر لیا تھوڑا بہت جو رعایا کو ملا بھی اس میں سے ہزاروں حصہ بھی خزانہ میں نہ آ سکا۔ اب چونکہ خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا اور روپیہ کی ضرورت شدید تھی۔ اس لئے سلطان نے خیال کیا کہ اس کی قیمت بڑھا دینی چاہیے اور اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر اس نے تانبہ کا سکہ بجائے طلائی سکے کے جاری کیا اس تدبیر نے اور زیادہ نقصان پہنچایا۔ چونکہ دارالضرب میں سکہ ڈھالنے کا کوئی ایسا مخصوص طریقہ نہ تھا۔ کہ عام طور سے لوگ اس کی نقل کر سکیں۔ اس لئے تمام ملک میں گھر گھر خفیہ ٹکسالیں قائم ہو گئیں۔ اور لوگوں نے کروڑوں سکے تانبہ کے بنا کر بازار میں سونے چاندی کے ہم وزن سکوں سے بدلنا شروع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تاجر زمیندار گاؤں کے مکھیا اور ہندو راجہ دولت مند ہو گئے اور خزانہ شاہی خالی ہونے لگا۔ آخرکار سلطان نے غلطی کو تسلیم کیا اور مجبوراً اس سکے کے رواج کو بھی مسدود کرنا پڑا اس سے انکار نہیں سلطان خود رائے تھا اور طبیعت میں سختی تھی بلا مشورہ کے جو کام کئے اس کا ہی یہ نتیجہ تھا۔ جو رونما ہوا۔

جب سلطان کو اپنی تدابیر میں ناکامیابی ہوئی تو مطلق العنان بادشاہ کی طرح وہ سخت غضبناک ہو گیا۔ اور بات بات پر قتل کرا دیا۔ اس کے دربار کا معمولی منظر ہو گیا۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے اس کے دربار کا ذکر کرتے کرتے لکھا ہے کہ اگر شاہی قصر کے کسی دروازہ پر بارش انعام ہوتی ہو گی تو دوسرے دروازے پر تم کسی لاش کو بھی ضرور پھڑکتے ہوئے دیکھو گے۔ پھر چونکہ محمد تغلق کی یہ برہمی ناکامی کے ساتھ روزانہ بڑھتی جا رہی تھی اور تمام رعایا اس سے متاثر ہو رہی تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ اس کی طرف سے بددلی عام ہو گئی اور اس کے تمام امراو اراکین میں بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

نیا دارالحکومت

دہلی سے پایہ تخت کو دیوگیر (دولت آباد) قائم کرنا بجائے خود ایک عمدہ تجویز تھی۔ کیونکہ دیوگیر درمیان میں واقع تھا۔ اور یہاں سے مختلف صوبوں پر اقتدار آسانی سے قائم رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ حکم تھا کہ تین دن کے اندر دہلی کی تمام آبادی مع اپنے اسباب کے دیوگیر منتقل ہو جائے اور ایک متنفس بھی یہاں باقی نہ رہے۔ یہ جابرانہ حکم تھا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں اور اسباب امراء اراکین کی بددلی کے تھے ان میں سے یہ بھی

Marfat.com

ایک قوی سبب تھا۔

بغاوتیں

یہاں ایک امر اور قابل غور ہے کہ جن صوبوں نے اس کے عہد میں بغاوت کی ان میں سے اکثر وہی تھے جو اس کے مقرر کئے ہوئے تھے پھر جو انہوں نے بغاوت کرکے خودسری اختیار کی تو اس کی وجہ کچھ اور بھی تھی وہ یہ کہ غلام خاندان کے زمانہ میں صوبہ کے گورنر جاگیر دار ہوتے تھے اور چونکہ وہ خود بھی اپنے بادشاہوں کی طرح ترک نژاد تھے۔ اس لئے سلطنت کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جب ان ترک فرمانرواؤں کے بعد خلجیوں کا دور شروع ہوا تو ان سے نظام میں کچھ تغیر پیدا ہوا لیکن نہ اس قدر کیونکہ خلجی سلطنت کے زمانہ میں صوبوں کے گورنر پھر بھی مرکزی حکومت سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب عہد تغلق شروع ہوا تو یہ تعلقات بالکل خراب ہو گئے اور صوبوں کی حکومت اجنبی سرداروں (ایرانیوں، خراسانیوں، تغلقوں اور افغانوں) کے سپرد کی گئی جو بادشاہ سے نہ خون کا تعلق رکھتے تھے نہ قومیت کا بادشاہ جس قدر ان پر انعامات کی بارش کرتا جاتا تھا ان کی طمع بڑھتی جاتی تھی اور یہ خود اپنی خود مختار سلطنتیں قائم کر لینی چاہتے تھے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ محمد تغلق کی وسیع سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو گئی ہر چند ان بغاوتوں کے فرو کرتے ہی بادشاہ نے پوری کوشش کی۔ اور وہ کامیاب بھی ہوا لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہر جگہ نہ پہنچ سکتا تھا اور وہاں حالت یہ تھی کہ آج ملتان باغی ہوا تو کل بنگال، پرسوں لاہور میں فتنہ اٹھا اس وقت اودھ کی بغاوت کی خبر ملی تو دوسرے وقت گجرات کی، بادشاہ کہاں کہاں پہنچ سکتا تھا۔ نتیجہ ہوا کہ بعض صوبے جن میں بنگال اور دکن بھی شامل تھے۔ بالکل خود مختار ہو گئے اور پھر کبھی تعلق سلطنت میں شامل نہ ہو سکے[1]

---

[1] ملخص اسلامی ہند

Marfat.com

س ۵:۔ سلطان محمد بن تغلق کی شخصیت اور کردار کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیجئے۔

سلطان محمد بن تغلق کی شخصیت مورخین کے لئے ایک عجیب وغریب معمہ اور پہیلی رہی ہے وہ نہایت بیدار مغز مدبر، سیاست داں اور جری تھا۔ ضیاالدین برنی لکھتا ہے ۔"جامۂ جہانبانی، قباء جہان داری بہ قد و قامت او دوختہ بود" پھر لکھتا ہے ۔

گویا اورنگ سلطنت اور تخت بادشاہی اسی کے لئے پیدا کیا گیا تھا[۱] سخاوت اور دریادلی کا یہ عالم تھا کہ ایک ادنیٰ فقیر کو شاہی خزانہ دے دیتا اور پھر بھی اس کو اپنا عطیہ کم معلوم ہوتا تھا سخاوت کے وقت اپنے پرائے فقیر اور امیر سب اس کی نظر میں یکساں ہوتے تھے۔[۲]

نظام الدین احمد بخشی کا بیان ہے کہ فاضل اور اہل ہنر میں سے جو کوئی اس کی بارگاہ کا رخ کرتا تھا۔ طرح طرح کے انعامات و اکرامات سے سرفراز ہوتا۔ اور خراساں و عراق و ماوراء النہر اور دوسرے اطراف و اکناف عالم سے جو کوئی اس کے دامنِ کرم میں پناہ لیتا، دربار شاہی کی طرف سے اس پر اس قدر احسانات کئے جاتے تو پھر عمر بھر اسے کسی چیز کی طلب اور احتیاج باقی نہیں رہتی تھی[۳] ذہانت اور طباعی کی یہ شان تھی کہ ایک شخص کو دیکھ کر پہلی نظر میں ہی اس کی اچھائیاں اور برائیاں بتا دیتا اور قبل اس کے کہ یہ کچھ کہے وہ اس کے دل کی بات سے آگاہ ہو جاتا تھا[۴] پھر وہ علم تاریخ کا بڑا ماہر تھا۔ حافظہ اس قدر قوی اور مضبوط تھا کہ جو بات ایک مرتبہ سن لیتا عمر بھر نہ بھولتا، تاریخ کے علاوہ فلسفہ اور منقولات کے تمام علوم سے عموماً اور طب حکمت نجوم ریاضی اور منطق سے خصوصاً بڑی دلچسپی تھی۔ اور ان علوم کا وہ اچھا ماہر تھا۔ فلسفہ کا شوق اس قدر تھا کہ حکومت کے زمانہ میں بھی اس کے اوقات کا اکثر حصہ منقولات کی کتابوں کے مطالعہ میں ہی صرف ہوتا تھا۔ اس کی تقریر بھی بے حد فصیح اور کلام شیریں تھا۔ عربی اور فارسی کے خطوط اور مراسلے فی البدیہہ ایسے قابلانہ لکھتا تھا کہ بڑے بڑے ادیب اور انشاء پرداز انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ اس کا خط بھی نہایت پاکیزہ اور عمدہ تھا۔ نامی گرامی خوشنویس اس کا لوہا مانتے تھے[۵]

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵

۲؎ تاریخ فرشتہ اردو ترجمہ ج ۲ ص ۹

۳؎ طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۹۹

۴؎ طبقات اکبری جلد ۱ ص ۲۰۰

۵؎ تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۱۰

Marfat.com

ان علمی اور دماغی کمالات کے ساتھ ذہنی شغف اور انہماک اور مذہب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ نماز روزہ کے علاوہ مستحبات و نوافل اور وظائف و اوراد تک کا اہتمام اور ان کی پابندی کرتا اور ممنوع اور نشہ آور چیزوں سے اور اس فعل سے کہ جس پر معصیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ پرہیز کرتا تھا[1] رعایا سے بھی اس طرح احکام شرع کی پابندی کراتا تھا۔ اس نے نماز کی تاکید اس حد تک کر رکھی تھی کہ ابن بطوطہ کا بیان ہے" سلطان کا حکم تھا جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو اس کام پر مقرر کیا کہ جو شخص جماعت کے وقت بازار میں ملے اس کو پکڑ لائیں۔ سلطان کا حکم تھا کہ ہر شخص نماز اور اسلام کے احکام سیکھے، چنانچہ لوگ بازاروں میں نماز کے مسائل سیکھتے پھرتے۔ اور انہیں کاغذوں پر لکھواتے تھے[2] حکم شاہی کا یہ اثر ہوا کہ ڈوم ڈھاری عورتیں تک نماز کی پابند ہوگئیں۔ ابن بطوطہ نے امیر سیف الدین کی شادی کے حالات میں لکھا ہے" میں نے وہاں دیکھا اذان ہوتے ہی ہر ایک ڈوم وضو کر کے نماز پڑھنے لگا۔

نماز روزہ کی پابندی کے علاوہ سلطان عام سیاسی اور ملکی معاملات میں بھی احکام شرع کا احترام کرتا اور ان کا پاس ادب اس حد تک ملحوظ رکھتا تھا کہ کسی شخص کو قتل کرنے سے پہلے اس کے جواز کا فتویٰ علماء سے لیتا اور اس سلسلہ میں لبا اوقات ان سے مباحثہ اور مناظرہ کرتا تھا۔ اس نے علما سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کسے بناحق کشتہ شود فرو گذاشت از شما خواہد بود و خونِ آں کس برگردن شما ست"[3] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں نے سلطان محمد بن تغلق سے زیادہ منصف اور عادل گستر کوئی نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ ایک ہندو امیر نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کے بھائی کو بلاوجہ مار ڈالا ہے۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے قاضی کے سامنے عام ملزموں کی طرح حاضر ہوا۔ اور قاضی کو سلام کیا اور تعظیم بجا لایا۔ پہلے سے حکم تھا کہ بادشاہ عدالت میں حاضر ہو تو قاضی اس کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہوا۔ مقدمہ سنایا گیا۔ آخر قاضی نے فیصلہ کیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے۔ اسے چاہیئے کہ مدعی یعنی ہندو امیر راضی کرے ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔ چنانچہ سلطان نے امیر کو رضا مند کر لیا اور قاضی نے اسے بری کر دیا۔

---

[1] طبقات اکبری ص ۱۹۹ [2] سفر نامہ ابن بطوطہ جلد ۲ صہ ۱۳۱

[3] منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی۔

Marfat.com

علاوہ ازیں اس کی ہمت اور عالی حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ فرشتہ اور ملا نظام الدین احمد بخشی کے قول کے مطابق ہفت تعلیم کی بادشاہت بھی اس کے لئے بساط شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ ۷۳۸ھ[1] میں اس نے ایک لاکھ کا لشکر جرار اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں چین فتح کرنے کے لئے آسام کے راستہ سے روانہ کیا اس کے علاوہ ایران فتح کرنے کے لئے بھی اس نے ایک فوج بھیجی تھی، لیکن یہ دونوں مہم ناکام رہیں۔ ان صفات وکمالات اور خوبیوں کی وجہ سے قلیل مدت میں ہی اس نے وہ تمام صوبے جن کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ان کو منظم اور مضبوط کرلیا۔ مال گذاری کا نظم بہتر ہوگیا۔

یہ امر خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس درجہ عمدہ مالی بندوبست مضبوط انتظام مال گذاری اور سخاوت وفیاضی کے باوجود سلطان اس بات کا بھی خیال رکھتا تھا کہ خزانہ میں کوئی پیسہ ناجائز ذریعہ سے نہ آئے۔ چنانچہ ابن بطوطہ کا بیان ہے۔ ۷۴۱ھ میں بادشاہ نے حکم دیا کہ سوائے زکوۃ اور عشر کے اور سب محصول اور ڈنڈ معاف کر دیئے جائیں[2]۔

داد رسانی اور عدل وانصاف کے لئے ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات کو دیوان خانہ کے سامنے ایک سراں میں بیٹھتا تھا اور اس روز اس کے سامنے فقط امیر حاجب، خاص حاجب، سید الحجاب اور شرف الحجاب چار شخص ہوتے تھے۔ اور سب کو عام اجازت تھی کہ جس کسی کو جو شکایت ہو۔ وہ ان چاروں میں سے کسی کے پاس جا کر اس شکایت کو قلمبند کر دے جب یہ سب شکایتیں قلمبند ہو جاتیں۔ تو بادشاہ عشا کے بعد خود ان کا مطالعہ کرتا تھا اور اگر اس کو یہ پتہ چلتا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے مستغیث کی شکایت قلم بند کرنے میں تساہل اور سہل انگاری سے کام لیا ہے تو وہ اس پر سخت خفا اور ناراض ہوتا تھا[3]۔

استبداد اور تلون مزاجی

ان خوبیوں اور کمالات اور اوصاف کے باوجود سلطان محمد بن تغلق انتہا درجہ کا مستبد تشدد پسند اور متلون المزاج تھا۔ اسی باعث اس کی شخصیت مورخین کے لئے ایک عجیب وغریب معمہ رہی ہے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۹   [2] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۲۱

[3] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ صفحہ ۱۲۱

Marfat.com

اس کی تلون المزاجی اور استبداد کا سب سے زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز کارنامہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دفعتہً اسے یہ خیال آیا کہ سارا ہندوستان دہلی کی سلطنت کا حاشیہ بردار ہو چکا ہے۔ اس بنا پر مناسب یہ ہے کہ پایۂ خلافت کوئی ایسا مقام مقرر کیا جاتے۔ جسے ممالک محروسہ کے تمام شہروں سے وہی نسبت ہو جو مرکز کو دائرہ کے خطوط سے ہوتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر کچھ لوگوں نے اجین کا نام لیا۔ مگر بادشاہ کو آب و ہوا کے لحاظ سے دیوگڑھ زیادہ پسند تھا۔ اس لئے اس نے حکم دے دیا کہ تمام اہالیان دہلی بغیر کسی استثناء کے دیوگڑھ میں آباد ہوں، حکم حاکم مرگ مفاجات دہلی بالکل ویران اور اجاڑ ہو گئی۔ انسانوں کی بجائے درندوں وحشی جانوروں کا مسکن بن گئی ادھر دیوگڑھ دولت آباد کے جدید نام سے آباد ہو کر ایک نہایت عالی شان پرشکوہ اور بارونق شہر بن گیا۔ فرشتہ کا بیان ہے،، پایۂ خلافت کے اس تغیر و تبدل سے رعایا کے حالات میں بھی ایک عظیم الشان تغیر و مہمات سلطنت میں ابتری پیدا ہو گئی۔ پھر جو کچھ عرصہ بعد پنجاب اور ملتان میں گڑبڑ ہوئی اور سلطان اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے خود ادھر آیا تو اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے دولت آباد میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص بھی دہلی جانا چاہے۔ وہ جا سکتا ہے۔ اس اعلان کے بعد بہت سے لوگ بصد ہزار وقت دہلی آگئے اور یہ شہر پھر آباد ہو گیا۔ عام مورخین نے اس واقعہ کو محمد بن تغلق کی تلون المزاجی اور بعض بعض نے اس کو دیوانہ پن سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے زمانہ میں دہلی اور اس کے اعتراف میں ایک مرتبہ قحط اس قدر شدید پڑا کہ سترہ روپے کو ایک سیر غلہ میسر نہیں آتا تھا۔ اور ملک کے چوپائے اور لوگ بھوک سے فنا ہو گئے تھے۔ سلطان نے اس صورت حال کی تلافی کرنی چاہی اور کسانوں کاشت کاروں کے ساتھ تھوڑی بہت مراعات بھی کیں، لیکن اس کا جبلی جبر و تشدد پھر بھی کم نہ ہوا۔ مورخ فرشتہ اس خاص زمانہ کے حالات لکھتے ہوئے کہتا ہے، پایۂ خلافت اور اس کے گرد و نواح میں حقیقی اور مجازی خداؤں کے قہر و غضب کی تلواریں نیام سے باہر نکلی ہوئی تھیں [1] بڑی بڑی فوجی معرکہ آرائیوں اور دوسرے اسباب کے باعث خزانہ خالی ہو چلا تھا۔ اس کو پر کرنے کے لئے ایک طرف تو اس نے زمین کا لگان عام لوگوں اور خصوصاً ہندوؤں پر اس قدر لگا دیا کہ تنگ آکر بہت سے لوگ اپنے گھروں، مویشیوں اور کھیتوں کو آگ لگا کر جنگلوں میں جا بسے اور دوسری جانب اس نے تانبے کے سکے رائج کر دیئے جن کو بیرونی ممالک کے سوداگروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت رک گئی بازار

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۲

Marfat.com

سرد اور کاروبار تباہ و برباد ہو گئے۔ اور گداگری عام ہو گئی لہ

اس عام بدنظمی ابتری اضطراب و بے اطمینانی کا ملک کی سیاست اور اس کے نظم و نسق پر بہت برا اثر ہوا، کئی صوبے دہلی کی مرکزیت سے الگ ہو گئے۔ علی الخصوص جنوبی ہند کے بعض علاقے تو ایسے آزاد ہوئے کہ پھر مسلمانوں کو ان کا فتح کرنا نصیب نہ ہوا۔

جہاں تک وقت کے مشائخ وصوفیائے کرام کا تعلق ہے۔ سلطان کا رویہ ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں تھا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق سلطان یہ چاہتا تھا کہ ان مشائخ اور علمائے کرام سے جن میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت نصرالدین چراغ دہلوی کی تھی۔ اپنے بعض نجی کام لے حضرت چراغ دہلوی نے اس سے انکار کر دیا تو اس نے انہیں قید کر دیا۔

عہد حاضر کے بعض مورخین نے سلطان کے دامن سے اس دھبہ کو دھونے کی سعی کی ہے۔ لیکن بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان کا مذہبی تعصب، تشدد پسندی اور مزاج کی انانیت اور اس کا دماغی عدم توازن یہی چند چیزیں ہیں، جو اس کے زوال کا سبب بنیں۔ بادشاہ کو ملک کے حالات کی ابتری اور روز بروز ان کے بگڑتے جانے کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ اس نے ضیاء الدین برنی سے جو اس عہد کا مشہور مورخ تھے کہا میری سلطنت کے ہر عضو مختلف امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک کا علاج کرتا ہوں تو دوسری بیماری بڑھتی ہے۔ تم نے چونکہ تاریخ کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے برنی کہتے ہیں "میں نے جواب دیا اگر کسی بادشاہ سے اس کی رعایا نفرت کرنے لگے اور ملک میں فساد کی آگ بھڑک اٹھے تو مناسب یہی ہے کہ بادشاہ اپنے بھائی بیٹے کو اپنا جانشین بنا کر خلوت گزین ہو جائے۔ اور اگر تخت سلطنت چھوڑنا گوارا نہ ہو تو ان باتوں سے پرہیز کرے، جن سے رعایا کی نفرت میں روز بروز اضافہ ہو" سلطان نے جواب دیا "میرا نہ کوئی فرزند ہے جو میرا قائم مقام ہو سکے اور نہ میں سیاست سے کنارہ کش ہو سکتا ہوں۔ اب جو کچھ ہونا ہے مجھے اس کی پروا نہیں"

لہ طبقات اکبری

Marfat.com

س : سلطان محمد بن تغلق کے عہد کی بغاوتوں کا حال تحریر کریں۔ وہ ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا۔

بغاوتیں

معبر ۱۳۳۵ء سلطان محمد بن تغلق کے منصوبوں کی ناکامیابی سے لازماً ایسے حالات پیدا ہو گئے جن سے عوام کی زندگی میں انتشار کے اثرات نظر آتے گئے۔ حکومت کا خزانہ بھی متاثر ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے اس کی ساکھ میں بھی کمی آ گئی تھی۔ حکومت کی پالیسیوں کے علاوہ خشک سالی کی وجہ سے قحط بھی شروع ہو گیا تھا۔ بعض علاقوں کے حاکموں اور سرداروں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بغاوتیں شروع کر دیں۔ اندرونی بغاوتیں اتنی تعداد میں اور اتنے وسیع رقبہ میں کسی سلطان کے زمانہ میں نہیں ہوئیں۔ جس قدر کہ محمد بن تغلق کے عہد حکمرانی میں ہوئیں۔ سلطان نے ان کا مقابلہ کرنے میں انتہائی دلیری اور استقلال سے کام لیا لیکن پھر بھی بعض علاقوں میں وہ کامیاب ہوئیں اور سلطنت دہلی سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۔ ۱۳۳۵ء میں معبر میں جلال الدین احسن شاہ نے علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان یہ خبر پاتے ہی ایک فوج ہمراہ لے کر اس کے خلاف روانہ ہوا۔ لیکن جب وہ تلنگا کے علاقہ میں پہنچا تو لشکر میں ہیضہ وبائی شکل میں شروع ہو گیا اور وہ واپسی پر مجبور ہو گیا۔ احسن شاہ کو اس طرح خود مختار ہونے کا موقع مل گیا۔

۲۔ عین الملک کی بغاوت ۱۳۴۰ء عین الملک جو سلطنت دہلی کے اعلیٰ ترین امراء میں سے تھا۔ اس وقت اودھ اور ظفر آباد کے علاقوں کی حکومت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ صرف بااثر امیر ہی نہیں تھا۔ بلکہ سلطان سے اس کے ذاتی تعلقات بھی نہایت خوشگوار تھے۔ اس زمانہ میں سلطان گنگا دریا کے کنارے مقیم تھا کہ دہلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں قحط پڑا۔ اس کی تکلیف کم کرنے کی غرض سے محمد بن تغلق نے یہ عجیب تدبیر کی کہ اپنا دارالحکومت عارضی طور پر دہلی کے بجائے گنگا کے کنارے بنایا یہاں نہایت عجلت سے چھپروں کے بہت سے مکانات بنائے گئے۔ اور بادشاہ کے سپاہی اور عمال ان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اس مقام کو سلطان سورگ دوار (جنت کا دروازہ) کہتا تھا۔ قحط کے مسئلہ کو حل کرنے کا یہ نیا طریقہ دلچسپ بھی تھا اور کامیاب بھی ثابت ہوا۔ ان علاقوں سے دہلی تک غلہ لے جانے میں بہت وقت لگتا تھا۔ اس کا علاج سلطان نے یہ کیا کہ اپنی فوج اور عمال کا بڑا حصہ ساتھ لے گیا۔ اور اس علاقہ میں مقیم ہو گیا۔ یہاں عین الملک نے غلہ بھیجنے کی بہت

Marfat.com

کوشش کی ۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق وہ روزانہ پچاس ہزار من گیہوں، چاول اور دوسری جنس بھیجتا تھا۔ لیکن کچھ لوگوں کے بہکانے پر اس نے بغاوت کی۔ سبب یہ بتلایا گیا ہے اس نے کچھ باغیوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ سلطان کو اس سے شبہات پیدا ہوئے اور اس نے حکم جاری کیا کہ وہ دولت آباد چلا جائے۔ عین الملک نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی اور علم بغاوت بلند کیا۔ اس سے حالات بہت نازک ہو گئے کیونکہ عین الملک کے پاس کافی فوج تھی مگر محمد بن تغلق نے بہت جلد اپنی فوج کو مرتب کیا اور قنوج پر قبضہ کر لیا۔ رات کو عین الملک کی باغی فوج نے حملہ کیا۔ لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ سلطان نے اس کو معاف کر کے قید کر دیا۔ اس کے بعد سلطان کا کیمپ دہلی واپس آ گیا۔ کیونکہ اب وہاں حالات بہتر تھے۔

اس کے ایک سال بعد سلطان کو سندھ کے علاقہ میں رہزنی کے استیصال کی غرض سے جانا پڑا اس میں اس کو کامیابی ہوئی اور وہاں جلدی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ لوگ امن کی زندگی بسر کرنے لگے۔

دکن بنگال اور گجرات

۱۳۳۶ء میں دو ہندو بھائیوں ہری ہر اور بکا رائے نے ایک ہندو ریاست وجے نگر کی بنیاد ڈالی اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنگال میں حاکم لکھنوتی کے افسر فخر الدین نے اُن کو قتل کر کے اپنے خود مختار حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔ سلطان محمد بن تغلق کو اس کا موقع نہ ملا کہ وہ بنگال جا کر اس بغاوت کو فرو کرتا۔ چنانچہ اس وقت سے بنگال میں ایک علیحدہ سلطنت قائم ہو گئی۔

بغاوتوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۳۴۷ء میں اس عہد کی عظیم ترین بغاوت شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں بہمنی سلطنت وجود میں آئی۔ ۱۳۴۴ء میں ورنگل بھی سلطنت دہلی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اب جنوب میں صرف دیوگیر کا علاقہ باقی رہ گیا۔ یہاں کی آمدنی بہت کم ہو گئی۔ چنانچہ سلطان نے ارادہ کیا کہ ایسی اصلاحات کی جائیں، جن سے انتظام بہتر ہو جائے اور آمدنی میں اضافہ ہو اس سلسلہ میں اس نے قتلغ خان کو وہاں سے واپس بلا لیا اور نئے انتظامات کیے۔ مالوہ اور دھر کے علاقے عزیز خمار کے سپرد کیے۔ اور اس کو ہدایت کی کہ امیران صدہ کے زور کو توڑ دیا جائے کیونکہ ان کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ اور سلطان کو بجا طور پر یہ شبہ تھا کہ دکن میں بغاوت کی ذمہ داری

Marfat.com

ان ہی تھی۔ عزیز خمار نے ان لوگوں پر بہت سختی کی اور ان سب امیروں کو اپنے محل کے دروازے کے سامنے قتل کرا دیا۔ گجرات کے امیران صدہ نے سرکاری خزانہ کو جو دارالحکومت کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ لوٹ لیا۔ سلطان فوراً اس جگہ پہنچا اور وہاں کے حالات پر قابو پا لیا۔ ساتھ ہی اس نے دولت آباد کے حاکم نظام الدین کو ہدایت بھیجی کہ وہاں امیران صدہ کو فوراً سلطان کے کیمپ کی طرف روانہ کر دیئے۔ ان میں سے بعض نے یہ منظور کر لیا کہ وہ گجرات چلے جائیں گے۔ لیکن راستے میں انہوں نے بغاوت کی، سلطان کے افسروں کو قتل کرایا اور دولت آباد واپس آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے بغاوت کا اعلان کیا اور دولت آباد کے قلعہ پر قبضہ کر کے اپنی جماعت میں سے ایک سردار اسماعیل مخ افغان کو ناصر الدین کا لقب دے کر دکن کا بادشاہ بنایا۔ سلطان کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ فوراً گجرات سے دکن گیا۔ باغی امراء کو شکست دی اور دولت آباد کا محاصرہ کر لیا لیکن یہاں سے کچھ لوگ جان بچا کر گلبرگہ کی طرف بھاگ گئے۔ ان میں حسن گنگو بھی تھا۔ جو بعد میں بہمنی سلطنت کا بانی ہوا۔ دولت آباد کا محاصرہ ختم نہ ہوا تھا کہ خبر ملی کہ گجرات میں طغی کی سرکردگی میں بغاوت شروع ہو گئی ہے سلطان اس کو چھوڑ کر گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔ حسن گنگو نے سلطان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر دولت آباد پر قبضہ کر لیا۔ اسماعیل مخ جو ایک بوڑھا شخص تھا۔ حسن گنگو کے حق میں سلطنت سے دست بردار ہو گیا۔ چنانچہ ۳ اگست ۱۳۴۷ء کو وہ دولت آباد میں ابوالمظفر علاء الدین بہمن شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا اس طرح بہمنی سلطنت وجود میں آئی۔

سلطان کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ ہوا لیکن اس نے یہی طے کیا کہ پہلے گجرات کی بغاوت کو ختم کیا جائے، طغی کو کئی لڑائیوں میں شکست ہو چکی تھی اور بالآخر اس نے کاٹھیاواڑ میں پناہ لے لی۔ سلطان کی فوج اس کے لئے روانہ ہوئی طغی وہاں سے بھاگ کر سندھ چلا گیا۔ یہاں جام نے اس کو پناہ دی۔ اس پر سلطان محمد بن تغلق جام کو سزا دینے کی غرض سے ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا ابھی وہ منزل مقصود پر پہنچا بھی نہ تھا کہ اس کا بخار آیا اور برنی کے الفاظ میں "سلطان کو اس کے لوگوں سے اور لوگوں کو اس سے چھٹکارا مل گیا۔

س: سلطان فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی اور اس کی فوجی مہمات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ تفصیل سے بیان کیجئے۔

جب سلطان محمد مرض الموت میں مبتلا ہوا۔ تو فیروز شاہ نے اس کی بڑی خدمت کی اور اس

Marfat.com

نے وصیت کی کہ میرے بعد فیروز شاہ کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن جب سلطان محمد بن تغلق کی وفات کے بعد اس کی خواہش کے مطابق علمائے کرام مشائخ عظام اور دوسرے اعیان امرا نے متفق ہو کر فیروز شاہ سے تخت نشینی کی درخواست کی۔ تو اس نے کہا "میں حج و زیارت حرمین شریفین کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میرے علاوہ کسی اور کو اس منصب جلیل کے لئے منتخب کیا جائے۔" لیکن اس وقت ملک کے حالات بڑے ابتر تھے۔ دہلی میں اور دوسرے علاقوں میں مغلوں نے شورش پیدا کر رکھی تھی پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ سلطنت کے لئے فیروز شاہ تغلق سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی دوسرا شخص مل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس بناء پر سب علماء اور مشائخ نے جن میں حضرات شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور مخدوم زادہ عباسی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اور دوسرے خوانین و ملوک نے یک آواز ہو کر فیروز شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور امیر تاتار خان جو اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کا بازو پکڑا اور اس کو زبردستی تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ بادشاہ کی نیک طینتی پاک باطنی اور خدا ترسی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ زبردستی تخت سلطنت پر بٹھایا جانے لگا۔ تو اس نے کہا اچھا اگر یہ بار گراں تم میری گردن پر ڈالتے ہی ہو تو ذرا صبر کرو کہ میں وضو کر لوں، چنانچہ اس نے وضو کیا۔ دو رکعتیں نماز پڑھیں اور پھر دیر تک بارگاہ ایزدی میں سر بسجود رہ کر یہ دعا کرتا رہا کہ بارالہا! ممالک کا اطمینان اور رفاہیت اور عالم کا انتظام اور توفیق جہانداری انسان کے اندازہ وقوت سے باہر ہے نظام عالم کا انحصار تیرے حکم پر ہے خداوندا تو ہی میری قوت و پناہ ہے[1]

مہمات

بنگال کی مہمیں۔ چونکہ فیروز شاہ فطرۃً نرم مزاج تھا۔ اس لئے فتوحات کے لحاظ سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی تاہم اس کی فتوحات میں سے سب سے بڑی فتح یہی ہے۔ محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں جو طوائف الملوکی اور بدامنی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کے عہد میں مفقود ہو گئی اور سلطنت میں ہر طرف امن و سکون نظر آنے لگا۔ وہ جنگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں جنگی قابلیت تھی پر وہ کشت و خون سے گھبراتا تھا۔ رکن جہاں حسن گنگو نے اپنی خود مختاری حکومت

---

[1] تاریخ فیروز شاہی

Marfat.com

بہمنی سلطنت کے نام سے کوہ وندھیاچل کے جنوب تک قائم کرلی تھی۔ فیروز شاہ تغلق نے اس کو فتح کرنے کی بجائے آزادی تسلیم کرلی۔ بنگال کو البتہ بادل نخواستہ فتح کرنا چاہا لیکن کشت و خون کے خیال سے واپس لوٹ آیا۔

پہلی دفعہ جب ۱۳۵۳ء ۷۵۴ھ میں وہ بنگال کی طرف گیا تو گیارہ مہینہ تک واپس نہیں آیا اس مہم میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اور ایک لاکھ دس ہزار بنگالی افواج قتل کی گئی۔ جب فیروز شاہ کو معلوم ہوا کہ اس قدر جانیں ضائع گئی ہیں تو اس نے کیساڈلہ کے قلعہ کا محاصرہ (جہاں شاہ بنگال بھاگ کر پناہ گزیں ہو گیا تھا) چھوڑ دیا اور دہلی واپس آیا۔

اس کے بعد ۶۰-۱۳۵۹ء ۷۶۰ھ میں وہ پھر بنگال گیا اس وقت ستر ہزار سوار اور بے شمار پیدل فوج ساتھ تھی (۴۷۰ ہاتھی بھی ہمراہ تھے۔) لیکن اس مہم کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ صلح ہوگئی۔

جاج نگر

۱۳۶۰ء کو موسم برسات سلطان نے جونپور میں گزارا اور اس کے بعد جاج نگر (اڑلیسہ) کی طرف روانہ ہوا سلطانی فوج کے متعلق جب راجہ کو معلوم ہوا تو وہ بھاگ کر ایک جزیرہ میں چلا گیا۔ سلطان نے پوری پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کو معلوم ہوا کہ سلطان کا ارادہ اس کا پیچھا کرنے کا ہے تو وہ گھبرا گیا اور فوراً صلح کی درخواست کی۔ سلطان نے اس کو منظور کرلیا اور یہ طے ہوگیا کہ ہر سال راجہ خراج کے طور پر ایک مقررہ تعداد ہاتھیوں کی دہلی بھیجا کرے گا۔ واپسی میں سلطان فیروز اس علاقہ کی طرف گیا جہاں آج کل چھوٹا ناگپور واقع ہے یہاں اس کی فوج کے لوگ راستہ بھول گئے اور بہت سے آدمی تکالیف کی وجہ سے ہلاک ہوگئے بہت مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد جنگلات میں پھنسی ہوئی فوج باہر نکلی اور صحیح راستہ معلوم کرنے کے بعد دہلی واپس ہوئی اس کے بعد سلطان فیروز نگر کوٹ کی طرف گیا۔ یہ علاقہ محمد بن تغلق نے فتح کیا تھا۔ لیکن اس کے عہد کے آخر میں راجہ کو خود مختار ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ فیروز شاہ نے طے کیا کہ اس کو دوبارہ فتح کرے نگر کوٹ جاتے ہوئے راستہ میں جوالامکھی پہاڑ کے مشہور مندر کے قریب ٹھہرا، یہاں اس کو کچھ قدیم کتابیں دست یاب

Marfat.com

ہوئیں ان میں سے ایک کا فارسی نظم میں ترجمہ کرایا گیا۔ اس کا نام سلطان کے نام کی رعایت سے دلائل فیروز شاہی رکھا گیا۔ نگرکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور راجہ کو دہلی کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ وہ بھی دہلی کا باجگذار ہو گیا۔

فتح سندھ

فیروز شاہ کو یاد تھا کہ اس کی تخت نشینی کے وقت سندھی امرا کا برتاؤ حکومت کے خلاف باغیانہ تھا گویا کہ اس وقت سے یہ علاقہ بھی دہلی کے اقتدار سے باہر تھا۔ سلطان نے خیال کیا کہ حملہ کر کے اسکو فتح کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے نوے ہزار سوار ۴۸۰ ہاتھی لے کر بھکر کی طرف روانہ ہوا کچھ فوج ۵۰۰۰ ہزار کشتیوں کے ذریعہ دریائے سندھ کو عبور کر کے پہونچی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں قحط پڑ گیا اور سماء جام (فرمانروائے سندھ) کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ واپسی میں فیروز شاہ نے گجرات کا قصد کیا لیکن راستہ بتانے والوں نے دھوکہ دے کر کچھ کی دلدلوں میں پھنسا دیا۔ پھر ۶ ماہ تک بادشاہ کی کوئی خبر دہلی نہیں پہنچ سکی۔ اس مصیبت سے نجات پانے پر بادشاہ نے پھر گجرات میں فوج مرتب کی اور دہلی سے کمک طلب کر کے سندھ پر حملہ کیا اس مرتبہ بادشاہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور وہاں کے فرمانروا کو معزول کر کے اس کے بیٹے کو تخت نشین کیا ۱۳۷۷ء میں اس کو اٹاوہ اور کٹھیر کے علاقوں میں بغاوتیں فرو کرنے کے لئے جانا پڑا۔ اٹاوہ کی بغاوت زیادہ بڑی نہ تھی۔ مگر کٹھیر میں باغیوں کی شرارت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی ان کے سردار نے بدایوں کے حاکم کو اپنے گھر پر بلا کر دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ فیروز کو ان لوگوں پر بے حد غصہ آیا چنانچہ اس نے کافی تعداد میں باغیوں کو قتل کرایا اور گرفتار کر لیا۔ اس کے علاوہ سنبھل میں ایک افغان سردار کو متعین کر کے حکم دیا کہ ہر سال ان کے علاقہ کو تاخت و تاراج کیا کرے تاکہ ان کے دلوں سے بغاوت کا خیال نکل جائے۔

س: فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں جو اصلاحات اور تعمیری کام ہوئے ان کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

سلطان محمد تغلق کا چچا زاد بھائی فیروز شاہ بن رجب سالار پچاس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا رحم دل بادشاہ تھا۔ دشمنوں پر بھی حد سے زیادہ ترس کھاتا تھا۔ یہ چالیس برس حکمران رہا۔ اس نے اپنے عہد میں بے شمار تعمیری کام کئے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

Marfat.com

ترقی زراعت

زراعت و آبادی کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ دوابہ کے ۵۲ پرگنے تھے اور تمام پرگنوں میں ایک گاؤں بھی غیر آباد نہ رہا اور ایک چپہ زمین کاشت سے خالی نہ تھی۔ صوبہ سامانہ میں بھی ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہو گئے تھے اور تمام رعایا خوش حال نظر آتی تھی۔

ارزانی کی یہ کیفیت تھی کہ خاص دہلی ایک من گیہوں ۸ جتیل میں ایک من جوار اور جو ۴ جتیل میں عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ایک سوار اپنے گھوڑے کے لئے دس سیر دلا ہوا غلہ جسے سراج عفیف نے "ولیدہ" یعنی دلیہ سے تعبیر کیا ہے ایک جتیل میں خرید لیتا تھا۔ گھی ڈھائی جتیل کا ایک سیر اور شکر ۳ یا ۲½ جتیل کی ایک سیر ملتی تھی۔

بیروزگاری کا انسداد

فیروز شاہ کے لئے یہ امر بار خاطر تھا کہ کوئی شخص اس کی سلطنت میں بے کار رہے اور کلفت سے زندگی بسر کرے۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا تھا کہ جب کوئی شخص بیکار نظر آئے تو کوتوال اہل محلہ سے اس کے حالات تحقیق کرکے بادشاہ کے روبرو پیش کرے پھر بادشاہ ہر بیکار کو اس کی حسب حیثیت مشاغل بتا دیتا کسی کو کارخانہ میں بھیج دیتا کسی کو وزیر کے پاس بھیج دیتا اگر کوئی کسی جاگیردار کے پاس رہنا چاہتا تو وہاں بھیج دیا جاتا۔ ان لوگوں کے رہنے کے لئے مکان ملتے اور ان کے معاش کا پورا انتظام کیا جاتا۔

کارخانہ جات

بادشاہ نے کل ۳۶ کارخانے قائم کر رکھے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں، معمولی اور غیر معمولی۔ معمولی قسم میں فیل خانہ یا پائے گاہ (اصطبل)، مطبخ، شتر خانہ، سگ خانہ، آبدار خانہ وغیرہ شامل تھے۔ ان کارخانوں کا خرچ ماہوار ایک لاکھ ساٹھ ہزار تنکہ تھا، اور اس قدر صرف ملازمین وغیرہ کے مشاہرہ کا تھا۔

غیر معمولی قسم میں جامدار خانہ، علم خانہ، فراش خانہ، رکاب خانہ، وغیرہ داخل تھے۔

Marfat.com

ان کارخانوں کے لئے ہر سال نیا سامان خریدا جاتا تھا۔ جامدار خانہ کے لئے موسم سرما میں ۶ لاکھ تنکہ کا علم خانہ کے لئے ہر سال ۸۰ ہزار تنکہ کا اور فراش خانہ کے لئے ہر سال دو لاکھ تنکہ کا اسباب خریدا جاتا تھا۔ ہر کارخانہ ایک امیر کے سپرد تھا اور سب کا حساب جداگانہ مرتب کیا جاتا تھا۔ تمام کارخانوں کی نگرانی خواجہ ابوالحسن کے ذمہ تھی۔

سکہ

سلطان محمد تغلق کی طرح فیروز شاہ کی سکوں کی طرف بہت توجہ تھی اس نے بڑی احتیاط کی کہ سکے عمدہ اور خالص تیار ہوں۔ اس کے عہد کے خاص سکے علاوہ طلائی اور نقرئی تنکہ کے جو پہلے سے رائج تھے۔ چہل دہشت گانی، بست وہنج گانی (یہ سکہ خاص فیروز شاہ کی اختراع تھے) بست و چہارگانی، دوزادہ گانی، دوگانی، ہشت گانی، شش گانی تھے۔ ان کی قیمتیں علی الترتیب ۴۸ سے چھ جیتیل تک تھیں۔

انتظام آب پاشی

بادشاہ کو آبادی املاک کا اس قدر خیال تھا کہ بارش کے زمانہ میں وہ خاص خاص سرداروں کو متعین کرتا کہ نہروں کے کنارے پھر کر دیکھیں کہ سیلاب کہاں تک پہنچا ہے اور وہ بہت خوش ہوتا جب اسے معلوم ہوتا کہ کاشت کار نہروں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ فیروز شاہ کے یہی انتظامات تھے کہ جنہوں نے نہ صرف اس کی جاگیر بلکہ سارے ملک کو آباد و خوش حال بنا دیا۔

تعمیرات

فیروز شاہ کے عہد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی تعمیرات ہیں۔ جنہوں نے ایک طرف ملک کو پر رونق بنانے میں مدد دی تو دوسری طرف رفاہ عام میں غیر معمولی اضافہ کیا۔

اس کو تعمیرات کا غیر معمولی شوق تھا۔ اور آثار قدیمہ کی طرف توجہ کرنے میں اولیت کا فخر اسی بادشاہ کو حاصل تھا۔

نئے شہر:۔ محمد تغلق کی یادگار میں جس کا اصلی نام جونا تھا۔ جون پور کا شہر اسی کا آباد کیا ہوا ہے

Marfat.com

دہلی سے تھوڑے فاصلہ پر فیروز آباد کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا۔ جس میں آٹھ جامع مسجدیں تھیں، اس نے محلات بھی کثرت سے تعمیر کرائے، جس میں فیروز کوشک۔ نزول کوشک جہندواری کوشک حصار فیروزہ، کوشک فتح آباد، کوشک جون پور، کوشک شکار (جسے اب فیروز شاہ کا کوٹلہ کہتے ہیں اور جو دلی سے نظام الدین جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے) کوشک بند فتح خان کوشک سامورہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔

بند

اس نے پانی کے بند بھی کثرت سے بنوائے ان میں بند فتح خان، بند مالجا، بند مہپال پور، بند شکر خان، بند سالورہ اور بند وزیر آباد بہت مشہور ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بندوں کا کوئی شمار نہیں۔

خانقاہیں و سرائیں

دہلی اور فیروز آباد میں اس نے ایک سو بیس خانقاہیں اور سرائیں تعمیر کرائیں، یہ ہمیشہ مسافروں سے بھری رہتیں۔ بادشاہ کی طرف سے مسافروں اور فقراء سب کو کھانا وغیرہ دیا جاتا تھا۔ تمام مصارف خزانہ شاہی سے نقد دیئے جاتے تھے اور ایک امیر ان کا متولی تھا۔

باغات

فیروز شاہ کو باغوں کا بھی بہت شوق تھا۔ دہلی کے قریب اس نے بارہ سو باغات لگوائے اور علاءالدین کے زمانہ کے تیس باغات کو بھی از سر نو آباد کر کے بہت ترقی دی۔ اسی طرح سورہ کے قریب اس ۸۰ باغ تیار کرائے چتور میں چوالیس تمام باغوں میں میووں اور پھلوں کی آمدنی تھی۔ جب حصار فیروزہ میں نہر کا پانی آنے لگا تو یہاں بھی کثرت سے باغات نصب کرائے

نہریں

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں جو رفاہ عام سے متعلق ہیں سب سے بڑا اور اہم کام نہروں کا اجرا تھا۔ حصار فیروز جس جگہ بنایا گیا تھا۔ وہاں پانی کی بہت تکلیف تھی۔ اس لئے

Marfat.com

اس نے یہ مصیبت دور کرنے کے لئے اور نیز ہزار ہا مخلوق کو فائدہ پہنچانے کے لئے دو نہریں بنوائیں ایک نہر اس نے دریائے جمن سے نکالی، جس کا نام اس نے رجیبزہ (رجیواہ) اور دوسری نہر دریائے ستلج سے جس کا نام الغ خانی تھا، دونوں نہریں کرنال کے قریب ہو کر گزرتی تھیں اور ۸۰ کوس کے بعد دونوں مل کر شہر فیروزہ حصار میں پہنچتی تھیں۔ یہ دو نہریں آج بھی موجود ہیں۔ اس نہر کا ثبوت عہد اکبری کی ایک سند ۹۷۰ھ سے ملتا ہے۔ جس کے شروع میں لکھا ہے، کہ دریائے چتانگ۔ ہے۔ ۲۱۰ سال ہوئے سلطان فیروز شاہ نے نہر نکالی تھی۔ علاوہ ان نہروں کے فیروز شاہ نے اور بھی متعدد نہریں جاری کی تھیں، جن میں سے ایک کا ذکر تیمور نے اپنے ملفوظات قلعۂ لونی کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قلعۂ لونی دریائے جمنا اور ہنڈون کے درمیان واقع ہے۔ ہنڈون حقیقتاً" ایک بڑی نہر ہے۔ جسے فیروز شاہ نے دریائے کالی ندی سے نکال کر فیروز آباد کے محاذ میں جمنا سے ملا دیا تھا۔

آثارِ قدیمہ کا تحفظ

آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کا خیال سب سے پہلے ہندوستان میں فیروز شاہ کو پیدا ہوا اور اس خیال کے ماتحت جن جن عمارتوں کی اس نے مرمت کرائی ان کا ذکر خود اس نے اپنی فتوحات میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پرانی عمارتیں جو خراب و ویران ہوگئیں تھیں میں نے ان کی مرمت کرائی اور ان کی آبادی کو میں نے اپنے محلات میں تعمیر پر مقدم جانا۔

دارالشفاء

فیروز شاہ نے بے شمار دارالشفاء تعمیر کرائے اس میں ادنیٰ اور اعلٰے تمام طبقوں کے مریضوں کا علاج ہوتا تھا، اطباء حاذق تشخیص امراض و معالجہ کے لئے مقرر کئے اور غذا دواء وغیرہ سب جائداد موقوفہ کی آمدنی سے مہیا کی جاتی تھی۔

مدارس

فیروز شاہ نے جو مدارس قائم کئے تھے ان میں سے ایک فتح خان کے مقبرہ کے پاس تھا۔ جسے "قدیم شریف" کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی۔ اور ایک حوض بھی فتح خان

Marfat.com

فیروز شاہ کا بہت محبوب فرزند تھا۔ یہ مدرسہ مع مسجد کے اس کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا۔
دوسرا مدرسہ فیروزآباد میں تھا۔ جو فیروز شاہی مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔ ضیا برنی نے لکھا ہے کہ یہ مدرسہ بہ لحاظ عمارت و تعلیم اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

اس مدرسہ کی عمارت بہت وسیع تھی اور اس کے گنبد بڑے شاندار تھے یہ مدرسہ ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع تھا۔ ہر وقت سینکڑوں طلبہ و کثیر علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے تھے اور سارا باغ ان کے لئے وقف تھا۔ یہاں ان کی تعلیم تعلم درس و تدریس عبادت و تفریح کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے اور وہ نہایت آزادی کے ساتھ تالاب کے کنارے باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے صیقل کیے ہوئے فرش پر اپنے مشاغل علمیہ میں منہمک نظر آتے تھے۔ اس مدرسہ سے متعلق ایک مہمان خانہ بھی تھا۔ جہاں سیاح آکر قیام کرتے اور مسجد مدرسہ کے ساتھ ایک لنگر خانہ یا خیرات خانہ بھی تھا۔ جس سے تمام غرباء اور مساکین کو امداد ملتی تھی۔ فیروز شاہ نے کتنے مدارس تعمیر کروائے اس کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے۔ ماثر رحیمی میں پچاس مدرسہ درج ہیں فقیر محمد لکھتے ہیں کہ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں تیس کی تعداد درج ہے۔ اگر ان میں سے کوئی تعداد صحیح نہ ہو تو بھی اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس نے متعدد مدارس قائم کیے۔

دیوان خیرات

غربا کے فائدہ و سہولت کے لئے اس نے دیوان خیرات بھی قائم کیا تھا اس سے مقصود یہ تھا کہ جن غرباء و مساکین کی لڑکیاں جوان ہوگئی ہوں اور بوجہ افلاس ان کی شادی نہ ہوسکتی ہو انہیں مدد دی جائے۔ پچاس سے بیس تنکہ تک ہر شخص کو مدد ملجاتی تھی۔ سراج عفیف لکھتا ہے کہ اس سلسلہ میں ہزاروں آدمیوں کی اعانت کی گئی۔ خدا جانے کتنی ناکتخدا لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔

دارالترجمہ و کتب خانہ

فیروز شاہ سے برہمنوں نے یہ کہا کہ مندر میں ۱۳۰۰ کتب قدیم زمانہ کی رکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ فیروز شاہ اس بت خانہ میں جس کو "جوالا مکھی" کہتے تھے گیا اور وہاں تمام علما کو طلب کرکے بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا انہیں کتابوں میں سے ایک کتاب حکمت نظری و عملی کی

Marfat.com

تھی۔ جن کو اعزّ الدین خالانی نے (جو اس وقت کے مشہور شعرا میں سے تھا) نظم کر کے دلائل فیروز شاہی نام رکھا ایک کتاب عروض علم موسیقی کی ایک فن پٹہ بازی کی بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ تفسیر تاتارخانی، فتاویٰ تاتارخانی (جو فن تفسیر و فن فقہ کی بے مثل کتابیں) اور عین الملکی اس عہد کی مشہور تصانیف ہیں۔

فنون کی ترویج

فیروز شاہ کو تمام فنون کے ساتھ دلچسپی تھی۔ چنانچہ استاد کے ماتحت اس نے اپنے غلاموں کی بڑی تعداد کو مختلف پیشوں اور حرفوں کی تعلیم دلائی۔ اور لوگوں میں مختلف نئی نئی چیزیں بنانے کا ولولہ پیدا کر دیا۔ اس عہد کے ایک مشہور ایجاد و طاس گھڑیاں ہے جس سے نمازوں کے اوقات روزہ کھولنے کا وقت سایہ کا حال، شب و روز کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔

اسلامی طرز حکومت کی ترویج اور احکام شریعت کا نفاذ

اس مقصد کے لئے اس نے حسب ذیل اہم کام سرانجام دیئے۔ چنانچہ وہ خود فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ

"۱۔ مجھ سے قبل بہت سے ناجائز اور نامشروع ٹیکس قائم تھے۔ میں نے ان کو ایک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ صرف شرع کے مطابق خراج وصول کیا جائے یعنی زمین مزروعہ کی پیداوار کا دسواں حصہ معدنی پیداوار کا ایک خمس اور مسلمانوں کی صدقہ و زکوٰۃ کی رقم خزانہ داخل ہونی چاہیئے

۲:۔ میرے عہد سے پہلے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سپاہیوں کو دیا جاتا تھا۔ باقی خزانہ میں داخل ہوتا۔ میں نے اس کو بھی موقوف کیا۔ کیونکہ حکم شرعی اس کے بالکل خلاف تھا چنانچہ میں نے ہمیشہ خزانہ میں مال غنیمت کا ایک خمس داخل کیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کرایا۔

۳:۔ شرع کے خلاف مسلمانوں میں عام طور سے یہ رواج ہو گیا تھا کہ ان کی عورتیں شہر کے باہر مزاروں پر جاتی تھیں، چنانچہ اوباشوں کو بدمعاشی کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ اس لئے میں نے حکم دیا کہ آئندہ جو عورت مزاروں پر جائے گی۔ اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ چنانچہ یہ دستور بالکل موقوف ہو گیا۔

Marfat.com

۴۔ مجھ سے قبل یہ دستور تھا کہ شاہی دستر خوان پر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا اور تلواروں کے قبضے وغیرہ زر و جواہر سے مرصع ہوتے تھے۔ میں نے ان باتوں کو منسوخ قرار دیا، اور حکم دیا کہ ہتھیاروں میں صرف ہڈیوں کے دستے لگائے جائیں اور ظروف نقرئی اور طلائی کا استعمال یک قلم موقوف کر دیا جائے۔

۵۔ ریشمیں و زربفت کے لباس کا بھی امراء میں عام رواج تھا۔ میں نے اس کی بھی ممانعت کی اور شریعت کے مطابق ایک انگل سے زیادہ عریض ریشمی کپڑے کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

۶۔ میرے آقا سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں جو لوگ قتل ہوتے ان کے وارثوں کو اور جو مفلوج الاعضاء تھے۔ خود انہیں بلا کراتنی بخشش کی کہ انہوں نے رضامندی کا اظہار کر کے اقرار نامے لکھ دیئے۔ ہم کو اب سلطان محمد تغلق پر کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے یہ سارے اقرار نامے ایک صندوق میں بند کرا کے محمد تغلق کے سرہانے رکھ دیئے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ خدا میرے آقا کے ساتھ مہربانی فرمائے گا۔

۷۔ مجھ سے قبل جو وظائف اور دیہات معافی وغیرہ کے ضبط ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق میں نے عام حکم دے دیا کہ از روئے سند جس کا حق ثابت ہو اس کے حق میں تمام وظائف وغیرہ بحال کر دیئے جائیں۔"

۸۔ جو لوگ ملک میں الحاد و زندقہ اور بے دینی کی اشاعت کر رہے تھے۔ ان کو سخت سزائیں دیں اور ان کتابوں کو جلایا اور اس طرح ملک سے ان کا اثر بالکل نابید ہو گیا۔

۹۔ خطبہ میں سلاطین اسلام کے نام نہیں لئے جاتے تھے۔ فیروز شاہ نے حکم دیا کہ ان کے نام لئے جائیں۔

۱۰۔ پہلی بادشاہتوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوتے تھے۔ اس نے ان سب کا خاتمہ کر دیا اس نے تمام خدم و حشم کو تنخواہ دار مقرر کیا اور یہ قاعدہ جاری کیا کہ اگر کوئی شخص مر جائے تو اس کی وجہ معاش اس کے فرزند کی طرف منتقل کر دی جائے۔ اگر اولاد نرینہ نہ ہو تو داماد کو اور داماد نہ ہو تو غلام کو اور اگر مرنے والے کا غلام بھی نہ ہو تو اس کے دوسرے اعزہ کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول عفیف (شمس سراج) کے" رعایائے سلطنت اور آبادی میں اتنا اضافہ ہوا کہ ہر قطعہ ملک میں ہر چار کوس پر ایک گاؤں آباد ہو گیا اور ہر شخص کے پاس سونے چاندی اور دوسرے اسباب راحت و آسائش کے انبار لگ گئے۔

Marfat.com

قانون اور انصاف

سلطان نہایت انصاف پسند حکمران تھا۔ اس سلسلہ میں اس کی اہم ترین اصلاح تعذیب یا سخت اذیت کا سلسلہ بند کرنا تھا۔ اس وقت رواج تھا کہ ملزم کے خلاف شہادت نہ ملتی تھی تو اس کو اس قدر تکلیف پہنچاتے تھے کہ وہ اعتراف جرم کر لیتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ غیر انسانی طریقہ کار تھا۔ فیروز شاہ نے اس کو بند کیا۔ اس سلسلہ میں بے محل نہ ہو۔ اگر یہ ذکر بھی کر دیا جاتے کہ سلطان کو فقہ سے دلچسپی تھی اور اس عہد میں اس مضمون کا کافی مطالعہ ہوا۔

فوجی اصلاحات

سلطان کو ایک عظیم فوج کا انتظام کرنا ہوتا تھا، اس میں نوّے ہزار سوار تھے۔ یہ ان دستوں کے علاوہ تھے۔ جو مختلف جاگیرداروں کے تحت رہتے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی۔ پیادہ فوج اور ہاتھی اس کے علاوہ تھے۔ مشاہرہ جاگیروں اور زمینوں کی شکل میں بھی دیا جاتا تھا اور کبھی کبھی علاقوں کے لگان کی شکل میں لیکن جو فوج مستقلاً دربار کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی تنخواہ خزانہ سے دی جاتی تھی۔ ملک رضی نائب عرض ممالک کے عہدہ پر فائز تھا۔ وہ نہایت مستعد اور سمجھدار شخص تھا۔ اور بہت سے خراب رواج اس کے حکم سے بند ہوئے۔ فیروز کا جذبہ ہمدردی بہت مضبوط تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے حکم جاری کیا تھا کہ اگر کوئی افسر یا سپاہی مارا جائے تو اس کے خاندان سے کسی مناسب شخص کو لیا جائے چاہے وہ اس کا رشتہ دار ہو چاہے غلام۔ اس کا اثر فوج کی کارکردگی پر یقیناً اچھا نہ ہوگا۔

غلاموں کی تربیت

فیروز شاہ کو غلاموں سے بہت دلچسپی تھی۔ اور اس کے پاس ان کی بہت بڑی تعداد تھی ایک وقت میں یہ تعداد ایک لاکھ اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی، سلطان نے ان کی تربیت اور دیکھ بھال کے لئے ایک علیحدہ محکمہ کھولا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کی صلاحیت اور رجحان طبع کے مطابق تربیت دی جاتی تھی۔ جو اس قابل تھے کہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں ان کو فقہ اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تیار ہو گئی جو کسی نہ کسی فن

Marfat.com

میں ماہر تھے۔ اس سے سلطنت کی اقتصادی اور صنعتی زندگی پر یقیناً اچھا اثر ہوا ہوگا۔ ان غلاموں میں سے بعض سلطان کے بہت محبوب بن گئے ان کو ذمہ دار عہدوں پر مقرر کر دیا گیا اور چند نے اپنی علیحدہ ریاستیں قائم کر لیں اس طرح ان لوگوں نے سلطنت دہلی کے استحکام اور شیرازہ بندی کو متاثر کیا۔

س :- ہندوستان پر امیر تیمور کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں اور اس کے اثرات بھی واضح طور بیان کیجئے۔

فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد پورا ملک بغاوت اور طوائف الملوکی کے شعلوں میں لپٹ گیا نو برس کی مدت میں یکے بعد دیگرے کئی مدعیان سلطنت اٹھے اور تخت حکومت پر قابض ہو کر قتل کر دیئے گئے پہلے اس کا پوتا تغلق شاہ تخت نشین ہوا۔ اور غیاث الدین تغلق شاہ کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ اور اس کا چچازاد بھائی ابوبکر شاہ بادشاہ ہوا لیکن ڈیڑھ برس کے بعد ناصر الدین محمد نے اسے قتل کرا دیا اور خود تخت سلطنت پر قابض ہوا۔ اس نے چھ برس سات مہینے حکومت کی۔ اب اس کا بیٹا ہمایوں خان سلطان سکندر شاہ کے نام سے بادشاہ ہوا، لیکن ڈیڑھ ماہ بعد ہی ایک شدید مرض میں گرفتار ہو کر چل بسا۔ اب امیروں میں سخت اختلاف ہوا کہ کس کو بادشاہ بنایا جائے۔ اس اختلاف نے اتنا طول کھینچا کہ پندرہ روز تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور تخت سلطنت لاوارث پڑا رہا۔ آخر ایک مشہور امیر خواجہ جہاں کی کوشش سے ناصر الدین کا سب سے چھوٹا بیٹا محمود جمادی الاولیٰ ۷۹۶ھ میں تخت پر بٹھایا گیا اور ناصر الدین کے لقب سے مشہور ہوا۔ چند دنوں بعد ہی ایک امیر سعادت خان باغی ہو گیا اور اس نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے پوتے نصرت خان کو تخت دہلی پر بٹھانے کی جدوجہد کی۔ سعادت خان تو مارا گیا لیکن فیروز آباد کے امیروں نے نصرت خان کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ دہلی میں محمود تغلق بادشاہ اور فیروز آباد میں نصرت خان اس طرح گویا ایک ہی سلطنت پر "دو" بادشاہ حکمرانی کر رہے تھے۔ اس صورت حال نے دہلی سلطنت کو بالکل کمزور کر دیا۔ ملک میں ہر طرف بدامنی اور شورش پھیل گئی بنگال جون پور، سندھ، گجرات مالوہ اور دکن اگرچہ یہاں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں لیکن صوبے بالکل آزاد اور خود مختار رہتے۔ دہلی سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ راجپوتانہ اور جنوبی ہند میں ہندوؤں کی مضبوط حکومتیں قائم تھیں۔ اس طرح ظاہر ہے دہلی کی سلطنت کا اقتدار ہی کیا ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کی متزلزل سیاسی حالت کو دیکھ کر امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اپنے فوجی مشیروں کے سامنے ہندوستان کے مسئلہ کو

Marfat.com

پیش کیا۔ ان سب میں سے بعض نے کہا کہ پانچ دریاؤں کا عبور کرنا گھنے جنگلوں سے گزرنا، بڑے بڑے راجاؤں کی خونخوار افواج (جو جنگلوں میں وحشی درندوں کی طرح چھپی ہوتی ہے) سے عہدہ برا ہونا آہن پوش ہاتھیوں کو شکست دینا ایسا آسان کام نہیں بعض نے محمود غزنوی کی مثال پیش کی کہ اس نے صرف تیس ہزار سواروں کی مدد سے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا اور ہمارے پاس تو ایک لاکھ جرار فوج موجود ہے۔ اس کے ساتھ شاہزادہ شاہ رُخ (تیمور کے بیٹے) نے بھی ہندوستان کی دولت اور یہاں کے کفر و بت پرستی کا ذکر کرکے جہاد پر آمادہ کیا۔ مخالفین نے پھر ایک دلیل پیش کی کہ اگر وہاں کامیابی ہو بھی گئی تو ہماری نسل کے لوگ جو وہاں حکمراں ہوں گے۔ ان کو بعد میں یقیناً انحطاط پیدا ہو جائے گا اور وہاں کی آب و ہوا ان کو آرام طلب عیش پسند اور غیر جنگجو بنا دے گی۔ اس پر تیمور نے کہا کہ میرا مقصد قیام کرنا نہیں ہے۔

اس سے قبل پیر محمد جہانگیر (تیمور کا پوتا جو کابل کا گورنر تھا تمام حدود افغانستان کو زیر کرکے ہندوستان کے اندر پہنچ چکا تھا۔ اور دریائے سندھ کو عبور کرکے ملتان کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ اتفاق سے اس وقت جب کہ تیمور حملۂ ہندوستان کی تیاریاں کر رہا تھا۔ پیر محمد کی تحریر پہنچی جس میں سلطنت دہلی کی بدنظمی اور طوائف الملوکی وغیرہ کا مفصل حال درج تھا۔ اس تحریر کو دیکھتے ہی تیمور نے رجب ۸۰۰ھ مارچ ۱۳۹۸ء میں اپنے دارالسلطنت سمرقند سے ہندوستان کی طرف کوچ کر دیا اور ۸ محرم کو سرحد کی سنگلاخ زمینوں کو ہستانوں کی چوٹیوں اور وادیوں کو طے کرتا ہوا اس دریائے سندھ پر پہنچ گیا جسے جلال الدین خوارزم نے چنگیز خان تیمور کے مورث اعلیٰ کے تعاقب سے خوف زدہ ہو کر عبور کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے کشتیوں کا ایک پل دو دن کے اندر تیار کرایا اور ۱۲ محرم کو دریا سے عبور کرکے اپنے پوتے پیر محمد سے مل گیا جس نے ملتان پر قبضہ کر لیا تھا۔

پنجاب کی یہ حالت اس وقت یہ تھی کہ تیموری حملہ کی داستانیں عام ہو گئی تھیں اور دیپالپور کے لوگ بھاگ کر بھٹیر کے قلعہ میں پناہ لے رہے تھے۔ تیمور بھٹیر پہنچا اور وہاں قتل عام کرکے آگے بڑھا اب فتح آباد بھی ویران تھا۔ سرستی کے لوگ بھی شہر چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے تھے اور تیمور جس طرف سے گزرتا تھا۔ نصرت و کامیابی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ آخر کار ۴ ربیع الاول کو پانی پت کے مشہور میدان میں پہنچ گیا۔ یہاں کوئی اس کا مقابل نہ تھا۔ اس لئے وہ آگے بڑھا اور ۷ ربیع الثانی کو دہلی پہنچ گیا۔ جہاں محمود شاہ کی فوج اس کے مقابلے کے لئے آمادہ تھی ـــــــ

Marfat.com

امیر تیمور نے اپنی فوج اس طرح مرتب کی کہ پیر محمد اور امیر یادگار وغیرہ کو میمنہ سپرد کیا، سلطان حسین اور خلیل سلطان وغیرہ کو میسرہ پر رکھا اور خود قلب میں رہا۔ محمود شاہ کی فوج میں بارہ ہزار سوار چالیس ہزار پیادہ تھے۔ علاوہ اس کے ۱۲۰ ہاتھی بھی تھے۔ جو بالکل آہن پوش تھے۔ اور ان کے دانتوں میں زہریلی کٹاریں لگی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر ہودوں میں تیر انداز اور آتش باز بیٹھے تھے۔

تیمور جب فوج کی ترتیب سے فارغ ہوگیا تو اس نے ایک بلندی پر چڑھ کر فوج کے مواقع دیکھ کر اپنی فتح کے لئے دعا مانگی اور پھر حملہ کا حکم دیا تیمور کی میمنہ نے ہندی فوج کے میسرہ پر تیروں کی بارش شروع کی اور اسے پیچھے ہٹا دیا۔ اسی طرح ترکیوں کے میسرہ نے دہلی فوج کے کے میمنہ کو پسپا کر دیا قلب میں چونکہ اقبال خاں اور خود محمود شاہ موجود تھے۔ اس لئے اس عنصر نے تھوڑی دیر سخت مقابلہ کیا مگر اسے بھی شکست ہوئی۔ اور یہ دونوں بھاگ کر شہر میں داخل ہوئے اور وہاں سے بھی رات کو چھپ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔

۸ ربیع الثانی کو فتح کے بعد تیمور نے حوض خاص پر اپنا خیمہ نصب کیا اور تمام امراء اور اراکین حاضر ہو کر قدم بوس ہوئے اور علماء و فضلاء بھی آئے جن کی خواہش کے مطابق اس نے قتل عام کا حکم نہیں دیا۔ اور زر فدیہ لے کر سب کو امان دینے کا وعدہ کر لیا۔ دہلی کی جامع مسجد میں امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور جشن فتح مندی شروع ہو گیا۔

ایک ہفتہ بعد ۱۶ ربیع الثانی کو زر فدیہ کی وصولی میں تیمور کے سپاہیوں کی طرف سے کچھ سختی ہوئی تو اس پر لوگوں میں کچھ ہنگامہ ہوا حتی کہ تیموری فوج جو پہلے ہی سے غارت گری کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی برہم ہو کر لوٹ مار پر آمادہ ہو گئی۔ تیمور نے بہت کوشش کی کہ خونریزی نہ ہو، لیکن وہ اپنی فوج کے بڑھتے ہوئے جوش کو نہ روک سکا اور پھر مسلسل ۱۹ ربیع الثانی تک سوائے ان مقامات کے جہاں علماء فضلاء فقہا وغیرہ رہتے تھے۔ سری جہاں پناہ اور دہلی کہنہ خون ریزی اور غارت گری کا ہولناک منظر بنے رہے اس لوٹ میں اس قدر زر و جواہر نقرئی و طلائی برتن زیورات اور قیمتی کپڑے ہاتھ لگے کہ شاید اس سے قبل کبھی تیموری فوج کو نصیب نہ ہوئے تھے علاوہ اس کے قیدیوں کی تعداد اتنی تھی کہ ہر شخص کو بیس سے لے کر ایک سو غلام تقسیم ہوئے تیمور نے دہلی کے بہت سے پیشہ ور دست اور حرفہ جاننے والے لوگوں کو سمرقند روانہ کر دیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو ان فنون کی تعلیم دی جائے۔

Marfat.com

تیمور کو پندرہ دن دہلی میں قیام کیے ہوئے ہو گئے تو اسے خیال آیا کہ وہ یہاں ٹھہرنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصود تو صرف جہاد تھا۔ اس لئے وہ ۲۲ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو دہلی سے روانہ ہوا اور قلعہ فیروز آباد میں نماز پڑھکر میرٹھ گیا اس کو تباہ و برباد کر کے ہردوار پہنچا اور یہاں بھی اسے فتح نصیب ہوئی۔ اس کے بعد دریائے گنگ کو عبور کر کے مسوری کے نیچے کوہ سوالک میں نشانات فتح چھوڑتا ہوا اس نے نگر کوٹ اور جموں کو فتح کیا اور ۱۹ جمادی الآخر کو افغانستان کی وادیوں میں غائب ہو گیا۔

اس کے بعد محمود تغلق کے وزیر ملو اقبال نے موقع پا کر دہلی پر قبضہ جمالیا اور حکومت کرنے لگا۔ ۱۴۰۵ء میں اس کے خلاف بغاوت کا ایک طوفان اٹھا اور یہ قتل کر دیا گیا اب لوگوں نے محمود تغلق کو گجرات سے بلا کر پھر اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس نے ۱۴۱۲ء تک حکومت کی لیکن اب اس کے پاس دہلی کی گزشتہ وسیع سلطنت میں سے لے دے کے صرف ایک شہر دہلی رہ گیا تھا۔ اس بنا پر اس نے بادشاہ کا لقب بھی پسند نہ کیا۔

اثرات

۱۔ امیر تیمور کے حملہ نے تغلق خاندان کا دفنار خاک میں ملا دیا۔ یہ خاندان اندرونی سازشوں اور باہمی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حملہ سے پہلے ہی تباہی کے گڑھے کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اس حملہ نے اس کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

۲۔ اس حملہ سے دہلی شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ بے شمار بندگان بے گناہ مارے گئے۔

۳۔ اس حملے کے بعد سلاطین دہلی کی حکومت پھر کبھی نہ جم سکی، تغلق خاندان کے بعد سید خاندان اور لودھی خاندان برسر اقتدار آئے۔ لیکن ان کی بھی حکومت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

۴۔ اس حملہ سے ہندوستان کی معیشت تباہ و برباد ہو گئی۔

۵۔ واپسی کے وقت تیمور نے خضر خان کو لاہور، ملتان، دیپال پور کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ یہ ایک مضبوط شخصیت تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر خضر خان نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور سادات خاندان کی بنیاد ڈالی۔

Marfat.com

س : تغلق سلطنت کے زوال کے اسباب تحریر کیجئے ۔

اسباب

سلطان محمد بن تغلق کے ابتدائی عہد میں سلطنت دہلی اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی کشمیر کے علاوہ سارا برصغیر اس کی فرماں روائی تسلیم کرتا تھا ۔ اس دور میں جب کہ ذرائع رسل ورسائل نہایت محدود اور کم رفتار تھے ۔ اتنے وسیع علاقہ پر حکومت کرنے میں متعدد دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا ۔ یہی سبب تھا کہ سلطان علاء الدین خلجی نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا اور مقامی حکمرانوں کو وسیع اختیارات دیئے محمد بن تغلق نے اس پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں کیں ۔ اس کو نئے تجربوں کا بھی شوق تھا ۔ اور یہ بھی خواہش تھی کہ دکن کے علاقوں پر براہ راست دہلی سے حکومت کی جائے اس مقصد کی تکمیل کے لئے سب سے اہم اور ضروری بات یہ تھی کہ دکن میں ایک اسلامی مرکز قائم کیا جائے ۔ جس کے ذریعہ اسلام کی بھی تبلیغ ہوسکے اور حکومت کو اخلاقی مدد مل سکے یہ بھی ضروری تھا کہ جنوب میں مسلمانوں کی آبادی بڑھ جائے ۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہندو راجہ اور سردار بہ آسانی اپنے قدیم اختیارات کو نہ چھوڑیں گے اور بغاوتوں کا امکان ہر وقت باقی رہے گا ۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے اور حکومت کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے مسلم آبادی کا ہونا لازمی ہے ۔ اس لئے توسط سے ہی مقامی آبادی کے رویہ میں تبدیلی لائی جاسکتی تھی ۔ ان مقاصد کے پیش نظر اس نے دولت آباد کو دوسرا دارالحکومت بنایا تھا یہ ایک انقلابی اقدام تھا ۔ اور ہر انقلابی تبدیلی کی طرح اس کی تکمیل میں لوگوں کو کثیر قربانیاں دینا پڑیں ۔ سیف سے خاندانوں کو منتقلی کے سلسلہ میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا یقیناً ان میں ایسے بھی ہوں گے ۔ جن کے نقصانات کی تلافی نہ ہوسکی ہوگی ۔ اس لئے جہاں تک فوری واقعات اور نتائج کا تعلق ہے ۔ سلطان کا یہ منصوبہ ایک بلائے ناگہانی معلوم ہوتا تھا ۔ لیکن تہذیب و تمدن کی اشاعت کبھی تیز رفتار نہیں ہوتی ۔ محمد بن تغلق کے اس غیر معمولی اقدام کے نتائج برآمد ہوئے

Marfat.com

مگر کچھ عرصہ کے بعد دکن میں اسلام نے ایک مستحکم مقام حاصل کر لیا۔ اگرچہ آبادی میں مسلمانوں کی حیثیت ہمیشہ اقلیت ہی کی رہی پھر بھی وہاں کی زندگی میں اسلامی تہذیب کا پلہ بھاری رہا۔ یہ محمد بن تغلق کے اسی منصوبہ کا نتیجہ تھا۔ جس پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے انقلاب کی بنیاد ڈالی، جو اپنی تیز رفتاری میں خود اس کے اقتدار کو بھی بہا لے گیا یوں تو تاریخ تہذیب و تمدن کی مکمل تصویر میں حکومت کا ایک فرد یا خاندان سے نکل کر دوسرے فرد یا خاندان کے ہاتھ میں آجانا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن دولت آباد کے امیران صدہ کی بغاوت سے سلطنت دہلی کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس کے علاقے میں بہت کمی ہو گئی۔ اور سیاسی اقتدار کمزور پڑ گیا۔ محمد بن تغلق کے ذہن میں تو یہ تھا کہ دولت آباد ایک ایسا اسلامی مرکز ہو گا جو سلطنت دہلی کی مرکزیت کو قوت پہنچاتا رہے گا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ دکن میں اسلام کی اشاعت تو یقیناً ہوئی اور مسلم آبادی بھی بڑھ گئی۔ مگر وہاں کے خود غرض امراء نے علاقائیت کے تخیل کو ایسی ہوا دی کہ وہ سارا علاقہ خود مختار ہو گیا انتہائی جنوب میں ہندوؤں نے پہلے ہی ایک خود مختار ریاست قائم کر لی تھی۔ دولت آباد کے مقتدر امراء کے لئے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ مگر کو دوبارہ سلطنت دہلی کا حصہ بنانے میں محمد بن تغلق کی مدد کرتے مگر انہوں نے یہ نہیں کیا بلکہ خود ایک اپنی ریاست قائم کر کے دہلی کی مرکزیت اور اقتدار کو صدمہ پہنچایا مستقبل کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ دکن میں علیحدگی کے اس تخیل کو تقویت پہنچنے کے خطرناک نتائج ہوئے پوری ایک صدی (سترھویں) مغلیہ سلطنت کی اس میں ضائع ہوئی کہ سارے برصغیر میں اسلامی اقتدار کی مرکزیت قائم کی جائے اکبر سے عالمگیر تک اس حکومت کی یہی کوشش رہی اس کوشش میں جو روپیہ اور وقت ضائع ہوا وہ دوسرے تعمیری کاموں پر صرف ہوا تو یقیناً مغلیہ سلطنت ہی نہیں بلکہ مسلمانان برصغیر کی حیثیت بہت بہتر ہو سکتی تھی۔

بہرحال دکن سے علیحدگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ دوسرے علاقوں تک پہنچا۔ دہلی میں بھی جو حکمران تخت پر بیٹھے ان میں سے اکثر نااہل تھے وہ سلطنت کا وقار بحال نہ کر سکے۔ ان حالات کے علاوہ سلطان فیروز شاہ کا جاگیرداری کے طریقوں کو رواج دینا بھی سلطنت کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ ان میں سے کئی بڑے جاگیردار ایسے نکلے جو امیران صدہ کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلے اور مرکزیت دہلی کو مزید نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک طرف تو علاقائی رہنماؤں اور جاگیرداروں کی یہ کوشش کہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں اور دوسری طرف دربار دہلی کی ابتری حکمرانوں کی نااہلی اور لاپرواہی یہ سب مل کر سلطنت کے زوال کا سبب بنے۔ جب ان اسباب

Marfat.com

کی وجہ سے سلطنت انتہائی نازک حالات سے دوچار تھی۔ شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسا طوفان آیا جس نے اس کے رہے سہے وقار کو بھی تقریباً ختم کر دیا۔ تیمور کے حملے نے تباہی و بربادی کے وہ مناظر دکھائے جن کا دہلی کو بعد میں متعدد مرتبہ تجربہ ہوا لیکن اس وقت تک وہاں یہ صورت پیدا نہ ہوئی تھی۔ غرضیکہ دہلی سلطنت پر ایسا زوال آیا کہ بعد میں لودھی سلاطین کی کوششوں کے باوجود وہ اپنی اصل حالت پر نہ آسکی۔

مورخین نے تغلق خاندان کے زوال کی ذمہ داری محمد بن تغلق پر ڈالی ہے۔ لیکن بعد کے سلاطین اور جانشین نااہل اور کمزور تھے۔ وہ ہر وقت عیش و عشرت و لہو لعب میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں انتظامی صلاحیتیں مفقود تھیں ان میں کوئی بھی ایسا بادشاہ نہ تھا جو اپنی بصیرت سے تغلق سلطنت کی ساکھ کو قائم رکھ سکتا۔

اس کے علاوہ تغلق خاندان کے تنزل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہر بادشاہ کی وفات کے بعد تخت کے مختلف دعویدار پیدا ہو جاتے ان میں تخت نشینی کی جنگیں ہوتیں ان کی حمایت میں امراء میں سازشیں ہوتیں۔ بعض اوقات ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اور ملک میں سیاسی خلفشار پیدا ہو جاتا۔ جس سے سلطنت کمزور پڑ جاتی۔

تغلق خاندان کے بادشاہوں نے ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانے کی کبھی بھی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ ہندو عوام ان کو غیر ملکی سمجھتے تھے۔ اور موقع ملتے ہی بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

دہلی کی مرکزی حکومت تغلق خاندان کے آخری ایام میں بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن امیر تیمور کے حملے نے دہلی کو بالکل برباد کر دیا اور اس کے رہے سہے وقار کو ختم کر دیا۔ اس حملے کے بعد تغلق خاندان کی مرکزی طاقت بحال نہ ہو سکی اور سلطنت دہلی پارہ پارہ ہو گئی ملک میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں ان اسباب کی بنا پر تغلق خاندان کو دہلی کی سلطنت پر زوال پذیر ہونا پڑا۔

Marfat.com

سیّد خاندان

س :- سید خاندان کو تاریخ ہند میں کیا مقام حاصل ہے اس کے عروج و زوال کی مختصر داستان بیان کیجیے۔

خضر خان، ملک الشرق ملک سلیمان کا بیٹا تھا۔ ناصر الملک مردان دولہ (گورنر ملتان) کا متبنی تھا۔ اس کے مرنے پر ملک شیخ اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ لیکن قضا نے اس کو بھی چند دن بعد اپنے باپ سے ملا دیا۔ اس لئے فیروز شاہ ملک سلیمان کو اقطاع ملتان کا مالک بنا دیا مگر یہ بھی چند روز زندہ رہا۔ اس لئے اس کے بعد اس کا بیٹا خضر خان یہاں کا فرمانروا مقرر کیا گیا[1] چونکہ ملک سلیمان سید تھا اور خضر خان اس کا بیٹا تھا۔ اس لئے جو عہد حکومت خضر خان سے شروع ہوتا ہے اسے سید خاندان کی سلطنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خضر خان کو کسی مورخ نے سلطان کے لقب سے یاد نہیں کیا۔ مبارک شاہی میں تخت نشینی کے بعد اس کو "بندہ رایت عالی" اور تخت نشینی سے پہلے "مسند عالی" لکھا ہے۔ طبقات اکبری میں رایت عالی درج ہے اور ملا ئے بدایون نے مسند عالی تحریر کیا ہے۔ فرشتہ نے صرف "سید خضر خان" کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خضر خان نے باوجود تخت نشین ہوجانے کے ہمیشہ اپنے کو تیمور کا ماتحت سمجھا اور کبھی بادشاہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی تصنیف میں اس بیان پر کفایت کی ہے کہ "اسم بادشاہی برخود تجویز نہ کرد و رایات اعلیٰ خطاب یافت"[2]

سکّہ

خضر خان نے فیروز شاہ یا اس کی اولاد کا نام سکوں میں درج کرایا تھا۔ چونکہ وہ خود بادشاہ کہلائے جانے کا آرزو نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس کو پرواہ نہ ہوسکتی تھی کہ سکوں پر کس کا نام ہے۔ البتہ وہ سنہ ضرور درج کرتا تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ فلاں شخص کے عہد میں یہ سکہ مضروب ہوا۔

---

[1] منتخب التواریخ صہ۵۲ مطبوعہ نولکشور [2] منتخب التواریخ صہ۵۷

Marfat.com

خضر خاں سب سے پہلے تاریخ ہند میں بحیثیت گورنر ملتان نمودار ہوا۔ جب فیروز شاہ مرگیا اور اس کے بعد حکومت میں طوائف الملوکی پھیل گئی تو پھر وہ اس وقت نظر آیا جب سارنگ خان ملا اقبال خان کے بھائی نے قلعہ ملتان کا محاصرہ کرکے اس کو قید کر لیا (۷۹۸ھ) اس کے بعد خضر خان کسی طرح قید سے اپنی جان بچا کر بیانہ چلا گیا اور پھر جب تیمور نے حملہ کیا تو اس نے اپنی امیدوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا اور آخرکار امیر تیمور کی واپسی پر اس نے ۱۴۱۴ء/۸۱۷ھ میں دولت خان لودھی کو زیر کرکے دہلی پر قبضہ حاصل کر لیا اس نے سات سال تک حکومت کی اور ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح سلطنت دہلی کا اگلا اقتدار پھر قائم ہو جائے، لیکن وہ اس میں صرف اس قدر کامیاب ہوا کہ قرب و جوار کے راجہ ایک حد تک مطیع ہو گئے لیکن بغاوت و شورش بدستور باقی رہی اور جو اجزاء سلطنت منتشر ہو گئے تھے وہ فراہم نہ ہو سکے۔

۸۱۷ھ میں تخت نشین ہوتے ہی اپنے وزیر تاج الملک (ملک الشرق) کو بدایوں اور کٹیہرہ کی طرف روانہ کیا یہاں کا راجہ ہر سنگھ کوہستان آنولہ میں بھاگ گیا اور پھر مطیع ہو گیا۔ اسی طرح حیات خان امیر بدایونی نے بھی اطاعت اختیار کی۔ اس کے بعد اس نے کالی ندی اور گنگا کو عبور کرکے شمس آباد اور کمپل (کملا) کے باغیوں سے خراج وصول کیا اور دہلی واپس آیا۔ چونکہ راجاؤں اور باغیوں کی یہ اطاعت بالکل عارضی تھی۔ اس لئے پھر شورش اور انحراف کی شکایت رہی اور ۱۴۱۶ء/۸۱۹ھ میں دوبارہ تاج الملک کو بیانہ اور گوالیار جانا پڑا خود خضر خان کو بھی قلعہ ناگور کی طرف سفر کرنا پڑا کیونکہ سلطان احمد شاہ گجراتی نے وہاں محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر یہ گوالیار گیا قلعہ تو فتح نہ ہو لیکن وہاں نے راجہ سے خراج وصول کرکے بیانہ گیا اور یہاں کے حاکم شمس خان اوحدی کو زیر کیا۔

۱۴۱۷ء/۸۲۰ھ میں ملک طغانی اور ترکوں کی جماعت نے بغاوت کی اور سرہند کا محاصرہ کر لیا۔ خضر خان نے زیرک خان سمانہ کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے مامور کیا۔ ملک طغانی نے اطاعت قبول کی۔ اور جالندھر اس کے سپرد کیا گیا ۱۴۱۸ء/۸۲۱ھ میں راجہ کیٹھر نے بغاوت کی تاج الملک نے اسے زیر کیا اور اٹاوہ کو تاخت کرتے ہوئے دہلی واپس آیا۔ ۸۲۲ھ میں خود خضر خان کو کیٹھر کی طرف جانا پڑا اور اس نواح کے باغیوں کو زیر کرکے بدایوں کی طرف متوجہ ہوا مہابت خان حاکم بدایوں قلعہ بند ہو گیا۔ خضر خان نے محاصرہ کیا اور چھ ماہ تک یہیں پڑا رہا۔ قلعہ فتح ہونے کے قریب تھا کہ دہلی میں شورش ہونے کی خبر معلوم ہوئی اور مجبوراً واپس جانا پڑا اس کے بعد معلوم ہوا کہ ایک شخص نے جو اپنے کو سارنگ خان کہتا ہے۔ خروج کرکے اقطاع جالندھر

Marfat.com

میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ بمشکل تمام اس کا فتنہ بھی فرو ہوا۔

۲۱۔ ۱۴۲۱ء ۸۲۴ھ میں خضر خان نے میوات کو زیر کیا اور گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں سے خراج لے کر اوٹاوہ پہنچا اور یہیں بیمار ہو گیا[1] چنانچہ اسی حال میں دہلی واپس آیا اور ۱۷ جمادی الاول ۸۲۴ھ مئی ۱۴۲۱ء کو مر گیا۔ تاج الملک کا انتقال اس سے چار ماہ قبل محرم میں ہو چکا تھا۔

خضر خان نے اپنی وفات سے تین دن قبل اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ۱۹ جمادی الاول ۸۲۴ھ کو تخت نشین ہوا۔

اسی سال شیخا کھوکر کے بھائی جسرت اور طغار رئیس نے بغاوت کی اور یہ شورش اس حد تک بڑھی کہ خود مبارک شاہ کو سفر کرنا پڑا۔ اس جنگ میں جسرت کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ گیا لاہور بالکل ویران ہو گیا تھا۔ اس لئے کچھ عرصہ قیام کر کے اس کو آباد کیا۔ عمارات بنوائیں اور پھر دہلی واپس آیا۔

۲۳۔ ۱۴۲۳ء ۸۲۶ھ میں کیتھرہ (روہیل کھنڈ) کی طرف فوج کشی کی اور خراج وصول کیا۔ مہابت خان حاکم بداؤں نے بھی حاضر ہو کر معافی چاہی۔ اسی سال بیانہ میں بدامنی پھیلی اور مبارک شاہ نے اس کو فرو کیا۔

۲۵۔ ۱۴۲۵ء ۸۲۹ھ میں میواتیوں نے شورش برپا کی اور لشکر شاہی اس طرف روانہ کیا گیا۔ ابراہیم شاہ شرقی کی مبارک شاہ سے برہان آباد ضلع اٹاوہ کے میدان میں جنگ ہوئی، لیکن ابراہیم شاہ شرقی جونپور خائف ہو کر چلا گیا اور ۱۴۲۸ء ۸۳۱ھ میں مبارک شاہ کامیاب دہلی واپس آیا۔

۲۹۔ ۳۰۔ ۱۴۲۹ء ۸۳۲ھ میں فولاد غلام نے سرہند میں سر اٹھایا اور مسلسل چار سال تک مبارک شاہ اس کے پیچھے سرگرداں رہا۔ آخر کار ۱۴۳۳ء ۸۳۷ھ میں جو مبارک شاہ کا آخری سال تھا۔ فولاد غلام مارا گیا۔ اور بمشکل تمام پنجاب کی شورش عارضی صورت سے رفع ہوئی۔

مبارک شاہ اپنے خصائل کے لحاظ سے نیک طینت کریم النفس شخص تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اپنی فوج کے ساتھ جا کر دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور حد درجہ دلیر و شجاع تھا۔ جو بدامنی اور خرابی پہلے سے چلی آ رہی تھی۔ وہی اس کے عہد میں بھی قائم رہی جونپور اور مالوہ کے صوبوں کی جو سیاسی اہمیت ہو چکی تھی۔ اس نے مبارک شاہ کو اس قدر تکلیف نہیں پہنچائی جس قدر اقطاع پنجاب نے جہاں اس کا باپ خضر خان سلطنت دہلی حاصل کرنے کے لئے دولت خان لودھی کے خلاف روانہ ہوا تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ صد ۸۶۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ محمد بن سام کے جانشینوں کا متبرک پایہ تخت پہلے ہندوستان میں اپنا اقتدار کھو چکا تھا۔ اور تیمور کے حملہ نے تو ایسی کاری ضرب لگائی کہ رہی سہی بادشاہوں کی جو عزت ہندوستانی آبادی کے دل میں مرتسم تھی وہ دفعتہً زائل ہو گئی۔

کیٹھر کے ہندو زمینداروں نے اس کے عہد میں بغاوت کی دہلی کے جنوب میں جو ایک حصہ ملک نصف دائرہ کی صورت میں مختلف جاگیرداروں راجاؤں اور امرا کے قبضہ میں تھا اس نے سر اٹھایا۔ مبارک شاہ نے ان کو دبایا خراج وصول کیا عارضی طور پر وہ مطیع ہو گئے اور پھر سرکشی اختیار کی۔ الغرض یہی مدوجزر قائم رہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف پنجاب کے گکھڑوں یا کھوکھروں سے پہنچی جن پر حقیقت یہ ہے کہ تیمور کو بھی برائے نام فتح حاصل ہوئی تھی اور ان تاتاری حملوں سے جو شاہ رخ سے گورنر کابل کی امداد سے فولادنے پے در پے پنجاب میں جاری رکھے اور ان کی شازشوں سے خود دہلی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

مبارک شاہ اپنے نئے شہر مبارک آباد کی مسجد میں تھا کہ خود اس کے وزیر سرور الملک کے اشارہ سے ہندوؤں نے اسے قتل کر ڈالا تاریخ وفات مصنف مبارک شاہی نے ۹ رجب ۸۳۷ھ (۱۹ر جنوری ۱۴۳۴ء) تحریر کی ہے۔

مبارک شاہ کے قتل ہوتے ہی چند گھنٹے بعد مکار وزیر (سرور الملک) نے محمد شاہ کو جو خضر خان کا پوتا، فرید خاں کا بیٹا اور مبارک شاہ کا متبنیٰ تھا۔ تخت نشین کر دیا اور چونکہ یہ تخت نشینی بالکل برائے نام تھی اور وزیر خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ اور بڑی بڑی جاگیریں اپنے ہی آدمیوں کو تقسیم کیں اور امرأ مبارک شاہ میں سے بعض کو قتل اور بعض کو مقید کر دیا۔ چونکہ سرور الملک (جسے اب خان جہان کا خطاب مل گیا تھا) کی دغابازی اور مکاری کا حال سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے ان امرائے نے جو خضر خان کے ممنون تھے۔ سرور الملک کی مخالفت شروع کر دی اس نے اپنے خاص سرداروں کو مخالف امرا کے مقابلہ میں روانہ کیا انہیں میں ایک کمال الملک بھی تھا۔ جو درپردہ سرور الملک کا سخت دشمن اور مبارک شاہ اپنے آقا کے خون کا بدلہ اس سے لینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ برن (بلند شہر) پہنچے تو کمال الملک کے ساتھی امرأ کو معلوم ہوا کہ یہ خود ہمارا ہی دشمن ہے۔ اس لئے انہوں نے سرور الملک کو اس کی اطلاع دی۔ سرور الملک نے اس کا انسداد کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور اسی اثنائ میں کمال الملک نے ملک الہ داد وغیرہ موافق امرار کو ساتھ لے کر دہلی کا رخ کیا اور قلعہ سری کو

Marfat.com

تصور کرلیا۔ یہ محاصرہ تین ماہ تک قائم رہا۔ بادشاہ کو بھی سارے حالات معلوم ہو چکے تھے۔ اس لئے اس نے سرور الملک کو جب کہ وہ خود بادشاہ کے قتل کی فکر میں تھا ہلاک کرا دیا اور اس کے ساتھیوں کو بھی عبرتناک سزائیں دیں۔ اب محمد شاہ کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے تئیں خود مختار بادشاہ سمجھا اس کے بعد ۸۴۴ھ میں بادشاہ سامانہ گیا اور وہاں کے گکھڑوں کے خلاف ایک فوج روانہ کی جو تاخت و تاراج کے بعد واپس آئی۔

محمد شاہ نے ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر کچھ دنوں تک انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی۔ لیکن پھر عیش وعشرت میں مشغول ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پھر وہی بدامنی شروع ہو گئی اور قرب وجوار کے خود مختار فرمانرواؤں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ابراہیم شاہ شرقی (جونپور) نے بہت سے اضلاع کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ مالوہ کے فرمانروا محمود خلجی کی جرأت تو اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے خود دہلی پر حملہ کیا ان مصائب سے آزاد ہونے کے لئے محمد شاہ نے بہلول لودھی کو طلب کیا جو لاہور اور سرہند کا گورنر (حقیقتاً وہاں کا حکمران) اس کی مدد سے یہ خطرات اس وقت دور ہو گئے۔ بادشاہ نے بہلول لودھی کو اپنا بیٹا بنایا اور خان خاناں کا خطاب دیا۔ ہر چند اس کے بعد اسی بہلول نے خود محمد شاہ کو معزول کرنے کی غرض سے دہلی پر حملہ کیا۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

محمد شاہ بن فرید خان ۸۴۷ھ میں اپنی طبعی موت سے مرا، محمد شاہ کے بعد تمام امراء نے سوائے بہلول لودھی کے علاء الدین کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسے دہلی کا حکمران تسلیم کیا لیکن اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی عادت و اطوار سے ظاہر کر دیا کہ اس میں حکمرانی کی اہلیت بالکل نہیں ہے۔ اس وقت دہلی کی تفریق اور انتشار کی یہ حالت تھی کہ

۱۔ دکن گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال کے گورنر خود مختار بادشاہ تھے۔ اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ انہوں نے جاری کر رکھا تھا۔

۲۔ پنجاب میں پانی پت سے لاہور، دیپال پور اور سرہند تک بہلول لودھی کی حکومت تھی۔

۳۔ مہرولی اور میوات میں (دلی سے سات کوس تک) احمد خان میواتی قابض تھا۔

۴۔ سنبھل سے حدود دہلی تک دریا خان لودھی کی فرماں روائی تھی۔

۵۔ کمپلا اور پٹیالی میں پرتاب سنگھ کی حکومت تھی۔

۶۔ بیانہ میں داؤد خان لودھی کا تصرف تھا۔

Marfat.com

۷۔ گوالیار و دھولپور، بھدورا میں جدا جدا راجہ فرمانروا تھے۔

۸۔ راپری اور اس کے مضافات میں قطب خاں افغان حکمران تھا۔

چنانچہ تاریخ خان جہاں لودھی میں لکھا ہے۔ کہ اس وقت علاءالدین کی سلطنت کے متعلق عام طور پر یہ فقرہ ضرب المثل تھا کہ "بادشاہی شاہ عالم از دہلی تا پالم" الغرض دہلی کے حدود یہ رہ گئے تھے کہ ایک جانب صرف ایک میل اور باقی اطراف میں ۱۲ میل سے زائد زمین نہ تھی۔ پھر اس کے ساتھ یہ طرہ کہ بادشاہ کو بدایوں کی آب و ہوا زیادہ اچھی معلوم ہوئی اور دارالحکومت اس کو بنانا چاہا۔ ہرچند امراء نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور باوجود اس کے کہ اس اثنا میں دوبارہ بہلول لودھی حملہ کر چکا تھا (ہرچند وہ حملے کامیاب نہ ہوئے) بادشاہ نے اپنا عزم پورا کیا اور دہلی میں اپنے دو سالوں کو حکومت سپرد کر کے بدایوں چلا گیا۔ یہ پہلی غلطی علاءالدین کی تھی دوسری حماقت یہ ہوئی کہ اس نے اپنے وزیر حمید خاں کو دشمنوں کے کہنے سے مقید کر لیا جو بعد میں بدایوں سے بھاگ کر دہلی آ گیا۔ اس نے علاءالدین سے انتقام لینے کے لئے بہلول لودھی کو دہلی میں آنے کی دعوت دی۔ یہ پہلے ہی سے تیار تھا۔ فوراً دہلی آ گیا اور قبضہ کر لیا لیکن علاءالدین کا نام خطبہ اور سکے بدستور جاری رکھے۔ بعد میں جب اس کا پورا اقتدار قائم ہو گیا تو اس نے حمید خاں کو قید کر کے علاءالدین کو اطلاع دی۔ بادشاہ نے لکھ بھیجا کہ میرے باپ نے تمہیں بیٹا بنایا تھا۔ اس لئے تم میرے بھائی ہو۔ دہلی کی سلطنت میں تمہیں دیتا ہوں اور خود بدایوں پر قناعت کرتا ہوں اس کے بعد ۸۵۵ھ میں اس نے خطبہ سے علاؤالدین کا نام خارج کرا دیا اور چتر شاہی سر پہ رکھ کر دہلی کا بادشاہ ہو گیا۔

علاءالدین بدایوں میں ۸۸۳ھ تک زندہ رہا۔ اس نے دہلی میں سات سال چھ ماہ تک حکومت کی اور بدایوں ۲۸ سال تک اس کے ساتھ ہی سید خاندان کی حکومت کا دور ختم ہو گیا اور بہلول لودھی کے وقت سے دہلی کے تخت پر ایک اور جدید خاندان نظر آئے گا۔ جسے خاندان لودھی کہتے ہیں [1]

سید خاندان کا تاریخِ ہند میں مقام

سادات خاندان کو تاریخ ہند میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں ہے اس کے چار بادشاہ اکیس سال تک حکمران رہے اس تمام عرصہ میں

Marfat.com

میں وہ بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کرنے میں مصروف رہے امیر تیمور کے حملے نے ہندوستان کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے تباہ کر دیا تھا۔ ان تمام حالات میں کوئی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا حکمران بھی اس قابلیت کا نہیں گزرا جو بگڑے ہوئے حالات کو صحیح کر سکتا۔ مزید براں سادات حکمرانوں کے عہد میں ہر جگہ بغاوتوں نے سر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اس خاندان کا آخری فرماں روا سلطان علاؤالدین تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح ناکارہ اور راحت پسند تھا۔ ایک مرتبہ بدایوں گیا۔ تو وہاں کی آب و ہوا اس قدر مرغوب طبع ہوئی کہ وہیں مستقل سکونت کا ارادہ کر لیا۔ حالانکہ یہاں دہلی میں سخت بد امنی پھیلی ہوئی تھی اس کے علاوہ دہلی حکومت کا رقبہ سمٹتے سمٹتے بہت ہی مختصر رہ گیا تھا۔ ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ بہلول لودھی جو پنجاب کا گورنر تھا دہلی پہنچ کر شہر پر قابض ہو گیا اور اس نے علاءالدین کو بدایوں لکھا کہ میں نے دہلی آکر یہاں کے تمام بگڑے ہوئے کام سنوار دیئے ہیں اور خطبہ سے آپ کا نام نہیں نکالا۔ علاءالدین نے جواب دیا "میرے باپ نے تم کو بیٹا بنایا تھا۔ اور میں تم کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ اب میں دہلی کی سلطنت بخوشی تمہارے حوالے کرتا ہوں اور خود بدایوں میں قناعت کرتا ہوں" [۱] تو اس قسم کے سادات خاندان کے راحت پسند حکمران تاریخ میں کوئی خاص رول ادا نہیں کر پاتے۔ اس وجہ سے تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سادات خاندان کو تاریخ ہند میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں۔

---

[۱] یہ بیان فرشتہ کا ہے۔ بدایونی اور طبقات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا (اسلامی ہندما تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۱۲۳

Marfat.com

لودھی خاندان

س :۔ لودھی کون تھے اور سلطان بہلول لودھی کے حالات زندگی اور عہد حکومت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟

فرشتہ نے بہلول کے خاندانی حالات کی صراحت کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ لودھی افغانوں کی ایک جماعت تھی جو ہندوستان میں بہ سلسلہ تجارت آمد و رفت رکھتی تھی۔ بہلول کا دادا ملک بہرام فیروز شاہ کے عہد میں ملتان آیا تھا۔ اور یہاں کے حاکم مردان دولت کا ملازم ہوگیا اس کے پانچ بیٹے ملک سلطان شہ، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد، ملک خواجہ بھی اس کے ہمراہ تھے جب ملتان کا حاکم خضر خان ہوا۔ تو ملک شہ اس کا ملازم ہوگیا۔ اس نے خضر خان کی طرف سے ملو اقبال کے خلاف جنگ کی اور اس کو قتل کر دیا۔ اس صلہ میں خضر خان نے اسلام خان کا خطاب دے کر سرہند کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔

ملک شہ کا بڑا بھائی ملک کالا، جو دوراله کا حاکم تھا ایک جنگ میں مارا گیا۔ لیکن اس کی بیوی حاملہ تھی، وضع کے دن قریب تھے کہ اتفاق سے ایک مکان کی چھت گر پڑی۔ وہ تو مر گئی لیکن بچہ زندہ رہا۔ جو اس وقت ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا۔ وہ یتیم فرزند (ملو جس) کی قسمت میں آئندہ بہلول لودھی ہونا لکھا تھا۔

اس بچہ کی تربیت اس کے چچا اسلام خان نے کی۔ جب بہلول جوان ہوا تو اسلام خان اس کی خدمات سے اس قدر خوش ہوا کہ اپنی بیٹی اس سے منسوب کر دی اور اپنے بعد اس کو جانشین کر گیا اسلام خان کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بارہ ہزار افغانی سپاہیوں کو وہ اپنے پاس سے تنخواہ دیتا تھا ہر چند اسلام خان کے بعد اس کے بھائی (ملک فیروز) اور بیٹے (قطب خان) نے بہلول کا مقابلہ کیا۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئے اور بہلول کا اقتدار بڑھتا گیا۔[1]

بہلول لودھی سلطنت دہلی حاصل کرنے کے لئے عرصہ سے بے تاب تھا اور اس نے متواتر حملے بھی

---

[1] :۔ فرشتہ ص نمبر ۱۷۳

Marfat.com

اس نے کیے تھے۔ چنانچہ جب حمید خان وزیر نے اس کو بلایا تو وہ فوراً چلا گیا اور وہاں حمید خان کو قید کر کے ۱۴۵۱ء / ۸۵۵ھ میں خود مختار بادشاہ بن گیا۔

بہلول لودھی کو سلطنت دہلی جس حال میں ملی تھی۔ وہ نہایت ہی ابتر تھی۔ تمام صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور حکومت دہلی گویا صرف شہر دہلی سے تعبیر کی جاتی تھی۔ لیکن باوجود اس بدامنی و انتشار کے بہلول لودھی نے جس قابلیت اور عزم و ثبات سے ایک مٹی ہوئی سلطنت کا اقتدار دوبارہ قائم کیا وہ تاریخ کا حیرت ناک واقعہ ہے۔ بہلول لودھی نے ۳۸ سال تک حکومت کی اور اس طویل زمانہ میں ایک بار بھی اس نے کسی ایسے طرز عمل کو پیش نہیں کیا جو شاہانہ عزائم و ملوکانہ خصائل کے منافی ہوتا۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے پنجاب کی طرف توجہ کی اور دہلی کا انتظام اپنے بیٹے بایزید اور دیگر امرا کے سپرد کر کے دیپال پور کی طرف روانہ ہوا۔ محمود شاہ فرمانروائے جونپور نے اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنی بیوی کے اصرار پر (جو علاء الدین سید خاندان کے آخری حکمران کی بیٹی تھی) دہلی پر حملہ کر دیا۔ بہلول یہ خبر سنکر پنجاب سے دہلی آیا۔ افغانوں کی ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ اطراف پنجاب سے فراہم کر لایا۔ ہر چند اس مقابلہ میں محمود شاہ کو شکست ہوئی اور وہ جونپور چلا گیا لیکن بعد میں مسلسل ۲۶ سال تک بہلول لودھی اور فرمانروایان جونپور کے درمیان آتش جنگ مشتعل رہی اور آخر کار بہلول لودھی نے ۸۹۳ھ / ۱۴۷۸ء میں سلطنت جونپور کی جداگانہ ہستی کو ہمیشہ کے لیے سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور حسین شاہ شرقی کو (جو سلطنت جونپور کا آخری فرمانروا تھا) ایسی سخت شکست دی کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکا۔

ہر چند جونپور کے لیے اسے بہت کوشش کرنی پڑی۔ اور تمام وقت اس میں صرف ہو گیا۔ لیکن وہ سلطنت کے دیگر اقطاع سے بھی غافل نہیں رہا۔ اس نے تمام ملک کا دورہ کیا اور اپنے حسن تدبیر سے سلطنت دہلی میں پھر وسعت پیدا کر دی۔ میوات جا کر اس نے احمد خان حاکم میوات کو اطاعت پر مجبور کیا اور سات پرگنے اس سے نکال کر دہلی میں شامل کر لئے اسی طرح بلند شہر میں جا کر دریا خان لودھی حاکم سنبھل سے سات پرگنے لے لئے یہاں سے فارغ ہو کر دوسرے علاقوں کا رخ کیا اور عیسیٰ خان سابق حاکم کو اپنی جگہ بحال کر کے برہان آباد میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ پھر راجہ پرتاب سنگھ کو زیر کر کے صرف بھوگاؤں اس کی جاگیر میں رکھا اور باقی سب مقامات سلطنت دہلی میں شامل کر لئے یہاں سے مل کر قلعہ رابری اور چندوار کو فتح کیا اور اٹاوہ کے حاکم کو بھی مطیع بنا لیا۔

علاوہ اس کے حسب روایت تاریخ سلاطین افاغنہ اس نے رانا اودے پور کو بھی شکست

Marfat.com

دے کر تمام اقطاع اجمیر پر قبضہ کر لیا اور سندھ میں احمد خان کو شکست دے کر حدود سلطنت کوہ ہان تک وسیع کر لیا۔

الغرض ۳۸ سال کے اندر بہلول لودھی نے گڑھ برائچ، لکھنؤ، کالپی، بدایوں، دوابہ کا تمام حصہ اٹاوہ گوالیار، سندھ، اودے پور، سنبھل، پٹیوت، کول (علی گڑھ) برہان آباد کو پھر سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور پنجاب میں بھی وہی اقتدار قائم کر دیا۔ جو اس سے قبل کسی وقت پایا جاتا تھا۔

یقیناً یہ امر حیرت ناک معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مردہ سلطنت میں کیونکر بہلول لودھی پھر نئی روح پھونک سکا۔ لیکن اس کا جواب صرف اس کے خصائل کے بیان سے دیا جا سکتا ہے۔ جنہیں صاحب تاریخ داؤدی نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہلول لودھی مذہب کا سخت پابند اور بے انتہا سخی و شجاع بادشاہ تھا۔ رحم و رافت اس کی فطرت تھی اور احکام شرع کی پابندی اس کا نصب العین وہ اکثر علماء و مشائخ کو اپنی صحبت میں رکھتا اور غرباء و مساکین کے حالات ہمیشہ تحقیق کرتا رہتا اس نے کبھی کسی سائل کو محروم نہیں کیا۔

وہ پانچ وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتا اور لوگوں کی شکایتیں خود سن کر فیصلہ کیا کرتا تھا۔ وہ بے انتہا دانشمند تھا اور حد درجہ غور و تامل تلطف و مہربانی سے کام لے کر انصاف کرتا تھا جو کچھ اسباب وغیرہ اسے ملتا وہ سب فوج میں تقسیم کر دیتا تھا اور خود صرف خشک روٹی پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دوستانہ صحبتوں میں وہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ روساء کو اپنے سامنے کھڑا رہنے دیتا۔ وہ سب کو اپنے برابر جگہ دیتا اور اگر کوئی امیر ناراض ہو جاتا تو اس کے خوش کرنے کے لئے بعض اوقات یہاں تک ایثار سے کام لیتا کہ اس کے قدموں پر پگڑی تک ڈال دیتا اس کی تخت نشینی سے پہلے دہلی کے پٹھانوں میں یہ رسم تھی کہ مردہ کے سوم میں مٹھائی شربت اور پان وغیرہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس نے اس رسم کو بالکل ممنوع قرار دیا کیونکہ اس رسم میں فضول مصارف ہوتے تھے۔

اس کے ضبط کی عجیب و غریب شان وہ تھی جب ایک دن جامع مسجد کے اندر ایک ملا نے اس کو اور اس کے خاندان والوں کو صاف طور پر ذریات شیطان سے تعبیر کیا تھا اور اس نے ہنس کر صرف یہ کہا کہ "ملا صاحب ہم سب بندگان خدا ہیں" تعمیرات کا بھی اسے شوق تھا، لیکن اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ تاہم اگر یہ جدید تحقیق صحیح ہے کہ آگرہ کی بنیاد اس نے رکھی

Marfat.com

تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لحاظ سے بھی اس نے اپنے آپ کو غیر فانی بنا دیا۔ لیکن تمام مورخین آگرہ کی بنیاد سکندر لودھی سے منسوب کرتے ہیں ماثر رحیمی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے متعدد مدارس بھی قائم کئے بہلولی سکہ جو پیسہ کے قائم مقام رائج ہوا اسی کی یادگار ہے۔

اٹاوہ کی مہم سے فارغ ہو کر دہلی آرہا تھا۔ راستہ میں بیمار ہوا۔ اور بھداولی (ضلع سکیت) میں پہنچ کر ۱۴۸۸ء ۸۹۴ھ میں مر گیا[1] اس نے ۳۸ سال ۸ ماہ ۸ روز حکومت کی۔

بہلول لودھی نے اپنی وفات سے پہلے ہی نظام خان کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ اس لئے وہ تھوڑی سی مخالفت کے بعد سلطان سکندر کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہو گیا۔

س ۹۔ سکندر لودھی کے عہد حکومت کے اہم واقعات اختصار کے ساتھ بیان کیجئے۔ نیز یہ بھی بتایئے کہ سلطنت دہلی کو مضبوط کرنے کے لئے اس نے کیا خدمات سرانجام دیں۔

اہم واقعات

سکندر لودھی کو اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اپنے چچا عالم خان کے خلاف چڑھائی کرنی پڑی۔ باغی جاگیردار نے فرار ہو کر پٹیالی میں پناہ لی۔ سکندر نے اس کی جاگیر کو خان خانان لوہانی کو دے دیا اور خود اٹاوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں پر کئی مہینے قیام کر کے گردو نواح کے علاقہ کا نظم و نسق درست کیا۔

جونپور سے جنگ

سکندر نے باربک شاہ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ دہلی کا اقتدار تسلیم کرے باربک نے یہ تجویز مسترد کر دی اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دونوں بھائیوں کی فوجیں قنوج کے قریب ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئیں اور دونوں میں جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں باربک شاہ کو شکست ہوئی اور اس کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ وہ بدایوں میں پناہ گزیں ہوا

---

[1] منتخب صفحہ ۸۳

Marfat.com

لیکن ایک قلیل المدت محاصرہ کے بعد اس کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ سکندر نے اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا اور جونپور کے تخت پر اس کو دوبارہ متمکن کر دیا لیکن بہ نظر احتیاط اس نے اپنے اطاعت گزیں جاگیر دار وہاں بھیج دیئے۔

جونپور میں ان انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد سلطان کالپی کی طرف روانہ ہوا۔ جس پر اس کا بھتیجہ ہمایوں بطور جاگیر دار قابض تھا۔ اس نے اس شہزادہ کو اس جاگیر کے قبضہ سے بے دخل کر دیا اور محمد خان لودھی کو یہ جاگیر عطا کر دی۔ اس کے بعد گوالیار کے راجہ کرت سنگھ کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس کو اپنے قلعہ پر دہلی کے باجگذار کی حیثیت سے قابض رہنے کی اجازت دی گئی۔ سلطان نے بیانہ کے باغی سردار شرف بن احمد جلوانی کو اس کے قلعہ میں محصور کر دیا حتیٰ کہ اس نے اطاعت قبول کر لی، سلطان نے یہ اہم جاگیر جس میں آگرہ بھی شامل تھا خان خاناں کے سپرد کی اور خود ۱۴۹۲ء میں کسی تاریخ کو دہلی واپس آ گیا۔

اس کو دہلی آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ جونپور میں زمین داروں کی بغاوت کی پریشان کن خبر موصول ہوئی۔ اس کو پھر اپنا دارالحکومت چھوڑ کر اس طرف روانہ ہونا پڑا۔ باغیوں نے ایک لاکھ پیدل اور سواروں کی جرار فوج جمع کر لی تھی۔

اور کڑہ کے صوبے دار مبارک خان کو نکال باہر کیا تھا۔ باربک اس خوفناک بغاوت کو فرو کرنے کے قطعی ناقابل تھا۔ وہ دارالسلطنت چھوڑ کر گنگا کے کنارے اپنے بھائی سے جا ملا۔ سکندر باغیوں کو شکست دے کر ان کو منتشر کر دیا اور جون پور پہنچ کر اپنے بھائی کو پھر تخت پر متمکن کر دیا لیکن اس کو جلد ہی پھر واپس آنا پڑا کیونکہ زمین داروں نے پھر بغاوت کر دی تھی اور باربک ان کی خاطر خواہ سرکوبی کرنے میں ناکامیاب ہوا تھا۔ سکندر نے اپنے بھائی کے خلاف فوری اقدام کیا اور اس کو قید کر کے ہیبت خان اور عمر خان شیروانی کی نگرانی میں دے دیا لیکن اس مہم میں جو اس کو کثیر نقصانات برداشت کرنے پڑے ان کی وجہ سے جونپور کے زمین داروں کی ہمت افزائی ہوئی اور وہ حسین شاہ کو جو بہار میں حکمرانی کر رہا تھا۔ یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ ان سے آن ملے۔ اور اپنے بزرگوں کا تخت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ حسین شاہ نے یہ تجویز مان لی اور جس قدر فوج جمع کر سکتا تھا۔ جمع کر کے یہاں سے چل پڑا۔ دونوں فوجیں بنارس کے قریب ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئیں اور ایک خونریز جنگ وقوع میں آئی۔ حسین شاہ کو شکست ہوئی اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ اس کا تعاقب کیا گیا اور یہاں سے اس کو نکال دیا گیا۔ صوبہ بہار کو سکندر کا اس طرح

Marfat.com

اپنی سلطنت میں شامل کر لینا بنگال کے قابل حاکم علاؤالدین حسین کو بہت گراں گزرا وہ اس صوبہ کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ اور وہ اپنی حدود سلطنت میں اس خلل اندازی سے بہت برہم ہوا۔ لیکن ہر دو فریق میں سے کوئی بھی جنگ وجدال پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے ایک صلح نامہ عمل میں آگیا، جس کی رو سے دونوں بادشاہ اس پر متفق ہوگئے کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے علاقے پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کرے گا۔

سکندر اور اس کے افغان امرائ

سکندر بہار سے فارغ ہوکر جونپور پہنچا یہاں اس نے افغان سرداروں کی موثر طریقہ پر سرکوبی کی۔ ان سرداروں نے اپنی جسارت اور ناعاقبت اندیشیوں سے اس کو ناخوش کر رکھا تھا۔ انہوں نے سلطان کے خلاف سازش کی اور اس کے چھوٹے بھائی فتح خان کو اپنا شریک کار بنانے کی کوشش کی اس شہزادے کی ماں نے اس کو مشورہ دیکر سارا معاملہ سلطان پر ظاہر کر دے۔ سلطان نے ان سازش کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں اور اپنے دربار سے نکال دیا، جونپور سے روانہ ہوگیا اور کئی سال تک سنبھل میں قیام پذیر رہا۔ تاکہ وہاں کی آب وہوا سے بہرہ انداز ہو اور اس علاقہ کے گرد و نواح کا انتظام اور نظم ونسق بھی درست کر دے۔ اس زمانے میں بھی اس کو کئی بغاوتوں کی بیخ کنی کرنی پڑی۔ دہلی کے صوبہ دار نے دارالحکومت کے سلطان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور بغاوت برپا کر دی لیکن مچھی واڑہ کے صوبیدار خواص خان نے اس کو شکست دی۔

۱۵۰۲ء میں سلطان کو دھول پور اور گوالیار کے سرداروں کے خلاف چڑھائی کرنی تھی۔ جن کے باغیانہ عزائم اس پر بخوبی ثابت ہو چکے تھے۔ اس نے دھولپور پر قبضہ کیا اور گوالیار کے خلاف حملہ شروع کیا۔ لیکن وہاں کے راجہ سے ایک عارضی صلح کرکے واپس ہوگیا۔ ۱۵۰۴ء میں اس نے اپنا دارالسلطنت آگرہ کو منتقل کیا اور ایک بڑے شہر کی بنیاد ڈالی، اس میں کوئی شک نہیں کہ سکندر نے وسط ہند کے سرداروں کو محکوم بنانے کی غرض سے اپنا دارالسلطنت آگرہ منتقل کیا تھا۔ ۱۵۰۵ء میں اس نے گوالیار کے خلاف فوجی نقل وحرکت شروع کر دی اور منڈرائل کے مضبوط قلعہ پر قابض ہوگیا اور دھولپور کی جاگیر ایک مسلمان کے سپرد کی۔ دوسرے سال دریائے چمبل کے کنارے ایک لڑائی میں گوالیار کے راجہ مان سنگھ کو شکست دی اور آنگیر کے قلعہ پر

Marfat.com

حملہ کرکے فتح کر لیا اس کا اہم مقام جس پر سلطان نے قبضہ کیا، نروا تھا۔ یہاں طویل زمانہ تک سخت مقابلہ جاری رہا۔ یہ مقام سلطان کے ہاتھ آنے سے اس کے گرد و نواح کے دوسرے قصبات پر قبضہ کرنا آسان ہو گیا۔ ۱۵۰۹ء میں محمد خان نے جو ناگور کے ایک مختصر با جگذار علاقہ پر قابض تھا۔ سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور اس کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا۔

سلطنت دہلی کو مضبوط کرنے کے لئے چند اہم اقدام

(۱) گذشتہ تقریباً ایک صدی سے سلطنت دہلی کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا سامنا تھا۔ سید خاندان نے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کی۔ بہلول لودھی نے کافی حد تک اس کا وقار بحال کرایا۔ اب اصل کام سکندر لودھی کے دور میں ہوا۔ اسے اپنے بھائیوں کے عزائم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سب سے پہلے اس نے ایک بھائی عالم خان حاکم راپری کی بغاوت کو کچلا۔ اس کا دوسرا بھائی بار بک شاہ حاکم جونپور زیادہ خطرناک تھا۔ سکندر لودھی نے اسے بھی شکست دی۔ اب وہ لودھی خاندان کا مسلمہ راہنما بن گیا حسین شاہ شرقی کو بنارس کے قریب شکست دی۔ پھر صوبہ بہار پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، کالپی، بیانہ، گوالیار، دھول پور، چندیری کو فتح کیا گیا۔ دہلی سلطنت کا فوجی وقار بحال ہو چکا تھا۔

۲۔ اصلاحی اقدام

i۔ پہلا کام قانون کی عمل داری اور امن کی بحالی تھا۔ اس نے شاہراہوں کو محفوظ بنا کر تاجروں کا اعتماد بحال کر دیا۔

ii۔ دوسرا کام پولیس کی کارکردگی کو بہتر بنانا تھا۔ اس سے بہت سی ڈاک چوکیاں قائم کرکے رسل و رسائل کے نظام کو بھی بہتر بنا دیا۔

iii۔ زراعت و تجارت کی اصلاح کی۔ غلہ کی ترسیل پر پابندیاں اور محصول کردیئے۔

iv۔ جاسوسی کے نظام کو موثر بنایا۔

v۔ آگرہ کی تعمیر کی اور امراء کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

Marfat.com

س ۶:۔ سکندر لودھی کے خصائل و عادات پر مفصل بحث کیجئے۔

خصائل و عادات

سلطان سکندر اپنی ظاہری صورت کے لحاظ سے جس قدر حسین و جمیل[1] تھا اس قدر اس کا باطن پاکیزہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح حد درجہ سادگی پسند تھا۔ اور کبھی شاہانہ تکلف میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا تھا اس کی فطرت نہایت سلیم اور اس کی طبیعت رافت و عطوفت کی طرف از بس مائل تھی۔ وہ خدا سے ڈرتا تھا اور بندگان خدا پر ہمیشہ رحم کرتا تھا۔

جیسا وہ شجاع تھا ویسا ہی عادل بھی تھا۔ انتظام سلطنت، تصفیہ معاملات میں وہ قوی و ضعیف کو برابر سمجھتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ سر مو انصاف سے احتراز نہ ہو۔

بادشاہ ضبط اوقات کا بے انتہا پابند تھا اور جو معمول اس نے اپنے یا کسی اور کے لئے مقرر کر دیا اس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ نماز ظہر ادا کر کے مجلس علماء میں جاتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے حرم سرا میں جاتا اور ایک گھنٹہ وہاں قیام کر کے خلوت خاص میں جاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنتا امور سلطنت کی اصلاح کرتا۔ فرامین تحریر کرتا۔ اور سلاطین ہم عصر کے نام خطوط لکھتا۔ رات کو بہت کم سوتا۔ بڑے جید اور زبردست سترہ عالم خلوت خاص میں اس کے پاس رہتے اور نصف شب تک مذہبی احکام وغیرہ ان سے دریافت کرتا رہتا۔ اس کے بعد کھانا چنا جاتا۔ اس کی ساری عمر گزر گئی لیکن یہ معمول کبھی ترک نہیں ہوا اس کی وضع داری اور پختگی انتظام کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار گرمی کے موسم میں شیخ عبدالغنی جونپوری بادشاہ سے ملنے آئے ان کے لئے جو کھانا آیا۔ اس میں موسم گرما کی وجہ سے شربت کے ۶ شیشے بھی موجود تھے اس کے بعد اتفاق سے شیخ صاحب جاڑوں میں آئے۔ لیکن شربت کے قرابے اب بھی پیش کئے گئے ایک بار وہ جس طرح ایک آدمی سے ملتا پھر عمر گزر جاتی اسی طرح پیش آتا اور اس میں سر مو تفاوت نہ ہوتا۔

---

[1] مصنف تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ اس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا متحیر رہ جاتا۔

Marfat.com

اس کی عدالت اور بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ متدین شخص، سلطنت کا اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خائن شخص ہر وقت لرزاں رہتا تھا۔ اس طرح اس کی دیانت و سیر چشمی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دنیا کی ساری دولت اس کے سامنے رکھ دی جاتی تو وہ خلاف احکام مذہب اس پر نگاہ نہ کرتا۔

جب لشکر کو وہ کسی طرف روانہ کرتا تو دو فرمان لشکر کے نام پہنچتے ایک نماز صبح کے وقت جس میں اور ہدایتیں درج ہوتیں سرایوں میں گھوڑوں کی ڈاک ہر وقت تیار رہتی اگر لشکر ۵۰۰ کوس پر بھی ہوتا تو بھی اس معمول میں فرق نہ آتا ہر روز اس کے سامنے کل اشیا کا نرخ نامہ اور سلطنت کے تمام حالات و واقعات کی رپورٹ پیش ہوتی اور وہ فوراً تحقیقات کا حکم دیتا۔ اگر کوئی نامناسب بات اسے نظر آتی تو اس کی اصلاح کر دی جاتی۔ یہی انتظام تھا کہ اس کے عہد میں غلہ اور تمام زندگی کی ضروری چیزیں ارزاں تھیں اور قلیل آمدنی رکھنے والا بھی فراغت سے زندگی بسر کرتا تھا۔

اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علما بھی صرف مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اور جاسوس متعین تھے۔ جو عدالت کی تمام خبریں روزانہ بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ دریا خاں وکیل کو حکم دیا تھا کہ عدالت کے اندر رات گئے تک بیٹھا رہے۔ کیونکہ ممکن ہے اس وقت کوئی مستغیث آجائے علاوہ اس کے وہ بعض اہم مقدمات کی خود تحقیقات کرتا اور سلطنت کے انتظام پر آپ توجہ کر کے آئین مقرر کرتا اور رعایا کے امن و سکون کی تدابیر ہر وقت سوچا رہتا اس غرض کے لئے اس نے کثرت سے مخبر و جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو رعایا و حکام کے تمام حالات اس تک پہنچاتے تھے اور یہ انتظام اس قدر مکمل تھا۔ لہٰذا اوقات لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سلطان کے قابو میں کوئی جن ہے۔ جو تمام باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے[1]۔ وہ انصاف کرنے میں حد درجہ کاوش کرتا اور خاص فراست و دانائی سے کام لے کر حقیقت تک پہونچتا، چنانچہ طبقات اکبری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ "گوالیار کے دو غریب آدمی بھائی بھائی تھے مفلسی سے تنگ آکر فوج میں شامل ہو گئے۔ ایک لڑائی میں انہیں غارت کے سلسلہ میں دو لعل بھی مل گئے۔ ایک اس دولت پر قانع ہو کر واپس جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصر تھا۔ جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل سپرد کئے کہا کہ میری بیوی کو دے دینا۔ جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دے دیں لیکن لعل نہ دیا۔ جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا اس نے انکار کیا۔ الغرض یہ معاملہ

---

[1] طبقات اکبری صفحہ ۱۷۱

Marfat.com

میاں بھورا[1] تک پہونچا۔ جو دربار سکندر لودھی کے امراء و کبار میں سے تھے۔ اور وہاں کے میر عدل بھی تھے۔ انہوں نے گواہ طلب کئے اور خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کر دیئے اور میاں بھورا نے ان گواہوں پر اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا کہ لعل بیوی سے وصول کر لینا چاہیئے۔ یہ غریب بہت پریشان ہوئی۔ اور سیدھی آگرہ جا کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچی۔ بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ لعل اس عورت کو نہیں دیا گیا۔ لیکن گواہوں کی موجودگی میں وہ کوئی خلاف حکم نہ دے سکتا تھا۔ آخر کار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا کہ جب تمہارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم نے دیکھا تھا۔ یہ سن کر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا دونوں کو دیا اور کہا جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت اور مقدار موم کے ذریعہ ظاہر کرو۔ جب یہ دونوں بنا کر لائے تو ایک کا بنایا ہوا نمونہ دوسرے کے نمونے سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت و صورت سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا اور انہوں نے سارا حال بیان کر دیا، جس سے حقیقت واضح ہوگئی۔[2]

انصاف کے باب میں وہ ضعیف اور قوی کو بالکل برابر سمجھتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا۔ ایک بار کسی سید نے شکایت پیش کی کہ میاں ملک جاگیر دار نے اس سے زمین چھین لی ہے۔ بادشاہ نے میاں بھورہ کو تحقیقات کا حکم دیا لیکن اس مسئلہ میں کچھ ایسے نزاعات پیش آگئے کہ دو ماہ تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے میاں بھورہ کو بلا کر کہا کہ کیوں اب تک فیصلہ نہیں ہو سکا؟ آج اس وقت تک عدالت گاہ سے کوئی نہ جائے۔ جب تک یہ معاملہ طے نہ ہو جائے۔ چنانچہ علماء تین پہر رات گئے تک بیٹھے رہے اور اس وقت بادشاہ کو نتیجہ کی اطلاع دی گئی۔ جو مستغیث کے حق میں تھا۔ بادشاہ نے میاں ملک جاگیر دار کو بلا کر دریافت کیا کہ کیوں تم نے میرے خلاف حکم ظلم کیا اور وظائف داملاک کی زمین تم نے کیوں چھینی۔ میاں ملک نے منفعل ہو کر اعتراف جرم کیا۔ بادشاہ نے اس سے تین بار سب کے سامنے اعتراف کرائے، نادم کیا اور پھر کبھی اس کو کوئی جاگیر نہ دی۔

وہ فطرتاً بے انتہا سیر چشم واقع ہوا تھا ایک بار سنبھل کے ضلع میں کسی شخص کو زمین سے پانچ ہزار اشرفیوں کا دفینہ مل گیا، لیکن میاں قاسم حاکم سنبھل تھا۔ اس نے لے لیا۔ اس نے بادشاہ کی

---

[1] اس نام میں اختلاف ہے بعض مورخین نے بھوہ اور ردجن نے بھورا لکھا ہے۔
[2] طبقات اکبری صفحہ ۱۷۲۔ فرشتہ صفحہ ۱۸۹

Marfat.com

خدمت میں درخواست روانہ کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دفینہ پانے والے کو واپس دیا جائے۔ حاکم سنبھل نے عرض داشت روانہ کی کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

بادشاہ نے ایک فرمان اس کے پاس بھیجا کہ "اے بے وقوف جس نے اس کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے۔ اگر یہ شخص مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا۔ ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے۔

اسی طرح ایک بار اجودھن میں ایک درویش شیخ محمد کے کھیت میں بہت بڑا دفینہ برآمد ہوا۔ اس میں کچھ طلائی برتن ایسے بھی تھے۔ جن پر سکندری مہر ثبت تھی۔ علی خان حاکم لاہور و دیپال پور نے شیخ کو لکھا کہ یہ دفینہ میرے حدود حکومت کے اندر سے برآمد ہوا ہے۔ اس لئے میرے پاس بھیج دو۔ شیخ نے انکار کیا اس پر علی خان نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ جودھن میں شیخ محمد کو شاہی خزانہ دست یاب ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھ دیا کہ "تم کو اس سے کیا واسطہ ہے اور تم کیوں شیخ محمد کے حالات سے اعتنار کرتے ہو"

اس کے بعد شیخ محمد نے کچھ طلائی برتن بادشاہ کی خدمت میں روانہ کئے لیکن اس نے واپس کر دیئے اور کہا کہ تم ہی رکھو بھئی اور تمہیں سب کو خدا کے سامنے اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے"

یہ واقعہ تاریخ سلاطین افاغنہ اور واقعات مشتاقی میں بھی درج ہے۔ اگر وہ کسی کو جاگیر عطا کر دیتا اور پھر کسی سبب سے اس کی آمدنی بڑھ جاتی تو مطلقاً پرواہ نہ کرتا۔ ایک بار اس نے ملک بدرالدین کو وظیفہ سات لاکھ تنکہ مقرر کرکے ایک پرگنہ تفویض کر دیا۔ پہلے ہی سال اس کی آمدنی ۹ لاکھ تنکہ ہوگئی۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "زائد دو لاکھ کی بابت کیا حکم ہے"؟ بادشاہ نے کہا "تم رکھ لو" دوسرے سال گیارہ لاکھ آمدنی ہوئی اور بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا۔ تیسرے سال آمدنی پندرہ لاکھ ہوگئی۔ اس نے پھر عرض کیا بادشاہ نے کہا "جاگیر تمہاری ہے۔ اس لئے اس کی آمدنی بھی صرف تمہاری ہو سکتی ہے۔ مجھ سے کیوں بار بار ذکر کرتے ہو" [۱]

چونکہ بادشاہ کی نیت ایسی اچھی تھی اس لئے تمام امراء و جاگیردار بھی ایسے ہی دیانت دار اور امین تھے۔ جاگیر مقرر کرنے کے بعد وہ کبھی اس میں تغیر نہ کرتا لیکن اس وقت کہ اگر کسی جاگیردار پر کوئی قصور ثابت ہو جاتا تو اس صورت میں اس کی جاگیر لے لیتا لیکن اس کی توقیر و عزت میں کمی نہ کرتا۔

---

[۱] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴-۵۴۷ [۲] رسول اللہ صلعم کی تاریخ رحلت

Marfat.com

وہ حرص وطمع کے جذبات سے بالکل ناواقف تھا اور ہمیشہ جرموں میں جن کا تعلق سلطنت کی آمدنی سے ہوتا۔ بہت نرمی سے کام لیتا۔ جشن عید اور ۱۲ ربیع الاول[1] کو قیدیوں کی فہرست اس کے سامنے پیش کی جاتی اور بقایائے مالگزاری کے سبب سے جتنے لوگ قید ہوتے سب کو رہا کر دیتا۔

مذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلاف شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے چنانچہ اس نے اس سلسلہ میں حکم نافذ کر دیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعود کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے، مولانا اشتیاق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیہ داری اور سیتلا کی پوجا کو بھی اس نے روک دیا تھا۔ اس نے کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک واعظ ایک قاری اور ایک جاروب کش مقرر کیا۔ جن کو ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ موسم سرما میں محتاجوں کو کثرت سے کپڑے اور دشالیں تقسیم کی جاتیں اور ہر جمعہ کو ایک مقررہ رقم غربا کو تقسیم کی جاتی۔ رمضان اور ربیع الاول مہینوں میں مساکین و مستحقین کو بے دریغ روپیہ دیتا۔

اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر شہر شاہی پر سلطنت کے تمام غرباء و مساکین کی فہرست پیش کی جائے۔ جب یہ فہرست پیش ہوتی تو وہ ان کو اس قدر روپیہ دیتا کہ ۶ ماہ کے لئے کافی ہو جاتا۔ علاوہ اس کے مختلف شہروں میں مدخیرات کے متعلق بہت سے مہتمم مقرر تھے۔ جو غریبوں اور محتاجوں کا حال معلوم کر کے بادشاہ تک خبر پہنچاتے اور خزانہ شاہی سے روپیہ لے کر انہیں تقسیم کرتے[2]

چونکہ بادشاہ کی اس طرف بہت توجہ تھی، اس لئے تمام امراء و اراکین، خوانین و ملوک نے بھی غرباء و مساکین کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ اس داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی فقیر مر جاتا تو اس کے پاس سے کافی دولت نکلتی جو اس کے اعزہ کو دی جاتی اور اگر کوئی عزیز نہ ہوتا تو پھر فقراء کو تقسیم کر دی جاتی۔ سکندر شاہ کو مغربی مورخین نے عام طور سے حد درجہ متعصب ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہب اسلام کا پابند تھا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہندوؤں کی رواداری نہیں کرتا تھا۔ بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو عنداللہ حق ہے وہی کیا جائے۔ چنانچہ جس زمانہ میں وہ اپنے بھائی باربک شاہ سے لڑ رہا تھا۔ ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا "فتح تیری ہے۔ بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ الگ کر لیا۔ اور جواب دیا کہ "دعا یہ کرنی چاہیئے کہ اللہ اس کو فتح دے جو حق پر ہے اور وہی ظہور

---

[1] رسول اللہ صلعم کی تاریخ رحلت [2] تاریخ داؤدی (الیسٹ) ۴ - ۴۴۶۔

Marfat.com

میں آئے جو بہتر و مناسب ہو" قبل تخت نشینی کے ایک بار سکندر کو معلوم ہوا کہ تھانیسر میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے ایک تالاب میں ہندو جمع ہو کر اشنان کرتے ہیں۔ اس نے علماء سے استصواب کیا۔ میاں عبداللہ اجودھنی نے جو بڑے جید عالم تھے۔ کہاکہ ہندوؤں کے کسی قدیم معبد کو غارت کرنا یا ان کے کسی مذہبی رسم سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے"

سکندر نے یہ سن کر کچھ نہیں کہا اور اپنے خیال سے باز آگیا[1] وہ ان تمام صفات کے ساتھ علم دوست بھی اس درجہ کا تھا کہ اس کے عہد میں آگرہ (جو اس کا دارالحکومت تھا) علماء وفضلاء مشائخ وصوفیہ، شعراء وادبار کا مرکز ہوگیا تھا۔ فارس وعرب ہند وبخارا کے تمام صاحبان کمال کھینچ کھینچ کر آگرہ چلے آرہے تھے۔ اور بادشاہ کی فیاضیوں سے مالا مال نظر آتے تھے۔

مذہبی مباحث کا اسے بہت شوق تھا اور اکثر علماء کو جمع کر کے وہ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ ایک بار جب بودھن نامی ایک برہمن نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام مذاہب برابر ہیں تو سکندر شاہ نے بہت سے مقتدر علما کو حکم دیا کہ وہ اس سے بحث کریں۔

شعر وسخن کا بھی اسے بہت شوق تھا، گل رخ اس کا تخلص تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔ اور شیخ جمال کنبوہ سے جو بڑے پایہ کا شاعر تھا۔ صلاح لیا کرتا تھا۔ اس کی صحبت میں علماء کے ساتھ شعراء بھی رہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈونگر برہمن بھی تھا۔ جو عربی وفارسی کا عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی اچھا تھا۔

ملائے بدایونی عہد سکندری کے بعض مقتدر علما کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ جب ملتان تباہ ہوا تو دہلی کی طرف آئے اور چالیس علماء (مثلاً جمال خان دہلوی، شیخ لودھی، سید جلال الدین بدایونی وغیرہ)

شیخ عبداللہ کی درس گاہ سے نکل کر اشاعت علوم کا باعث ہوئے۔ ہندوستان میں علوم معقول کا رواج شیخ عبداللہ کے وقت سے ہوا۔ ورنہ اس سے قبل علم منطق وکلام میں صرف شرح شمسیہ وشرح صحائف پڑھائی جاتی تھیں۔

سکندر شاہ مولانا شیخ عبداللہ کا حد درجہ احترام کرتا تھا جب کبھی درس کے وقت پہنچتا تو پوشیدہ طور سے کسی کونہ میں جا کر بیٹھ جاتا تاکہ درس وتدریس میں ہرج واقع نہ ہو۔ جب وہ فارغ

---

[1] تاریخ فرشتہ ۱۸۷ تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴-۴۳۹

Marfat.com

ہو جاتے تو بادشاہ سلام علیک کہہ کر سامنے آ جاتا۔

شیخ عزیز اللہ کے استحضار علوم کا یہ حال تھا کہ مشکل سے مشکل کتاب زبانی پڑھاتے تھے۔
انہیں کے شاگردوں میں میاں قائم سنبھلی تھے۔ اسی عصر کے ایک اور زبردست عالم الہ دیا بھی تھے۔
جنہوں نے ہدایہ کی شرح کئی جلدوں میں تحریر کی ہے۔ علاوہ اس کے تفسیر مدارک پر ان کے حواشی
شرح کافیہ کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ایک بار سلطان سکندر نے تمام علما کو جمع کر کے ایک جانب شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز کو دوسری
جانب شیخ الہ دیا اور ان کے بیٹے بھکاری کو۔ کا مباحثہ سنا اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دونوں تقریر
میں اور یہ دونوں تحریر میں اپنا جواب نہیں رکھتے لے الغرض سکندر شاہ کے دربار میں ہر وقت
علمی چرچہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ فخر اس بادشاہ کو حاصل ہے کہ اس کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں
نے فارسی کی طرف توجہ کی۔ اور مسلمانوں کے علوم حاصل کرنے شروع کیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اور
وہ ایک دوسرے کی زبان کو نہایت شوق سے حاصل کرتے تھے۔ مسٹر بلاک مین کلکتہ ریو
میں ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوؤں نے سولہویں صدی عیسوی سے فارسی کی طرف ایسی توجہ کی کہ ایک صدی
گزرنے سے قبل وہ اس زبان میں مسلمانوں کے برابر ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں
کے تعلقات میں زیادہ اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور دوسرے یہ کہ سکندر لودھی نے قصداً ہندوؤں میں
یہ مذاق پیدا کیا تاکہ انہیں سلطنت میں انتظامی عہدے دیئے جائیں۔ چنانچہ جب فارسی خواں ہندوؤں
کی ضرورت ہوئی تو اس نے پہلے برہمنوں سے درخواست کی کہ فارسی سیکھیں انہوں نے انکار کر دیا
تو چھتریوں سے کہا گیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اہل سیف اہل قلم بننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے
بعد ویش طبقہ کو توجہ دلائی گئی اس نے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے عذر کیا۔ آخر کار کائستھوں نے اسے
قبول کیا اور قلیل زمانہ میں ایسی دست گاہ حاصل کر لی۔ وہ مسلمانوں کو علوم کا درس دینے لگے اور سلطنت
کے بڑے بڑے عہدے ان کو ملے۔

سلطان سکندر کے عہد میں تصانیف کثرت سے ہوئیں۔ جن میں خود بادشاہ اور اس کے امراء
کا ذوق علمی بہت کچھ شامل تھا۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ ادرکرمہا ویدک جو فن طب کے متعلق سنسکرت

لے منتخب التواریخ ۸۶

Marfat.com

کی مشہور کتاب تھی۔ فارسی زبان میں طب سکندری کے نام سے ترجمہ کی گئی اور بعد کو اطبائے ہند نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

بادشاہ کو دیگر فنون وصناعات کے علاوہ جن کے کارخانے کثرت سے قائم تھے۔ موسیقی کا بہت ذوق تھا۔ وہ دربار عام میں تو کبھی گانا سننا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن تنہائی میں اہل موسیقی کو اپنا کمال ظاہر کرنے کی اجازت دیتا اس وقت صرف سید روح اللہ اور سید ابن رسول جو مقربان خصوصی میں سے تھے۔ اس کے خیمہ کے قریب ہوتے اسے ستار اور شہنائی کا بھی شوق تھا۔ جو دربار میں ۹ بجے شب تک بجائی جاتی تھی۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ صرف چار راگنیاں مالی کور، کلیاں، کانڑا اور حسینی بجائی جائیں۔

س :۔ سلطان ابراہیم لودھی پر مختصر نوٹ تحریر کریں۔

سلطان سکندر لودھی نے اپنے دو بیٹے چھوڑے جو حقیقی بھائی ایک ہی ماں کے بطن سے تھے۔ بڑے کا نام ابراہیم تھا اور چھوٹے کا نام جلال خان تھا۔

چونکہ ابراہیم اپنی حسن صفات کی وجہ سے امراء کے طبقہ میں بہت مقبول تھا اور یوں بھی وہ بڑا بیٹا تھا۔ اس لئے دہلی کا فرمانروا بنا۔ ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں ہندوستان کی سلطنت چغتائیہ تیموریہ خاندان میں منتقل کر دی۔

سلطان ابراہیم نے کل نو سال تک سلطنت کی۔ اور اس کے دوران حکومت میں اگر کوئی خاص بات نظر آتی ہے تو وہ غیر معمولی ارزانی ہے۔

مصنف تاریخ داؤدی کا بیان ہے کہ سلطان بہرام کے عہد میں غلہ، کپڑا اور تمام چیزیں ایسی ارزاں تھیں کہ اس سے قبل کبھی نظر نہیں آئیں۔

سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں جو ارزانی تھی وہ جبر و سختی سے پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن ابراہیم کے زمانہ میں پیداوار اس قدر کثرت سے ہوتی تھی کہ لوگ خود ارزاں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔

سکندر لودھی کے عہد میں بھی ارزانی بہت تھی۔ اس کے عہد میں ایک بہلول سکہ (ثانیہ کا سکہ تقریباً پونے دو تولہ کے برابر) کا دس من غلہ آتا تھا۔ پانچ سیر گھی اور دس گز کپڑے کی قیمت بھی ایک بہلول سکہ تھی۔

علاوہ ان کے اور تمام اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بارش کی موزونی سے وہ چند غلہ پیدا ہونے لگا اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ لگان میں بجائے روپیہ کے غلہ وصول کیا جائے

Marfat.com

جس نے سکہ کی قیمت کو گھٹا دیا اور امراء و جاگیرداروں کو مجبور کر دیا کہ اپنے اپنے اقطاع کا غلہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کریں۔ ایک معزز آدمی معہ اپنے خاندان کے پانچ تنکہ ماہوار کی آمدنی میں نہایت امن و راحت سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اگر کوئی سوار دہلی سے آگرہ تک سفر کرتا تو صرف ایک بہلولی سکہ اس کے اور اس کے گھوڑے اور سائیس کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا۔[1]

مہمات

ابراہیم لودھی جب دہلی کا بادشاہ ہوا۔ تو اپنے بھائی سے جونپور کے لئے لڑتا رہا کامیابی کے بعد اس کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے بہادری کے ساتھ گوالیار کا قلعہ راجہ سے چھین لیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب اس کو معلوم ہوا کہ بعض امیروں نے اس کے خلاف سازش کی ہے تو ان کو سخت سزائیں دینی شروع کیں۔ یہاں تک کہ ڈر کر تمام امیر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔

دولت خان لودھی لاہور کے حاکم نے مغلوں کے سردار بابر بادشاہ کو جو کابل پر قابض تھا۔ دہلی فتح کرنے کے لئے بلایا۔ پہلے تو بابر نے علاء الدین لودھی کو جو اس کے یہاں ملازم تھا۔ بطور ہراول کے بھیجا۔ ابراہیم لودھی بھی اس کے مقابلہ کو آیا۔ علاؤالدین نے اسے شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ پھر دہلی کی طرف چلا۔ ابراہیم لودھی بھی اس سے غافل نہ تھا ایک بڑی بھاری فوج لے کر پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا۔ بابر کی فوج بھی اس کے مقابلہ کے لئے موجود تھی۔

۱۵۲۶ء ۹۳۲ھ میں دونوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ ابراہیم کے پاس گو فوج بڑی تعداد میں تھی۔ لیکن ہتھیار اچھے نہ تھے اور فوج بھی تجربہ کار نہ تھی ادھر بابر کی فوج میں تجربہ کار سپاہیوں کے علاوہ ایک توپ خانہ بھی موجود تھا۔ جس سے لودھی پٹھان کی فوج واقف نہ تھی۔ بابر نے اس توپ خانہ کے ذریعے پہلے دشمن کی فوج کو منتشر کیا اور پھر تجربہ کار فوج کا دستہ لے کر اس طرح حملہ کیا کہ ابراہیم کی فوج نہ ٹھہر سکی ابراہیم خود مارا گیا اور تمام فوج نے بری طرح شکست کھائی۔ بابر فتح پا کر دہلی میں داخل ہو گیا۔

رانا سانگا سے لڑائی

میواڑ کا مشہور اور معروف حاکم رانا سانگا راجپوت سرداروں

---

[1] تاریخ داؤدی (ڈالیٹ، اسلامی ہند) ۴-۴۷۵-۴۷۶

Marfat.com

میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اور اس نے مالوہ کے وسیع ملک میں اپنی سلطنت کو دور دور تک وسعت دی تھی۔

ابراہیم نے اپنے معتمد سرداروں کی سرکردگی میں ایک مضبوط فوج راجپوت راجہ کے خلاف روانہ کی۔ شروع شروع میں افغانوں کو شکست ہوئی کیونکہ ان کے کچھ افسر اور سپاہی ٹوٹ کر دشمنوں سے جا ملے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی حالت کو جلد سنبھال لیا۔ اس لئے کہ نئی کمک خود سلطان ابراہیم کی زیر کمان آگئی دریائے گمبھیر کے کنارے راجپوتوں کو شکست ہوئی وہ میواڑ کی طرف بھاگ گئے۔

Marfat.com

سوری پٹھانوں کی سلطنت

س: سوری پٹھانوں کی سلطنت پر مختصر تبصرہ کیجئے:۔

شیر شاہ سوری

فرید خاں بہار، بنگال کے علاوہ اب جونپور، آگرہ، دہلی اور پنجاب پر قبضہ کر کے شیر شاہ کے لقب سے دہلی کا بادشاہ ہوا۔ چند سالوں میں اس نے مالوہ اور راجپوتانہ کے قلعے بھی فتح کر لئے۔ آخر میں کالنجر کے قلعہ کو گھیرے ہوئے تھا کہ بارود میں آگ گئی اور شعلہ جو بھڑکا تو وہ اس سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ ۱۵۴۵ء ۹۵۲ھ میں ادھر قلعہ فتح ہوا، ادھر شیر شاہ کا انتقال ہو گیا۔

اس نے بنگال سے پنجاب تک ایک بڑی سڑک تیار کرائی اور سایہ کے لئے دونوں طرف درخت لگائے اور ہر کوس پر پختہ سرائے مسجد اور کنواں بنوایا۔ سرائے میں ہر قوم اور ہر مذہب کو بادشاہ کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ اس کا انصاف اور اس کا قانون مشہور ہیں۔ شیر شاہ کے بعد اس کا لڑکا سلیم شاہ تخت پر بیٹھا۔ اور نو سال تک حکومت کی دہلی کے پاس سلیم گڑھ کا قلعہ اس کی یادگار ہے۔

۱۵۵۲ء ۹۶۰ھ میں محمد شاہ عادل جسے عوام عدلی شاہ کہتے تھے۔ دہلی کا بادشاہ ہوا۔ جس نے عیش و عشرت اور فیاضی میں خزانہ خالی کر دیا اور ہیمو بقال کو وزیر بنا کر بڑے بڑے امیروں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ چنانچہ سب سے پہلے بنگال باغی ہوا۔ یہاں کی بغاوت دور کرنے کو گیا تو اس کے ایک رشتہ دار ابراہیم سور نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ عادل شاہ یہ سن کر پلٹا اور ابراہیم سے لڑائی شروع کر دی۔ مگر شکست کھا کر بہار کی طرف بھاگا۔ ادھر لاہور کا حاکم سکندر سور ابراہیم سے دہلی لے کر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ ہیمو بقال عادل کو لے کر چنار کے قلعہ میں فوج کی تیاری کر رہا تھا کہ ابراہیم سور سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جو دہلی سے بھاگ کر بہار آیا تھا۔ ہیمو نے گو اس کو شکست دے دی۔ مگر بنگال کے باغیوں کو دبانے کے لئے ________ کی بجائے ہیمو سیدھا دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں ہمایوں بادشاہ ایران سے واپس آ کر سکندر سور سے دہلی لے چکا تھا۔ ابھی ہیمو بقال دہلی نہ پہنچا تھا کہ ۱۵۵۵ء ۹۶۳ھ میں یکا یک کوٹھے کے زینے سے گر کر ہمایوں نے جان دی اور دہلی کی مشہور عمارت مقبرہ ہمایوں میں دفن کیا گیا۔ اس وقت

Marfat.com

اکبر پنجاب میں ٹھہرا ہوا تھا۔

پٹھانوں کی حکومت کے کام

سیدوں نے تقریباً چالیس برس حکومت کی۔ مگر ان کا سارا زمانہ بغاوتوں کے دور کرنے میں صرف ہوا۔ البتہ لودھیوں کی پچاس سالہ حکومت میں بعض باتیں قابل ذکر ہوئیں اول ملتان سے بہار تک کا علاقہ ایک حکومت کے ماتحت ہو گیا۔ جس کے سبب امن و امان قائم ہوا اور غلہ کی ارزانی اس قدر رہی کہ مخلوق خوش حال ہوئی۔ ہندو جو ابھی تک دفتروں سے الگ رہتے تھے۔ فارسی کی تعلیم حاصل کر کے دفتروں پر قابض ہو گئے۔

شیر شاہ کا زمانہ بہترین زمانہ تھا۔ اس نے ایسے اچھے قانون جاری کئے کہ علاءالدین خلجی کے سوا ہندوستان کے کسی بادشاہ نے اب تک نہیں جاری کئے تھے۔ اس کے بنائے ہوئے قانون اکثر سلطنت مغلیہ تک رائج رہے۔ زمین کے ناپ اور مالگزاری کے بہت عمدہ قانون بنائے۔ پولیس کا اس نے بڑا اچھا انتظام کیا تھا۔ جس جگہ کوئی مقتول پایا جاتا۔ اس کے ارگرد کے ایک میل کے لوگ ذمہ دار قرار پاتے چوری جہاں ہوتی اس گاؤں کا چودھری اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا۔ کاشت کاری کے قانون اس قدر اچھے بنائے کہ زمیندار اور کاشت کار پیداوار کو ترقی دینے میں مشغول ہو گئے۔ فوجی لیاقت اس قدر اچھی تھی کہ اس کے ڈر سے کبھی کسی کو بغاوت کی ہمت نہیں ہوئی عدل و انصاف کا اس کو اس درجہ خیال تھا کہ شہزادہ نے ایک دفعہ ہاتھی پر جلوس میں ایک ہندو عورت پر جب کہ وہ گھر میں نہا رہی تھی۔ پان کا بیڑا پھینکا تھا۔ تو شیر شاہ نے حکم دیا کہ اسی طرح شاہزادہ کی بیگم پر اس ہندو عورت کا شوہر پان کا بیڑا پھینکے۔

شیر شاہ عالموں کا قدر دان تھا۔ اس کے زمانہ میں ملا نظام الدین دانشمند، شیخ خلیل مرشد قاضی فصیح الدین، مولینا رفیع الدین صفوی، شیخ عبدالحی شاعر جیسے باکمال لوگ موجود تھے۔ اس کا ترکی کے سلطان کے پاس بھی مذہبی اتحاد کے خیال سے سفیر بھیجنے کا خیال تھا مگر موت نے فرصت نہ دی۔ اس کے زمانہ میں ان گنت قلعے تیار ہوئے ڈاک کا عمدہ انتظام تھا۔ بہار، مالوہ اور ملتان سے روزانہ اس کی ڈاک آتی تھی۔ جس سے ملک کے ذرہ ذرہ کا حال اس کو معلوم ہوتا تھا۔ نہایت عقلمند اور بہادر تھا۔ اس نے کبھی شکست نہیں کھائی۔

Marfat.com

طوائف الملوکی

(ہند کی خود مختار ریاستیں)

س :- سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں (بابر کے حملے کے وقت) ہندوستان کے سیاسی معاشرتی اور معاشی حالات کا جائزہ لیجئے۔

سوری خاندان کے زوال کے بعد ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا بحث کیجئے

تغلق بادشاہوں کے بعد سے صوبوں کے حاکم خود مختار ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں دلی کی بادشاہی صرف آس پاس کے صوبوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ شیر شاہ نے اس بد انتظامی کے دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کو بہت کم موقع ملا۔ اور اس کے بعد سوری خاندان پر بھی زوال آ گیا۔

سوریوں کے زوال کے وقت سندھ ارغون خاندان کے ماتحت تھا۔ ملتان پر خاندان لنگاہ، دہلی آگرہ اور چونپورہ پر عادل شاہ کا وزیر ہیمو بقال۔ بہار اور بنگال میں پٹھانوں کی حکومت تھی۔ راجپوتانہ اور مارواڑ پر راجپوتوں کا قبضہ تھا۔ جن میں سے رانا اودے پور سب سے طاقت ور راجہ تھا۔ مالوہ بھی الگ ایک اسلامی ریاست تھی، گجرات پر مظفر شاہ حکومت کر رہا تھا۔ دکن میں سلاطین بہمنیہ کا جب خاتمہ ہوا تو دکن پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ گول کنڈا میں قطب شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی، بیدر میں بریدشاہی احمد نگر میں نظام شاہی برار میں عماد شاہی خاندان کے بادشاہ حکومت کر رہے تھے۔ اس سے اور دکن کی طرف ہندوؤں کی ایک بڑی مضبوط سلطنت وجیانگر کی تھی۔ اور سمند کے کنارے ٹراونکور کی ریاست اپنی بحری تجارت کے سبب بہت مشہور تھی۔ عرصہ تک یہ ریاستیں قائم رہیں۔ ان میں سے وجیانگر کی ریاست کو دکن کی اسلامی ریاستوں نے فتح کر کے اس کے حصے اپنی اپنی سلطنت میں شامل کر لئے اور پھر یہ اسلامی ریاستیں آہستہ آہستہ مغلوں کی سلطنت میں شامل ہوتی گئیں اورنگ زیب کے زمانہ میں دکن کا کل علاقہ سلطنت مغلیہ میں شامل ہو کر ایک شہنشاہ کے ماتحت ہو گیا۔ ان سب کا مختصر حال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

بنگالہ ہندوستان کے مشرقی گوشہ میں بنگالہ ہے۔ بنگال کو بختیار خلجی نے فتح کر کے اسلامی ممالک

Marfat.com

میں داخل کیا۔ اور مدت تک وہ دلی کے اسلامی مرکز سے وابستہ رہا۔ لیکن ۷۴۳ھ میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، بنگالہ کا مشہور حکمران حاجی الیاس شمس الدین بھنگرہ خاندان عرصہ تک وہاں حکمران رہا۔ ۷۷۵ھ ہجری میں بادشاہ کے وفات پا جانے پر اس کا لڑکا شمس الدین تخت نشین ہوا۔ لیکن کنس نے اس قدر اقتدار پیدا کر لیا تھا کہ تمام لوگ اس سے دبنے لگے تھے اس سے اس لئے فائدہ اٹھایا کہ سلطان شمس الدین کے خلاف بغاوت کرکے ۷۸۶ھ میں وہ خود تخت نشین ہوا۔ ابتدا میں اس نے مسلمانوں کے ساتھ بڑے مظالم کئے لیکن حضرت نور قطب عالم کے اشارہ سے جب جونپور کا بادشاہ ابراہیم مشرقی بنگال کی سرحد پر نمودار ہوا تو راجہ کنس کی آنکھیں کھلیں اور اپنے بیٹے کو حضرت نور قطب عالم کے قدموں میں ڈال کر معافی چاہی، راجہ سات سال کے بعد چل بسا اس کے بعد اس کا لڑکا جیت مل جو شیخ نور کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ ۷۹۲ھ ہجری میں جلال الدین کے نام پر تخت نشین ہوا۔ اس نے عدل و انصاف کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ لوگ اس کو نوشیرواں ثانی کہنے لگے۔ اس کے عہد میں لوگ بڑے فارغ البال رہے، شہر پنڈوا آبادی کی کثرت سے اتنا بڑا ہو گیا کہ اس کے اطراف میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ گوڑ میں بکثرت حوض تالاب سرائے مسجدیں تیار کرائیں اور دوبارہ گوڑ کو بڑے پیمانہ پر آباد کیا۔ علماء کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ انہیں دور دور سے بلا کر آباد کیا تبلیغ الاسلام میں بھی اس نے بڑی کوشش کی سترہ سال حکومت کرکے ۸۱۲ھ میں وفات پا گیا اس کا لڑکا احمد شاہ اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی روش پر چل کر ملک کو خوش حال بنانے میں کافی حصہ لیا۔ اس نے سولہ برس حکومت کی ۸۳۰ھ میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد پھر حکومت الیاس کے خاندان میں منتقل ہو گئی، اس نومسلم خاندان نے ۴۴ برس حکومت کی۔ اس قلیل مدت میں اس نے بنگالہ کو آباد کرنے اور ملک میں تمدن کو ترقی دینے میں بہت کوشش کی [۱] بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ یہ بھی ہے کہ راجہ کے مسلمان ہو جانے سے رعایا پر اثر پڑا اور کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ جب شاہان دہلی کمزور ہو گئے تو گورنران بنگال خود مختار ہو گئے اور کئی خاندان ایسے ہوئے۔ جنہوں نے شاہانہ اختیارات حاصل کر لئے۔

ہمایوں بنگال پر ۹۴۴ھ سے ۹۴۶ھ تک شیر شاہ نے مغلوں کو شکست دی، تو پھر بہار خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک ۹۸۴ھ میں بہار

---

[۱] ریاض السلاطین کلکتہ صد ۱۲۶ و تاریخ فرشتہ جلد چہارم حیدر آباد۔

Marfat.com

کو اکبر نے فتح نہیں کر لیا۔ اور ۱۵۷۶ء ۹۸۴ھ میں مغلوں کا اثر بنگال میں عام نہیں ہو گیا۔

کشمیر

۷۱۵ھ میں کشمیر کا راجہ سیٹھ دیو تھا جو پشت در پشت کشمیر پر حکومت کرتا آتا تھا۔ اس کے عہد میں ایک شخص شاہ میر نامی فقیروں کے لباس میں وارد کشمیر ہوا جس کا باپ طاہر نو مسلم تھا وہ اپنا حسب نامہ ارجن تک ملاتا تھا۔ جو مہا بھارت کا مشہور ہیرو ہے۔ شاہ میر نے راجہ کی ملازمت کر لی۔ راجہ کے مرنے پر اس کا لڑکا "انجن" راجہ ہوا۔ اس نے شاہ میر کو وزیر بنالیا پھر انجن کے مرنے پر راجہ اودن جو اس کا رشتہ دار تھا۔ قندھار سے آکر کشمیر پر قابض ہو گیا تھا۔ رانی نے چاہا کہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ اس لئے وزیر سے اختیارات واپس لینے کے لئے اس کو جنگ کرنی پڑی لیکن وہ شکست کھا کر قید ہو گئی اور اس نو مسلم وزیر نے اس سے شادی کر لی اور وہ شمس الدین کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہو گیا۔ محمد اعظم نے واقعات کشمیر میں جو ۱۱۴۸ھ میں لکھی گئی ہے ایک اور روایت بیان کی ہے کہ کشمیر کا ہندو راجہ "رنجو" دین حق کا جویا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ایک مسلمان بزرگ بلبل شاہ کو دست بدعا اور سر بسجود دیکھا اور ان کا عقیدت مند ہو کر مع اہل و عیال اور امراء و وزراء کے مسلمان ہو گیا۔ یہ واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا اس نے مسلمان ہو کر اپنا لقب صدرالدین اختیار کیا۔ اس کے خاندان میں کئی بادشاہ وارث تخت ہوئے ۸۲۶ھ میں علی کے انتقال کرنے پر شاہی خان نے سلطان زین العابدین کے نام سے اپنے سر پر تاج شاہی رکھا۔ یہ کشمیر کا سب سے ہر دلعزیز بادشاہ ہوا ہے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے نو مسلموں کو جو زبردستی مسلمان بنائے گئے تھے۔ اجازت دے دی کہ جو چاہے اپنے پرانے مذہب میں واپس آسکتا ہے۔ چنانچہ بعضوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا اور اکثر نئے دین پر قائم رہے اس کے قوانین اس کا تدبر اس کی سیاست اس عہد کے لئے ایک نمونہ تھی۔ علم و فن اور صنعت و حرفت کو اس نے بڑی ترقی دی۔ بہت سے نئے گاؤں اور شہر آباد کئے بہت سی نئی عمارتیں بنائیں اس کے انصاف کے سبب رعایا امن سے سوتی تھی۔

کشمیر پر ان نو مسلم خود مختار بادشاہوں نے دو سو برس سے زیادہ حکومت کی۔ اس عرصہ میں انہوں نے ملک کو ترقی دینے میں جو کوشش کی تاریخ زبان حال سے اس کو آج تک ہراتی رہی ہے۔ انہوں نے زراعت کے لئے زمینداروں کے ساتھ جو رعایت کی اس کا نتیجہ

Marfat.com

یہ نکلا کہ چپہ بھر زمین خالی نہ رہی اور کاشت کار فارغ البال ہو گئے۔ باغوں پر انہوں نے کافی توجہ دی۔ بکثرت باغ لگائے۔ عمارتیں کافی تیار کرائیں۔ ڈل پر جو عمارت تیار کی گئی ہے وہ عجائبات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

قوانین بھی اچھے اچھے جاری کئے دوسرے ملکوں کے سفیر بھی آتے رہتے تھے۔ مثلاً سمرقند خراسان مکہ معظمہ، مصر، گیلاں کے علاوہ ہندوستان کے بادشاہوں سے بھی مراسم دوستانہ تھے[1]

گجرات

نومسلم سلاطین کے سب نامور خاندان نے گجرات پر حکمرانی کی ہے۔ ان کا نام تاں منظفر تھا۔ ان کی تاریخ یہ ہے کہ ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق گجرات میں شکار کھیل رہا تھا کہ اچانک اپنے لشکر سے جدا ہو کر رات کے وقت تھنیر ضلع ٹھاسرہ پہنچا۔ وہاں کے پٹیل سہارن نامی نے شب باشی کا انتظام کیا بادشاہ صبح کو حسن خدمت کے عوض میں سہارن اور اس کے بھائی سادھو دونوں کو ساتھ لے کر جب دہلی پہونچا تو سہارن کو آب داری کے عہدہ پر ممتاز کیا۔ فیروز شاہ کے بعد محمد شاہ نے ۷۹۴ھ میں سہارن کے لڑکے ظفر خان کو گجرات کا ناظم بنا کر بھیجا اس نے بدامنی دور کر کے چند سال میں اپنی حکومت مضبوط کر لی۔ ۸۰۹ھ ہجری میں اس کے لڑکے محمد شاہ تاتار خان نے دہلی فتح کرنا چاہا۔ لیکن راستہ ہی میں مرگیا ۸۱۰ھ ہجری میں ظفر خان نے منظفر شاہ لقب سے گجرات کا خود مختار بادشاہ بن کر دہلی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ۸۱۳ھ میں اس کے مرنے پر احمد شاہ اس کا پوتا بادشاہ ہوا۔ اس نے پٹن کو چھوڑ کر احمد آباد کی بنیاد رکھی اور اس کو پایہ تخت بنایا۔ قلعہ اور محلات کے علاوہ ایک عظیم الشان جامع مسجد تیار کی جو آج تک موجود ہے۔ ۸۴۶ھ میں اس کا لڑکا محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا یہ بڑا فیاض تھا۔ اسی لئے اس کو "زر بخش" کہتے تھے۔ اس نے احمد شاہ اور شیخ احمد کھٹو کے مقبرے تیار کرائے گجرات میں ایک ہی خاندان کی حکومت پونے دو سو برس رہی۔ اس عرصہ میں گجرات نے ہر صورت سے ترقی کی ان کا پایہ تخت احمد آباد اور جاپانیر رہا۔ ان بادشاہوں نے بہت سے گاؤں اور شہر بسائے۔ سلطان پور، احمد نگر، محمود آباد، منظفر آباد، دولت آباد، اس زمانہ میں آباد ہوئے۔ احمد آباد میں پتھر

---

[1] تاریخ فرشتہ و طبقات اسلام جلد سوم

Marfat.com

کی عمارتیں بکثرت بنائی گئیں۔ خاص کر بعض مسجدیں اس کاریگری سے تیار ہوئیں کہ اس کے ایک مینار کو ہلانے سے دوسرا مینار بھی ہلنے لگتا تھا۔ اس طرح کھجور یا مسجد بھی عجائبات میں شمار کی جاتی ہے مقبرے، مدرسے، حمام، سرائیں بکثرت بنیں، جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ سلاطین گجرات عالموں اور صوفیوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے ملکوں سے بڑے محدثین اور فقہا، مشائخ اور علماء باکمال گجرات میں آکر آباد ہوگئے اور تمام عمر توسیع علوم وفنون میں مصروف رہ کر اسی جگہ پیوند خاک ہوتے۔ محمود اوّل کے زمانہ میں قاضی اور محتسب برملا بادشاہ کو ٹوکتے اور احتساب کرنے پر مظفر حلیم مدعی کے ساتھ عدالت میں کھڑا ہوتا۔ مولانا رکن الدین شکر گنج، شیخ کھٹوی، قطب علی شاہ عالم، ماہ عالم، شیخ برہانی جیسے مشائخ کبار اس زمانہ میں تھے۔ علامہ محمد طاہر پٹنی شاہ وجیہ الدین گجراتی، عماد الدین طاری اس زمانہ کے بہترین علماء میں سے تھے۔

اس عہد میں بے شمار کتابیں ہر علم وفن کی تصنیف ہوئیں اور ترجمہ کی گئیں زراعت کے لئے بڑی تعداد میں تالاب کھدوائے گئے۔ جن میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ مظفر شاہ ثانی کے عہد میں کوئی جگہ خالی پڑی نہیں ملتی تھی۔ آم اور کھرنی کے کئی لاکھ درخت لگائے۔ درختوں کی کثرت سے احمد آباد کا شہر باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ احمد آباد کے پاس جو کئی میل باغ لگایا تھا۔ اس کا نام "باغ فردوس" تھا۔ ایرانی طرز کی چمن بندی گجرات میں بہت عام ہوگئی تھی۔ عام طور پر بادشاہ سخی ہوتے تھے۔ ان کی سخاوت سے خاص کر قحط کے زمانہ میں بڑا فائدہ ہوتا تھا اکثر سلاطین گجرات کو عدل وانصاف کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ضرورت کے وقت بادشاہ خود بھی تحقیقات کرتا۔ غیر ممالک سے ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ جونپور، دہلی، بنگالہ، کشمیر، ایران، روم مصر، اور یورپ کے سفیر تحفے لے کر ان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ مصر میں جب تک عباسی خلافت قائم رہی، سفیر کئی بار آئے اور گئے آصف خان، افضل خان، عماد الملک، ملک شعبان، خداوند خان جیسے لائق وزیر اسی زمانہ میں تھے۔ فوجی قابلیت یہاں کی خاص قوموں میں فطری تھی اس سبب سے یہاں کی فوجی طاقت ہمسایہ سلطنتوں سے زیادہ رہی، ہندوؤں کو فوجی اور ملکی عہدے ملتے تھے احمد شاہ اول کے دور میں نائب وزیر محمد شاہ ثانی کے عہد میں وزیر مال محمود اول کے زمانہ میں رائے رایان امیر، بہادر شاہ کی فوج میں سپہ سالار اور قلعہ دار ہندو تھے۔ دکن کے بعد توپ کا استعمال بھی سب سے پہلے گجرات ہی میں ہوا، فوجی بھرتی کا قاعدہ موروثی تھا

Marfat.com

ابتداء میں تنخواہ نقد ملتی تھی۔ لیکن احمد شاہ نے نصف نقد اور نصف جاگیر (زمین) مقرر کی مظفر دوم کے عہد میں زراعت کو اس قدر ترقی ہوگئی تھی کہ جانوروں کا چرنا مشکل ہوگیا۔ ناچار گاؤں میں چرائی کی چراگاہیں الگ بنانی پڑیں۔ بحری تجارت کو اس قدر ترقی ہوگئی تھی۔ کہ ۸۴ بندرگاہیں گجرات کے ماتحت تھیں۔ یہاں ہر موسم میں ملکی اور غیر ملکی جہاز کھڑے رہتے تھے۔ ایران، عراق، یمن، حبش، عرب اور مصر کے تاجر موجود رہتے۔ بہادر شاہ کے عہد میں گجرات کا بحری بیڑہ اس قدر مضبوط تھا کہ اس وقت ہندوستان میں کسی کے پاس نہ تھا۔

دکن کے بہمنی

دکن کی سب سے بڑی اور پہلی سلطنت کا نام بہمنیہ ہے۔ بہمنیہ کیوں کہلاتے ہیں۔ مورخوں نے اس کی کوئی معقول توجیہ اب تک پیش نہیں کی۔ بہمنی سلاطین کے درباری مورخوں نے اس باب میں اس خصوصیت کا اظہار کیا ہے جو عجمی مورخوں کا خاصہ ہے۔ یعنی اپنے ممدوحوں کا اعلیٰ نسب اور پرانے ایرانی سلاطین کی نسل ظاہر کرکے ان کے لئے سلطنت کا پیدائشی حق ثابت کرنا انہوں نے لفظ بہمن کے شاعرانہ ضلع جگت اور مناسبات کی بناء پر ان کو بہمن بن اسفندیار کی نسل بتلا کر کلاہ کیانی ان کے سروں پر رکھا اور کبھی جام جم سے ان کی محفلوں کو سجایا ہے۔

یہ اس قسم کی لفظی غلطی ہے۔ جیسے سندھ اور کچھ کے جام لقب راجاؤں کو جمشید ایران سے نسبت دینے کی گئی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے جو تحقیق کی ہے۔ اور سلاطین بہمنیہ کی اصلیت کی تلاش کی کوشش کی۔ اس کا خلاصہ پیش ہے سلطنت بہمنیہ کے بانی کا نام قبل از سلطنت اس کے ہم عصر دہلوی مورخین سراج عفیف اور ضیا برنی نے ہر جگہ حسن گانگو لکھا ہے[1] عصامی نے فتوح السلاطین میں حسن کا نام بہمن بتایا ہے۔ کہتا ہے۔

یہ سیرت فریدوں و بہمن بنام ۔ شدہ کنیتش ابوالمظفر مدام

میری تحقیق میں حسن کا دوسرا نام بہمن کبھی نہ تھا بلکہ وہ یہ لقب ہے جس کو سلطنت کے بعد اس نے اختیار کیا تھا۔ حالانکہ اس قسم کے فارسی ناموں کا رواج اس زمانہ میں بھی تھا۔ جیسا کہ خود حسن کے داماد کا نام بہرام خان تھا۔ مگر صحیح یہی ہے کہ یہ لقب اس نے سلطنت کے بعد اختیار کیا ہے۔ اور اس

---

[1] فیروز شاہی سراج عفیف صفحہ ۲۴۴، ۲۶۱، ۲۶۲ ضیاء برنی صفحہ ۵۱۵، ۵۲۰

Marfat.com

کی صحیح صورت وہی ہے جو اس کے کتبوں اور سکوں پر ہے۔ اس کے سکوں اور کتبوں پر یہ خطابات کندہ ملے ہیں۔ جیسا کہ باغ عامہ حیدر آباد دکن کے عجائب خانہ میں ایک پتھر بھی نظر آتا ہے۔ "سکندر ثانی بہمن الخلافت ناصر امیر المومنین السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر بہمن شاہ السلطان حسن اس کا اصلی نام ہونا یقینی ہے جس کی نسبت سے گلبرگہ حسن آباد نام رکھا گیا۔ کانگو یا گانگو اس کے نام کا دوسرا جزو بھی اس کا ہم عصر مورخین کے بیان سے ثابت ہے اور بہمن نہیں بلکہ بہمن شاہ کی صورت میں اس کا یہ لقب سکوں اور کتبوں میں موجود ہے۔ اس لئے اس کا پورا لقب "حسن گانگو بہمن شاہ" تھا۔ جیسا کہ فرشتہ نے تینوں کو یکجا کر کے لکھا ہے۔ ان میں سے گانگو اسلامی نام نہیں پھر حسن کے ساتھ کانگو کا جوڑ کیا ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ کانگو پنڈت اصل ایک دکھنی برہمن کا نام تھا۔ یہ پہلا برہمن ہے۔ جس نے کسی مسلمان کی نوکری اختیار کی۔ یہ علم نجوم اور جوتشی میں ماہر تھا اس نے دکن سے دلی آکر شہزادہ محمد تغلق کی نوکری اختیار کی اور جاہ و منصب پیدا کیا اسی زمانہ میں حسن نام ایک غریب و بدحال شخص دلی آکر گنگو برہمن کے پاس پہنچا۔ برہمن نے اسے ہل بیل دے کر دلی کے پاس کسی کھیت کے جوتنے پر نوکر رکھ لیا۔ حسن نے کھیت میں ہل چلایا جو ہل کسی بھاری چیز سے ٹکرایا اس نے اس کو نکالا تو ایک بڑا خزانہ پایا۔ حسن نے یہ پورا خزانہ جوں کا توں گنگو برہمن کے سامنے لاکر پیش کر دیا۔ برہمن کو اس کی دیانت داری اور ایمان داری پر بہت تعجب ہوا۔ اور اس کا ذکر اس نے شہزادہ محمد تغلق سے کیا۔ شہزادہ نے اس کی تعریف بادشاہ وقت غیاث الدین تغلق سے کی۔ غیاث نے خوش ہو کر اس کو اپنے امیران صدہ میں شامل کر لیا، گانگو برہمن کو حسن کے زائچے سے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ یہ ایک دن بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے حسن سے یہ شرط قبول کرائی کہ جب اللہ تم کو سلطنت دے تو میرا نام اپنے نام کا جز بنانا اور سرکاری دفاتر کا سارا اہتمام مجھ کو اور میری اولاد کو نسلاً بعد نسل سپرد کر دینا۔ حسن نے دونوں شرطیں قبول کیں۔ چنانچہ امر ... ت سے اس نے اپنا نام "حسن گنگو بہمن" قرار دیا اور سلطنت کے تمام سرکاری دفاتر کا کام گنگو برہمن کے سپرد کر دیا۔ اب اس کے بہمن نام کی توجیہہ سنئے اس کے مداح مورخوں نے اس بہمن کو بہمن بن اسفندیار ... سے ملایا ہے۔ جیسا کہ تحفۃ السلاطین یا فتوح السلاطین۔ سراج التواریخ، اور بہمن نامہ میں مذکور ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ مجھے خود بھی بہمن سلاطین کے حسب و نسب کی بڑی تلاش تھی۔ اتفاقاً احمد نگر کے کتب خانہ میں ایک علمی رسالہ اس بحث پر ملا۔ جس میں بہمن سلاطین کا پورا نسب نامہ درج تھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

Marfat.com

"حسن بن کیکاؤس بن محمد بن علی حسن بن سیام بن میمون بن سلام بن ابراہیم بن شہور بن فرخ بن شہریار بن عاد بن سپید بن ملک داؤد بن ہوشنگ بن نیک کردار بن فیروز بخت بن صانع اور صانع چند واسطوں سے بہرام گور کی اولاد تھا، اور بہرام گور ساسان کی نسل سے تھا۔ اور ساسان بہمن بن اسفندیار کی نسل سے تھا۔ یہ نسب جیسا کہ اس کی ترتیب سے ظاہر ہے سراسر جعلی ہے۔ یہ نہ عربی، فارسی نہ ترکی ہے۔ اور بے جوڑ ناموں کا سلسلہ ہے خود فرشتہ بھی اس کی صحت کا قائل نہیں اور اس نے اپنے اسی نظریہ کو جو گنگو برہمن کی حکایت پر مبنی ہے۔ ترجیح دی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حسن کی قومیت اور قبیلہ کے باب میں تمام مورخین خاموش ہیں۔ لیکن فرشتہ کے قلم سے ایک جگہ ایک فقرہ نکل گیا ہے جو یہ ہے۔

علی شاہ خواہر زادہ مظفر خان علامی کہ از امیران صدہ بود واز دولت آباد جہت تحصیل مال سلطانی بگلبرگہ رفتہ بود چوں آں حدود از عمال خالی دید برادراں خود را کہ یکے از انہا حسن گانگوی بود یکجا جمع کردہ (صفحہ ۱۳۸/ ا نولکشور)

اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر خان جو سلطان علاء الدین خلجی کا مشہور سپہ سالار تھا اس کا بھانجا علی شاہ تھا۔ اس کے بھائیوں میں سے حسن گانگو تھا۔

۱۔ لیکن اس فقرہ میں کسی غلطی کا واقع ہونا مجھے نظر آتا ہے۔ اگر فرشتہ کو واقعتاً اس کے خاندان کا علم تھا تو اس کے نسب کی تحقیق کے موقع پر اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

۲۔ اس کے نہ ماننے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے بعد ہی یہ ہے کہ علی شاہ مع برادران قید ہو کر سزائے قتل کو پہنچے۔

اب اگر حسن اس کے بھائیوں میں سے ہوتا تو وہ بھی قتل ہو چکا ہوتا۔ فرشتہ کا یہ بیان اس وقت اور بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کے اس بیان کا ماخذ برنی کی فیروز شاہی ہے لیکن اس واقعہ کے ذکر میں یہ فقرہ کہ حسن گانگو علی شاہ کا بھائی تھا۔ اس میں مطلق موجود نہیں عبارت یہ ہے۔

"فتنہ علی شاہ کہ خواہر زادہ ظفر خان علامی کہ امیر صدہ قتلغ خان بود ظاہر حسن علی شہ مذکور اگر دیوگیر بہ تحصیل گلبرگہ رفتہ بود واں طرف را از سوارہ پیادہ ومقطعان ووالیان خالی دید۔ برادران خود را با خود یار کردہ ...... سلطان علی شاہ با حی عذرا را با برادر آں دست راست دادہ، از حصار فرود آوردہ ..... سلطان محمد علی شہ برادران او را بغزنین فرستاد و ایشاں از انجا بار

آمدند و ہر دو برادر را در پیش داخول سیاست نمودہ (صفحہ ۴۸۹)

مجھے خیال ہوا کہ فرشتہ کی عبارت میں کچھ کتابت کی غلطی ہے" برادران خود بدآ کی جگہ سرداران خود را ہوگا۔ اس غرض کے لئے میں نے فرشتہ مطبوعہ بمبئی کا قدیم نسخہ دیکھا، وہاں برادراں ہی لکھا پایا اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن کے ساتھ گانگو نام اور بہمن شاہ لقب کی کوئی صحیح توجیہہ تک اب تک میری رسائی نہیں ہوئی ہے۔

بہمن شاہ لقب اور دکھن کے برہمنوں کے ساتھ اتحاد سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے نسبی طور سے نہیں تو سیاسی طور سے دکھنی برہمنوں کو ضرور اپنے ساتھ ملایا تھا اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا اور اس کی علامت کے طور پر ان کے خوش کرنے کے لئے اس نے اپنا خطاب بہمن شاہ یعنی برہمنوں کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ جیسا کہ اس کے کتبوں اور سکوں میں کندہ ملتا ہے۔ لفظ بہمن وہی مشہور لفظ برہمن ہے۔ شمالی ہند میں اس کا تلفظ بھیہ بن برہمن ہے۔ اور اس کی جمع براہمہ اور دکن میں اس کا عام تلفظ بہمن اور اس کی جمع بہامنہ بولی جاتی ہے۔ چنانچہ فرشتہ میں لفظ کی یہ دونوں شکلیں ایک ساتھ ملتی ہیں۔

دراول کے کہ از فرقہ براہمہ در اول کے کہ از فرقہ براہمہ در ورود اسلام نوکری قبول کرو۔ گانگو پنڈت بود تا حال کہ سنہ ۱۰۱۶ ہجری است بخلاف سائر ممالک ہند ممالک ہند خصوصاً دفتر بادشاہان دکن ولو لیسندگی ولایات الیشان۔ بہ بہامنہ مرجوع است" [1]

اس عبارت میں شمالی ہند کے تعلق سے براہمہ اور جنوبی ہند کے تعلق سے بہامنہ بہمن شاہ برہمن شاہ ویسی ہی ترکیب ہے۔ جیسے کابل شاہ، ہند وشاہ، شیرواں شاہ، خوارزم شاہ جو مشہور بادشاہوں کے خاندانی نام ہیں۔

یہ تو بہمن شاہ کی ایک لگی ہوئی توجیہہ ہے۔ مگر گانگو نام کی توجیہہ کا جو شروع ہی میں اس کے نام کا جزو ہے۔ جیسا کہ سراج عفیف اور ضیا برنی کے حوالوں سے ثابت ہے۔ ابھی تک حل نہ نکل سکا۔ بہرحال بہمن شاہیہ اگر نسل سے ہندو نہ ہوں۔ تاہم انہوں نے وجے نگر کے ہندو راجاؤں کی بیٹیوں کو قبول کیا تھا۔ مگر ان سے نسل کا چلنا ثابت نہیں ہوتا۔ بہمنیہ سلطنت کے ختم ہونے پر اس کی خاک سے پانچ چھوٹی بڑی سلطنتیں پیدا ہوئیں۔ جن میں تین نظام شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی ہیں۔

---

[1] صفحہ ۲۷۸ نولکشور

Marfat.com

نظام شاہی

نظام شاہی سلطنت کا بانی نظام الملک بحری تھا۔ یہ خالص دکھنی ہندو نسل سے تھا۔ فرشتہ کا بیان ہے اس کا ہندو نام تیما بھٹ اور باپ کا نام بھیرو تھا۔ اس کا اسلامی نام حسن رکھا گیا اور بعد کو بھیرو بحری بنا یا گیا اور حسن بحری کے نام سے مشہور ہوا[1] فرشتہ کا بیان ہے "از بہامنہ مغیر دولت خانہ نظام شاہیہ شنیدم کہ پیش از سلطنت نظام شاہ بحری بہ چندین سال اجداد نظام شاہیہ از براہمیہ پرگنہ پاتری در قدیم الایام تعلق بابا و اجداد داشتہ بودند بہ تقریب تغیر مکان کردہ بولایت بیجانگر رفتہ بودند در آں حدود بسر می بردند"

اس تعلق کی بنا پر برہان نظام شاہ نے اس پرگنہ پر قبضہ کر کے اپنے خاص گاؤں کو اپنے ہندو برہمن عزیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ فرشتہ کی شہادت ہے کہ "برہان نظام شاہ آن پرگنہ را بقبض خویش در آوردہ موضع موروثا بہ بہامنہ خویش و قرابت خود کہ رئیس کفرہ بودند بطریق انعام عنایت فرمودہ" اس سے معلوم ہو کر اس کا اصل وطن موضع پاتری تھا۔ جہاں اس کا خاندان آباد تھا۔

یہ بیجانگر کے ایک برہمن کا لڑکا تھا۔ سلطان احمد شاہ وبہمن نے اس کو ذہین دانشمند اور حساب کتاب میں ماہر پایا۔ اس لئے اس کو بھی شاہزادوں کے ساتھ مکتب میں بٹھا دیا اور فارسی کی تعلیم دلوائی۔ پہلے وہ میر شکار کے عہدہ پر فائز ہوا۔ پھر نائب وزیر بن گیا، سلطان محمود بہمنی کے عہد میں خواجہ جہاں محمود گاواں کے مرنے کے بعد وزیر کل ہوا۔ اس کا لڑکا احمد باپ کی جاگیر کا انتظام کرتا تھا۔ نظام الملک کے مرنے پر اس نے سلطنت کو اس خوبی سے چلایا کہ اس کی کوئی کل ڈھیلی نہ رہنے دی، محمود بہمنی کے وزیر کو شکست دے کر ۸۹۵ھ میں ایک باغ اس فتح کی یادگار میں لگایا اور اپنا نام نظام شاہ رکھا۔ سنہ ۹۰۰ھ میں دولت آباد کے مقابل ایک نیا شہر احمد نگر کے نام سے بسایا۔ ۔۔۔ چند ہی سال میں یہ شہر بڑا آباد اور بارونق بن گیا۔ باغ نظام کو قلعہ نما تیار کرایا اور مختلف محلوں کو رنگین کانچ کے ذریعہ دلکش تصویروں سے آراستہ کرایا۔ دولت آباد فتح کر کے کاسنہ اور بگلانہ کو مطیع کیا۔ ۹۱۴ھ میں اس نے وفات پائی۔

---

[1] فرشتہ نمبر ۲ صفحہ ۱۸۰ ۔ طبقات اکبری نمبر ۳ صفحہ ۶۷

Marfat.com

اس کا لڑکا برہان نظام شاہ کم سن تھا۔ اس لئے سارے اختیارات پر اس کے وزیر مکمل خان کا قبضہ ہوگیا۔ سنہ ۹۲۴ھ ہجری میں اس نے پاتری کو جو اس کے باپ دادا دل کا اصلی وطن تھا فتح کر لیا۔ سنہ ۹۲۸ھ میں ایک شیعہ بزرگ شاہ طاہر کے اثر سے اس نے شیعی مذہب اختیار کیا اور اسی کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ سنہ ۹۳۵ھ میں بہادر شاہ گجراتی سے جنگ میں شکست کھا کر خراج دینے کی شرط پر صلح کر لی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس کے وزیر کنور سین نے مرہٹوں سے لڑ کر ۲۰ قلعے چھین لئے۔ سنہ ۹۶۱ھ میں سلطان دنیا سے کوچ کر گیا۔ حسین شاہ نے تخت نشین ہو کر پہلے تو خانہ جنگی کا خاتمہ کیا۔ پھر پرتگیزوں کو اپنا مطیع بنایا۔ سنہ ۹۷۲ھ میں نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی سے عادل شاہ کا نکاح ہوا۔

۹۷۲ھ میں دکنی فوجوں کے ساتھ تالی کوٹ کی جنگ میں شریک ہوا، وجیانگر کا راجہ "رام راج" کا خاتمہ کر کے جب واپس آیا تو خود بھی دنیا سے کوچ کر گیا۔ نظام شاہی سلطنت کی عمر صرف ڈیڑھ سو برس رہی۔ ان کا پایہ تخت احمد نگر تھا۔ انہوں نے بڑے بڑے محل بنائے۔ ان میں شیش محل خاص شہرت رکھتا ہے۔ باغ بکثرت لگوائے۔ باغوں کی کثرت کی وجہ سے ملک بہشت کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ صلابت خان اور خواجہ جہان دکنی جیسے وزیر اسی زمانہ میں تھے۔ ان کا علمی دربار بھی بڑا بارونق تھا۔ ملا پیر محمد طاہر شاہ، ملا ظہوری، ملک قمی جیسے اہل علم اور شاعر اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ رعایا کا مذہب سنی مہدوی تھا۔ اور حکمران شیعہ تھے۔ غیر ملکیوں سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے۔ اور ایک دوسرے کے سفیر اچھے تحفوں کے ساتھ آمد و رفت رکھتے تھے۔ ہمایوں بادشاہ ایران سے اسی عہد میں واپس آیا۔ اور ملکی اور غیر ملکی جھگڑے البتہ اکثر ہوتے تھے۔ جس نے سلطنت کو کمزور کر دیا۔ عورتیں بھی سیاست میں حصہ لیتی تھیں۔ دکن کی مشہور ملکہ چاند بی بی سلطانہ اسی خاندان سے تھی۔ اس کی فوجی طاقت بھی کسی سے کم نہ تھی۔ یہ سلاطین بڑے جنگجو تھے۔ عادل شاہی اور برار کے ساتھ ہمیشہ جنگ کرتے رہتے احمد شاہ نظام کو کشتی کا بڑا شوق تھا۔ یہی مذاق رعایا کا ہوگیا تھا۔ اسی لئے یہاں بک بکی (ڈوئل) کا بڑا رواج تھا۔ علماء تک اس سے محفوظ نہ تھے۔ آخر زمانے میں ملک عنبر حبشی نے جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ جس کو جنگ گریزپا (قزاقانہ جنگ، کہتے ہیں۔ یعنی گوریلا وار اس فوج میں مرہٹے زیادہ تھے۔ اسی سبب سے مرہٹوں کو اس لڑائی کی بڑی مہارت ہوگئی۔ سیواجی کو تو یہ طریقہ اس قدر پسند آیا کہ عمر بھی اسی طریقہ پر لڑتا رہا۔ صلابت خان کے وقت

Marfat.com

میں تجارت کو بھی اچھی ترقی ہوئی جنگ اور خانہ جنگی کے سبب زراعت وصنعت پر کافی توجہ ہو سکی [1]

عماد شاہی

دکن کی دوسری سلطنت جو بہمنیہ کے ایک گوشہ میں قائم ہوئی تھی، عماد شاہی ہے۔ عماد شاہی سلطنت کا بانی فتح اللہ عماد الملک ہے۔ یہ بیجانگر کے ہندو کا لڑکا تھا۔ بچپن میں گرفتار ہو کر سپہ سالار خان جہاں کے غلاموں میں داخل کر لیا گیا، محمود بہمن شاہ کے عہد میں خواجہ محمود گاواں وزیر مملکت کی عنایت سے اس کو عماد الملک کا خطاب ملا۔ اور برار کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ ۸۹۰ھ میں وہ خود مختار ہوگیا۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا علاءالدین عماد شاہ تخت کا وارث ہوا۔ اس نے اسمٰعیل عادل شاہ کی لڑکی سے شادی کر کے اپنی قوت کو ترقی دی۔

برہان نظام شاہ نے اس کے دو قلعے دبائے تھے۔ اس کے لئے بڑی خون ریز جنگ ہوئی شکست پا جانے پر خاندیس کے حاکم شاہ نے دونوں کو اپنا باجگزار بنا لیا۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا دریا عماد الملک حاکم ہوا۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی حسین نظام شاہ سے کر دی۔ عرصہ تک حکومت کر کے دنیائے فانی کو خیرباد کہا اور اب اس کا چھوٹا کم عمر لڑکا برہان عماد شاہ مالک تخت ہوا۔ لیکن تفاول خان دکنی نے برار پر قبضہ کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا، اور خود تفاول خان کو مرتضیٰ شاہ نے شکست دے کر قتل کر دیا اور برار کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اس سلطنت کا پایہ تخت کاویل تھا یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اور ہمیشہ لڑنے بھڑنے کے سبب اس کو اس کا موقع نہیں ملا کہ امن وامان قائم کر کے ملک کو ترقی دے اس کی فوجی طاقت بھی معمولی تھی [2]

بریدشاہی

بہمنیہ کی تباہی کے بعد بریدشاہی خاندان دکن کی ایک چھوٹی سی سلطنت

---

[1] ماثر نظام شاہی مطبوعہ دہلی فرشتہ جلد چہارم حیدر آباد [2] فرشتہ جلد چہارم حیدرآباد

تھی، جس کا پایہ تخت بیدر تھا۔ اس کا بانی قاسم برید المتوفی ۹۱۰ھ ترک تھا۔ مگر اس نے اپنے لڑکے کی شادی جس کا نام امیر علی برید تھا۔ سا باجی ایک مرہٹہ سردار کی لڑکی سے کرادی تھی۔ اور اسی تعلق سے چار سو مرہٹہ بہادروں نے اس کی نوکری کی اور سب رفتہ رفتہ مسلمان ہوگئے۔ اور انہیں کی قومی طاقت سے اس سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ افسوس ہے کہ کسی مورخ نے اس کا حال نہیں لکھا۔ فرشتہ نے ان کے سات بادشاہوں میں سے صرف تین کا حال لکھا ہے۔ اور معذرت کی ہے کہ ان کے حالات کسی کتاب سے معلوم نہیں ہوتے اور جو لکھا ہے وہ بھی بزرگوں کی زبانی سنکر[۱]

قطب شاہیہ

سلطنت قطب شاہی کا بانی قطب الملک سلطان قلی ترکون کی قوم بہارلو سے تھا۔ اس کا باپ اویس قلی آذربائی جان کا حاکم تھا۔ محمد شاہ بہمنی کے عہد میں دکن آیا۔ محمود شاہ کے زمانہ میں گول کنڈہ کی نظامت پر مامور ہوا۔ انیس سال تک مطیع رہ کر ۹۱۰ھ میں خودسری اختیار کی اور قطب شاہ لقب مقرر کرکے اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کیا۔ اس کے خاندان میں آٹھ فرماں روا ہوئے جو بڑے مرتبہ اور اہل علم کے قدردان تھے۔

عادل شاہیہ

عادل شاہی کا مورث اعلیٰ یوسف عادل شاہ سلطان دوم محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کا بھائی تھا۔ جب سلطان محمد نے اس کے قتل کی فکر کی۔ تو دشمن کی شمشیر سے محفوظ رہنے کے لئے دکن چلا آیا۔ اور یہاں محمد شاہی بہمنی کے ملازموں میں داخل ہوا۔ تھوڑے عرصہ میں بیجاپور کا ناظم مقرر ہوگیا۔ عرصہ تک مطیع رہا۔ ۸۹۵ھ میں عماد الملک کی تحریک سے اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔ اس خاندان کے حکمران عالمی دلچسپی رکھتے تھے۔ آثار الکرام میں مفصل حال دیکھیئے۔

---

[۱] تاریخ وسیاست مضمون علامہ سید سلیمان ندوی

Marfat.com

خاندیس (برہان پور) کے فاروقی شاہ

فیروز شاہ تغلق نے خان جہاں ایک امیر کے لڑکے ملک راجی کو خاندیس کا علاقہ جاگیر میں دیا۔ ملک راجی تال نیر میں آکر ٹھہرا۔ راجہ بہارجی کو پہلے فرماں بردار بنایا۔ لوٹ اور نذرانہ کے مال سے پانچ بڑے اور دس چھوٹے ہاتھی دکنی بادشاہوں کے طرز پر سج کر اور دوسرے تحفوں کے ساتھ سلطان فیروز کی خدمت میں روانہ کئے۔ سلطان نے خوش ہوکر سہ ہزاری کا عہدہ دیا کچھ عرصہ کے بعد اس کے پاس بارہ ہزار تجربہ کار سپاہی جمع ہوگئے۔ چونکہ ان کے خرچ کے لئے خاندیس کی آمدنی کافی نہ ہوئی تھی اس لئے پاس کے راجوں سے نذرانہ وصول کرتا تھا۔

محمود تغلق کے زمانہ میں ملک راجی نے جو عادل خان کے لقب سے خود مختار ہو چکا تھا۔ سلطانپور کا علاقہ دبالیا۔ مظفر شاہ گجراتی نے لڑکر واپس لے لیا۔ چونکہ ملک راجی حضرت عمر فاروق کے خاندان سے تھا۔ اس لئے مظفر شاہ ہمیشہ اس کا ادب کرتا۔ عادل خان ۱۳۹۸ء ۸۰۱ھ میں وفات پاگیا۔

عادل خان کے بعد نصیر الدین فاروقی اس کا لڑکا قائم مقام ہوا۔ اس نے عالموں اور فاضلوں کو دربار میں جمع کیا۔ شہر برہان پور آباد کرکے اس کو پایہ تخت بنایا۔ آسا اہیر سے قلعہ آسیر چھین، بہار، مالوہ کے بادشاہ کے لڑکے غزنین خان سے مل کر سلطان پور کا علاقہ دبالیا لیکن احمد شاہ گجراتی نے جب شکست دی تو نصیر خان قلعہ بند ہوگیا اور مجبور ہوکر معافی مانگ لی۔ چند سال کے بعد احمد شاہ بہمنی کے لڑکے سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ ۱۴۲۹ء ۸۳۳ھ میں جھالاواڑ کا راجہ بھاگ کر آسیر میں آیا۔ نصیر خاں نے اپنے کو کمزور سمجھ کر اس کو سلطان بہمنی کے پاس بھیج دیا۔ نصیر خان کا ملک التجار سلطنت کا دعویدار تھا۔ اس نے لڑکر نصیر خان کو ایک لڑائی میں شکست دی۔ نصیر خان کو اس شکست سے اتنا صدمہ ہوا کہ ۱۴۳۷ء ۸۴۱ھ میں مرگیا۔

نصیر خان کا لڑکا میران عادل خان تخت کا مالک ہوا۔ اس نے گجرات کی فوجوں کی مدد سے اپنے چچا ملک التجار کو شکست دی۔ لیکن جلد ہی ۱۴۴۰ء ۸۴۴ھ میں وہ بھی مرگیا۔ پھر عادل خان کا لڑکا مبارک خان بادشاہ ہوا۔ جس نے ۱۷ سال سے زیادہ انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ مخلوق خوشحال رہی۔ کیونکہ وہ لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ بچتا رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عادل خان ثانی

Marfat.com

بک لقب سے بادشاہ ہوا۔ اس نے گونڈواڑہ اور گدھ منڈل کے راجوں کو فرمانبردار بنایا اور گولیوں اور بھیلوں کی ڈکہ زنی کو روکا۔ قلعہ آسیر کے علاوہ اسی پہاڑ پر ایک دوسرا قلعہ مالی گڈھ بنایا اس نے اور بہت سی عمارتیں بنوائیں اسی زمانہ میں برہان پور بڑا پر رونق شہر بن گیا ۴۶ سال سے زیادہ حکومت کر کے ۱۵۰۳ء ۹۰۹ھ میں وفات پاگیا۔

اولاد نہ ہونے کے سبب اس کا بھائی داؤد خان تخت پر بیٹھا آٹھ سال کے بعد ۹۱۴ھ میں وہ مرگیا۔ دس روز اس کے لڑکے نے سلطنت کرنے پائی تھی کہ "عالم خان" نامی اس خاندان کا ایک اور شخص بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن درباری امیروں کی بے اتفاقی دیکھ کر نصیر خان کا لڑکا عادل خان سوم اپنے نانا سلطان محمود اول گجراتی کی مدد سے تخت کا مالک ہوگیا اس نے نظام شاہ بحری سے چند قلعے چھین لئے اور کالنہ کے راجہ کو بھی فرمانبردار بنایا۔ ۱۵۱۹ء ۹۲۶ھ میں بیمار ہوکر وفات پاگیا باپ کے بعد میراں محمد شاہ تخت کا وارث ہوا۔ ان دنوں احمد نگر اور بہار کے بادشاہوں میں لڑائی ہورہی تھی۔ میراں محمد شاہ کے ذریعہ سے بہادر شاہ گجراتی نے ان میں صلح کرادی۔ مگر احمد نگر کے بادشاہ نظام شاہ نے قریب سے چند قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اس لئے برار اور خاندیس کے دونوں بادشاہوں نے مل کر اس پر حملہ کیا۔ مگر بدقسمتی سے انہوں نے شکست کھائی۔ انہوں نے بہادر شاہ گجراتی سے مدد مانگی جس نے برار اور نظام شاہ دونوں کو اپنا باجگزار بنایا۔

ہمایوں کے چلے جانے کے بعد جب بہادر شاہ گجراتی نے دوبارہ گجرات پر قبضہ کیا تو اس کے حکم سے میراں محمد شاہ نے مالوہ کے مغل حاکموں کو نکال دیا۔ بہادر شاہ کے شہید ہوجانے کے بعد گجرات کے امیروں نے اسی کو بادشاہ تسلیم کرلیا۔ میراں محمد شاہ گجرات جانے کی تیاری میں مشغول تھا کہ ۱۵۲۵ء ۹۴۲ھ میں مرگیا۔

میراں محمد شاہ کے لڑکے چھوٹے تھے۔ اسی لئے اس کے بھائی مبارک شاہ ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب عماد الملک گجرات سے بھاگ کر برہان پور میں آیا تو مبارک شاہ ایک فوج لے کر گجرات فتح کرنے کے لئے چلا مگر محمود گجراتی نے شکست دے کر پہلے کی طرح خراج بھیجنے پر اس کو مجبور کرلیا۔ ۱۵۶۱ء ۹۶۹ھ میں باز بہادر مالوہ کا بادشاہ بھاگ کر برہان پور آیا اور مغل افسر پیر محمد خان اس کے پیچھے پیچھے برہان پور تک لوٹ مار کرتا ہوا پہنچا۔ مبارک شاہ نے صوبہ برار کے حاکم کی مدد سے مغلوں کو ملک سے باہر نکال دیا۔ مبارک شاہ ۳۲ سال حکومت کرکے ۱۵۶۶ء ۹۷۴ھ میں انتقال کرگیا۔

Marfat.com

مبارک شاہ کا بیٹا محمد شاہ دوم اب بادشاہ ہوا، سلطنت کے شروع میں چنگیز خان بھروچی نے سلطان پور اور نذر بار سے لیا اور پھر تھال نیر کو بھی لینا چاہا تھا کہ محمد شاہ نے برار کے حاکم کی مدد سے اس کو واپس لے لیا۔ کچھ دنوں کے بعد ۳۲ ہزار کا لشکر لے کر گجرات پر حملہ آور ہوا۔ لیکن شکست کھا کر واپس آ گیا نظام شاہ کے خاندان کے ایک شخص نے نظام شاہ کے مقابلہ میں بغاوت کی، محمد شاہ نے اس باغی کو مدد دی۔ نظام شاہ باغی کو شکست دے کر برہان پور آ پہنچا۔ محمد شاہ مجبوراً قلعہ میں بیٹھ گیا۔ آخر میں تین لاکھ دے کر نظام شاہ سے صلح کر لی۔ ۱۵۷۶ء ۹۸۴ھ میں وہ بیمار ہو کر وفات پا گیا۔

اس کے نابالغ لڑکے حسن خان کو تخت سے اتار کر راجہ علی خان اس کا چچا بادشاہ ہوا اس وقت اکبر دہلی کا بادشاہ تھا۔ راجہ علی خان اکبر سے بھی ربط وضبط رکھتا اور نظام شاہ سے ملا رہتا۔ ۱۵۹۲ء ۱۰۰۲ھ میں کچھ لوگ نظام شاہ کے مخالف ہو کر اس کے پاس پہنچے۔ اس نے ان کو نظر بند کرنا چاہا۔ مگر وہ لڑ بھڑ کر اکبر کے پاس پہنچ گئے اور راجہ علی کی شکایت کی۔ راجہ علی بھی تحفے اور ہدیئے بھیج کر معافی کا خواستگار ہوا۔ ۱۵۹۳ء ۱۰۰۳ھ میں اکبر نے دکن پر چڑھائی کی۔ راجہ علی نے مصلحت دیکھ کر نظام شاہ کے ساتھ مل کر دونوں کا مقابلہ کیا۔ رجب ۱۵۹۵ء ۱۰۰۴ھ میں شہزادہ مراد پھر دکن فتح کرنے کے لئے آیا، راجہ علی نے شاہزادہ کا ساتھ دیا۔ عین لڑائی میں دکنیوں کی آتش بازی سے راجہ علی خان وفات گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بہادر خان بادشاہ ہوا، لیکن اکبر سے باغی ہو گیا۔ اس لئے وہ فوج لے کر برہان پور پہنچ گیا۔ اور خاندیس پر قبضہ کر کے بہادر کو ۱۰۰۸ھ میں لاہور بھیج دیا۔ راجہ علی علم دوست تھا۔ اس کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔

ہنور کی ریاست

مغربی گھاٹ کی ایک چھوٹی سی باجگذار ریاست ہنور تھی۔ جو بہت ہی کم مدت میں ختم ہو گئی ہنور کو آج کل ہونور کہتے ہیں اور جو اب احاطہ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں یہ ایک اچھا خاصہ شہر تھا۔ اور مندر سے آدھ میل کا فاصلہ پر ایک بڑی کھاڑی کے کنارے پر تھا۔ عرب کے تاجروں کی آمد و رفت سے وہاں بڑی رونق تھی اس زمانہ میں یہاں جمال الدین محمد بن حسن نے اپنی سلطنت قائم کی تھی۔ اس کا باپ حسن ناخدا ایک جہاز ران تھا۔ اس کے بیٹے نے قوت پیدا کر کے اس ریاست کی بنیاد ڈالی

Marfat.com

جو برائے نام ہندو راجہ ہری ہر دوم کے ماتحت تھی۔ سلطان کے پاس چھ ہزار فوج اور بہت سے جنگی جہاز تھے۔ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر شافعی مذہب کے تھے۔ اس کے قریب ہی سنداپور میں جس کا اب مشہور نام گوا ہے ایک ہندو ریاست تھی۔ اس کے راجہ اور اس کے بیٹے میں کسی سبب سے مخالفت ہوئی بیٹے نے سلطان کو لکھا کہ اگر اس کی مدد کی جائے تو وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ سلطان نے کہا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے گا۔ تو وہ اپنی بہن سے اس کی شادی کر دے گا اس قرارداد کے مطابق سلطان نے باون جنگی جہازوں سے سنداپور پر حملہ کر کے فتح کر لیا اس فتح پر ابھی چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ راجہ نے پھر حملہ کیا سلطان کا لشکر بے خبر گاؤں میں پھیلا تھا وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ اور بری طرح گھر گیا۔ اور اسی میں تباہ ہو گیا۔

اس کا بحری بیڑہ کافی طاقتور تھا۔ اور اسی لئے مالابار کے بعض راجہ اس کے باجگذار تھے۔ اس کی فوج اس زمانے کے نئے جنگی سامان سے مسلح رہتی، منجنیق اور تارگول کا استعمال ہوتا۔ خاص قسم کا جنگی جہاز تیار کرایا گیا۔ جس کے اندر ہی اندر فوج مسلح اور گھوڑے پر سوار ہو جاتے اور جہاز سے اترتے ہی حملہ کر سکے۔

علم کا پرچار جیسا اس ریاست میں تھا۔ جنوبی ہندوستان کے اور شہروں میں نہ تھا۔ صرف ہنور میں ۱۳ مدرسے لڑکیوں کے اور ۲۳ لڑکوں کے جاری تھے۔ جہاں اکثر لڑکیاں حافظ قرآن ہوتیں۔ عالم اور فاضل بھی کثرت سے یہاں تھے۔ شہروں کے قاضی اور مسجدوں کے خطیب نامور عالموں میں سے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے فقیہہ دربار میں حاضر رہے کئی خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، کھیتی باڑی کی وہاں کے لوگوں کو رغبت نہ تھی۔ دریا کے کنارے ہونے کے سبب سے تجارت سے زیادہ نفع اٹھاتے۔

بادشاہ ریشم اور کتان کا استعمال کرتا اور باہر جاتے وقت عبا اور عمامہ سر پر رکھ لیتا عورتیں صرف ساڑیاں پہنتیں، جو عام طور پر ریشم کی ہوتیں۔ اور ناکوں میں بلاق استعمال کرتیں عورت اور مرد دونوں بال رکھتے، بادشاہ جب باہر نکلتا تو اس کے آنے پر نقارہ اور طبل بجتا۔ ہندوؤں پر مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی اثر تھا۔ لڑائی کے فن میں ہندو مسلمانوں کی پیروی کرتے بری اور بحری فوج میں بڑے بڑے افسر مسلمان رکھے جاتے۔ اس کے علاوہ عام فوجی بھرتی میں بھی مسلمانوں کی تعداد کافی ہوتی۔

لیکن رہنے سہنے کی باتوں میں مسلمانوں پر ہندوؤں کا اثر تھا۔ چاول، ترشی اور گرم پانی

Marfat.com

عام طور پر استعمال کرتے حالانکہ غیر ملکوں سے گیہوں باسانی آسکتا تھا۔ کھانے کا طریقہ بھی کچھ ہندوانہ تھا۔ الگ الگ برتنوں میں کھاتے۔ اور چمچہ سے ہر ایک کو الگ الگ تھال میں دہی، تھال ہی میں چاول کے ساتھ ہر قسم کے سالن رکھ دیتی جیسا کہ آج بھی ہندوؤں کے یہاں یہ طریقہ موجود ہے۔

ہندوؤں میں برہمن اور غیر برہمن کا فرق اس وقت تھا۔ چھوت کا مسئلہ آج سے زیادہ اہم اس وقت تھا۔ عوام کیلے کے پتوں پر کھاتے یا پیتل کے برتنوں میں راجہ اور بادشاہ سونے اور چاندی کا برتن بھی استعمال میں لاتے۔ آج کی طرح اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کو گھر میں جانے نہیں دیتے نہ ان کے ساتھ کھاتے پیتے نہ اپنے برتنوں میں کھانے دیتے مگر عام طور سے مسلمانوں سے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے۔ عام لوگ زیادہ تر بدھ جینی اور شیو کے پجاری تھے۔ مسلمانوں میں زیادہ تعداد شافعیوں کی تھی۔

Marfat.com

نظام حکمرانی

سلطنت دہلی

سوال: سلاطین دہلی کے دور میں نظام حکمرانی کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالیے۔

اسلامی ریاستوں کی حکمرانی کے اصول سمجھنے کے لئے رسول کریم صلعم کی قائم کردہ ریاست مدینہ پہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روح جو اس نظام حکمرانی کی بنیاد تھی کچھ عرصہ کے بعد کمزور پڑتی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظام میں دستوری دفعات سے زیادہ حکمران اور عمال حکومت کے ذاتی کردار اور عقیدوں پہ زور دیا گیا ہے اور کردار اور اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے حکمرانوں کے لئے تحریری دستور غیر ضروری ہے اس لئے کہ بنیادی اصول خود اسلامی تعلیمات میں موجود ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلامی ریاست کے لئے نیا دستور بنانا ہے۔ اگر یہ لوگ محسوس کریں جیسا کہ موجودہ دور میں ہم محسوس کرتے ہیں تو ان ہی تعلیمات کی بنیاد پہ دستور بنایا جا سکتا ہے جہاں تک اسلامی ریاست کا تعلق ہے قرون وسطیٰ میں بھی جب تحریری دستور کا تخیل وجود میں آیا تھا وہ بنیادی اصول تحریری شکل میں موجود تھے جن پر عمل کرنا ضروری تھا بہر حال یہ واقعہ ہے کہ چار خلفاء راشدین کے بعد جب خلافت بنو امیہ کے ہاتھوں میں آئی تو اس کا رنگ بدل گیا۔ وراثتی حکومت، نسلی حقوق، ذاتی و خاندانی مفاد جن کو ختم کرنے کی اسلام نے بہ اصرار تاکید کی تھی پھر عیاں ہونے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ یزید جیسے بدکردار نوجوان کی بیعت لے کر امیر معاویہ نے اسلام کے تخیل حکمرانی کو زبردست صدمہ پہنچایا اپنے اس اقدام سے انہوں نے خاندانی حکومت کی ایسی بنیاد رکھی کہ کوئی قوت اس کو ہٹا نہ سکی۔ حکمران خاندان ضرور بدلتے رہے لیکن خاندانی حکومت کا اصول نہ بدلا۔ یہاں اس پر بحث کرنا ممکن نہیں کہ اسلام کی تاریخ پہ یہ طریقہ کس طرح اثر انداز ہوا۔ اور اس سے کتنے دور رس نتائج پیدا ہوتے لیکن اتنا اشارہ ضروری ہے کہ جمہوریت اور شورائی نظام جس پہ اسلام نے اتنا زور دیا تھا کمزور

Marfat.com

ہوتا چلا گیا۔ بہر حال جمہوریت کی ظاہری شکل کو بیعت اور خطبہ کی شکل میں قائم رکھا گیا۔ فتوحات کی وسعت اور آبادی میں اضافہ کے بعد بیعت کی نوعیت بھی بدلتی گئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ بعض ممالک میں حکمران کے نام کو خطبہ میں شامل کر لینا کافی سمجھا جانے لگا۔ بہر حال خلیفہ کو خلیفہ اسلام یعنی تمام مسلمانوں کا نمائندہ حکمران سمجھا جاتا رہا۔ جو علاقہ اس کے زیر حکومت تھا اس کی ذمہ داری اس پر براہ راست تھی مگر عالم اسلامی کی دوسری مملکتیں بھی خلیفہ کو اپنا سربراہ مانتی تھیں ریاستی نظریات کے لحاظ سے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت ایک خاص نوعیت کی تھی۔ مغربی مستشرقین میں سے اکثر خلافت کی صحیح نوعیت نہیں سمجھ سکے اور انہوں نے لکھ دیا کہ خلیفہ مسلمانوں کا "پوپ" اور "شہنشاہ یک جا" تھا۔ یہ قطعاً غلط ہے اس لئے اسلام میں پوپ اور پریسٹ (پروہت) کی کوئی گنجائش نہیں۔ جس دور میں خلیفہ کے ہاتھ میں حکومت کے واقعی اختیار تھے اور وہ براہ راست علاقوں پر حکومت کرتا تھا اس زمانہ میں بھی اس کو شریعت کے آگے اسی طرح سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا جیسے کہ ایک معمولی حیثیت کے مسلمان کو بہر حال زمانہ گذرنے کے ساتھ خلیفہ کا سیاسی وقار اور انتظامی اقتدار کم ہوتا گیا پھر بھی برائے نام اس کی اعلیٰ حیثیت قائم ہی رہی۔ سلطان محمود غزنوی جیسے شان و شوکت رکھنے والے حکمران بھی یہ ضروری سمجھتے تھے۔ کہ منشور خلافت حاصل کریں۔ بعد کی صدیوں میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سلاطین دہلی میں سے کئی نے یہ منشور حاصل کرنا ضروری سمجھا[1] ایک اور اہم پہلو خلافت کی تاریخ کا یہ ہے کہ بعد میں وجود میں آنے والی سلطنتوں نے خلافت کی انتظامی روایات کو اپنا راہنما بنایا بعض عہدوں کے نام بھی وہی رکھے لیکن بعض ناموں میں مقامی ضروریات کے تحت کچھ تبدیلیاں کر دی گئیں۔

سلطان علم سیاسیات کی اصطلاحوں کا لحاظ کرتے ہوئے سلطان دہلی کو مطلق العنان

---

[1] سلاطین دہلی میں پہلا سلطان جس نے خلافت سے منشور حاصل کیا، ایلتمش تھا اس وقت خلافت کا مرکز بغداد تھا۔ بغداد کی تباہی (۱۲۵۸ء) کے بعد ایک مدت تک خلیفہ کی حیثیت کمزور رہی یہی سبب تھا کہ خلجی سلاطین کے عہد میں کوئی منشور نہیں آیا محمد بن تغلق نے اس کو پھر جاری کیا اس وقت خلیفہ کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار نہ تھا اور وہ مصر میں مقیم تھا یہ امر قابل ذکر ہے کہ بغداد کی تباہی کے تین سال بعد ہی مصر میں عباسی خاندان کے فرد کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا

Marfat.com

شمار کیا گیا ہے۔ لیکن واقعتہً یہ صحیح نہیں ہے۔ جس معنی میں مطلق العنان کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر اسلامی ریاست کے حکمران کے لئے اس کا استعمال درست ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حکمرانی میں اقتدار اعلیٰ صرف شریعت کو حاصل ہے۔ شرعی احکام مسلمانوں کی اجتماعی اور پبلک زندگی کے لئے بھی اس قدر ضروری ہیں۔ جیسے کہ ان کی انفرادی زندگی کیلئے چونکہ خلیفہ خود بھی امت اسلامیہ کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اس لئے شریعت کے سامنے اس کی اور ایک عام مسلمان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں اجتماعی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے۔ خلیفہ کو اہم ترین ذمہ داری سونپی جاتی ہے یعنی قوانین شرعیہ کا نفاذ یہاں بھی قانون کی ترجمانی کے لئے اس کو فقہا اور مجتہدین سے مدد لینا پڑتی تھی۔ نظریاتی طور پر اس کی حیثیت مطلق العنان نہیں بلکہ دستوری ہے مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں ہم کو بہت سی مثالیں ایسے فرماں رواؤں کی ملیں گی جنہوں نے شرعی قوانین کی پابندی نہیں کی یا ان کو پس پشت ڈال دیا۔ خود ہندو مسلمان کے مسلم حکمرانوں کی فہرست بغور دیکھی جائے تو زیادہ ایسے ہی نظر آئیں گے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق تو نجی زندگی سے تھا جیسے شراب نوشی وغیرہ۔ ان کو یہاں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شریعت کے ان احکامات کی خلاف ورزی جن کا اثر سیاسی اصولوں پر پڑتا ہو یا جن سے امت کی اجتماعی زندگی متاثر ہوتی ہو زیر بحث لائے جاسکتے ہیں اور لائے جاسکتے ہیں۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ عہد سلطنت کا مکمل جائزہ لیا جائے۔ لیکن ہم سب سے اہم اور سب سے زیادہ دہرائے جانے والی مثال کی طرف مختصراً اشارہ کر سکتے ہیں۔ قاضی مغیث الدین نے علاؤالدین خلجی کے متعدد اقدامات کے متعلق ہی رائے دی کہ سلطان شرعی قوانین کی حدود سے تجاوز کر گیا تھا۔ علاؤالدین درشت مزاج حکمران تھا اور قاضی کی کوئی حیثیت اس کے سامنے نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ہم کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ قاضی نے سلطان پر تنقید کرتے وقت شریعت کے وقار کا پورا خیال رکھا اور ذرا نہیں ڈرا۔ ساتھ ہی یہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ سلطان نے بجائے ناراض ہونے کے اور قاضی کو سخت سست کہنے کے یہ معذرت کی کہ وہ قانون سے واقفیت نہیں رکھتا اور جو کچھ اس نے کیا عوام کے مفاد کے لئے کیا۔ اس کے معذرت آمیز جواب اس امر کی بین شہادت ہیں کہ شریعت کی بالادستی کو علاؤالدین تسلیم کرتا تھا بالفاظ دیگر وہ خود کو اس حد تک مطلق العنان نہیں سمجھتا تھا کہ قانون کا احترام نہ کرے اس سے بھی زیادہ

Marfat.com

اہم بات یہ ہے کہ علاؤالدین نے قاضی مغیث سے یہ نہیں کہا کہ قوانین شریعت کا جو مطلب اس نے بیان کیا ہے وہ غلط ہے۔ یعنی یہ دعویٰ اس لئے نہیں کیا کہ قانون کی ترجمانی میں کروں گا۔[1]

مختصراً یہ کہ گفتگو سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام نے حکمران کے اختیارات کو کس طرح کم کیا ہے۔ شریعت کی بالادستی کے علاوہ سلطان کی مطلق العنانی کو روکنے کے لئے ایک اور بھی قوت تھی کوئی حکمران اپنے مشیروں اور وزیروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہی نہیں کہ ان کا مشورہ اس لئے ضروری تھا کہ ہر پالیسی کو عملی شکل دینے کی ذمہ داری زیادہ تر ان پر ہوتی تھی کہ سلطان کے لئے یہ خوف بھی ہر وقت موجود تھا کہ اگر اس کی پالیسیاں ان لوگوں کی رائے کے خلاف ہوں گی تو بھی اس کا امکان قوی ہو جائیگا۔ امراء کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے۔ متعدد موقعوں پر ان لوگوں نے سلاطین کی وصیتوں کو نظر انداز کیا مثلاً ایلتمش اور بلبن نے جن کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ ان کو تخت پر نہیں بٹھایا گیا ایک اور پہلو بھی اس مسئلہ کا قابل غور ہے۔ یوں تو عوام کو اپنے حقوق منوانے کے لئے کوئی قانون موجود نہ تھا لیکن جو حکمران ان کے مفاد کو نظر انداز کرتا رہتا تھا وہ زیادہ مدت تک تخت پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ حکمران کی اہلیت اور اس کی حکومت کی کامیابی صرف اس سے دیکھی جاتی تھی کہ وہ عوام میں کتنا مقبول ہے اس میں چند اوصاف تو ضروری سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً ہمت، شجاعت، سخاوت، دوراندیشی اور خداترسی ان اوصاف کا مظاہرہ جتنا زیادہ ہوتا تھا اسی قدر اس کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بڑھتی جاتی تھی۔ محمد بن تغلق کو علمی قابلیت اور ذاتی خصوصیات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس نے عوام کی خواہشات کو نظر انداز کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا۔ اس سے وہ انتہائی مقبول حکمران ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی وفات کا ذکر برنی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ لوگوں کو اس سے چھٹکارا مل گیا۔ تاریخ کے صفحات ہم کو یہ بھی بتلاتے ہیں کہ امراء کے علاوہ سلاطین کو علماء و فضلاء کی حمیت اور مشائخ کے پند و نصائح سے بھی بہت فائدہ پہنچتا تھا۔ ان واقعات کے پیش نظر سلطنت دہلی کے حکمرانوں کو مطلق العنان کہنا حقائق سے دور ہوگا۔

---

[1] قاضی مغیث اور سلطان علاؤالدین کی گفتگو کے لئے دیکھو تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۹۰ - ۹۶

Marfat.com

مجلس خاص و مجلس عام

سلطان کا اپنے وزراء اور دیگر مشیروں سے مشورہ کرنے کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ان مشیروں اور درباریوں کو جو تقریباً ہر مجلس مشاورت میں موجود رہتے تھے۔ ہم کونسل کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کا باضابطہ وجود نہ تھا اور نہ ان لوگوں کو قانونی حیثیت دی گئی تھی یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی معاملہ میں سلطان کو ان کی رائے پسند نہ آتی تو وہ اس کو نظرانداز کر دیتا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا جب کسی نہایت اہم یا نازک مسئلہ پر مشورے کی ضرورت ہوتی تو سلطان مجلس خلوت طلب کرتا اس میں کم لوگ ہوتے مگر صرف وہی بلائے جاتے تھے جن کا اثر اور اصابت رائے مسلم ہوتے باوجودیکہ بحیثیت مستقل ادارے کے کونسل کا وجود نہ تھا ہم کو اس قسم کے مشوروں کا حوالہ گاہ بگاہ ملتا ہے۔

اس کے علاوہ دربار عام (مجلس عام) کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے اس کا طریقہ کار بھی مختلف تھا اور مقصد بھی، خود سلطان اس میں موجود رہتا اور بڑے بڑے امراء و عمائدین شرکت کرتے اکثر بیرونی ممالک کے سفراء بھی یہاں بلائے جاتے تھے۔ دربار عام کے تفصیلی بیانات تاریخوں میں مل جاتے ہیں۔ تخت ایک چبوترے پر رکھا جاتا تھا اس پر سلطان بیٹھتا تھا اس کے قریب وزراء اور دوسرے امراء کھڑے ہوتے تھے ہر شخص کو دربار کے مخصوص آداب کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا وہ اس پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ منجملہ اور معاملات کے اہم مقدموں کے آخری اپیل بھی یہی ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہفتہ میں دو بار اپنے محل کے سامنے کھلے میدان میں دربار کرتا تھا۔ غالباً یہ رسمی دربار کے علاوہ تھا۔

نائب الملک

سلطان کے بعد یہ سب سے بڑا منصب تھا۔ اس کی حیثیت دوسرے وزراء سے زیادہ ہوتی تھی وہ سلطان کی عدم موجودگی میں دار الحکومت کے معاملات سنبھالتا تھا اور اس کی مجلس مشاورت میں بھی شرکت کرتا تھا۔ کمزور حکمرانوں کے زمانہ میں نائب الملک ہی حکومت کرتا تھا لیکن علاؤالدین جیسے طاقتور سلطان اس کو اپنی پالیسی میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتے تھے بعض سلاطین نے تو اس عہدہ کو پُر ہی نہیں کیا۔

Marfat.com

دیوانِ وزارت

حکومت کا کام مختلف محکموں یا وزارتوں میں تقسیم تھا۔ ہر ایک کا علیحدہ وزیر افسر اور دفاتر ہوتے تھے۔ عام طور پر سلطان کی ایک کیبنٹ ہوتی تھی جس میں چار وزیر ہوتے۔ یہ اراکین سلطنت سمجھے جاتے تھے۔ بغرا خان نے اپنے بیٹے سلطان کیقباد کو جو نصیحتیں کی تھیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ چار اراکین سلطنت مقرر کر کے حکومت کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کرنا چاہیں۔ ان چاروں میں وزیر (یعنی وزیر مالیات) کا عہدہ سب سے اہم اور بلند تھا۔ لیکن ایک وزیر کسی دوسرے وزیر کے محکمہ میں مداخلت کا حق نہیں رکھتا تھا وزارت کا عہدہ سب سے پہلے عباسیوں نے ختم کیا وہاں وہ وزیر اعلیٰ کہلاتا تو نہیں تھا لیکن اس کے اختیارات اس قسم کے تھے۔ مشہور مصنف ماوردی نے وزیر کی دو قسمیں بتلائی ہیں۔ وزیر توفیض اور وزیر تنفیذ۔ وزیر توفیض کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے وہ ماسوا چند باتوں کے سب کچھ کر سکتا تھا مثلاً یہ کہ اس کو اپنے جانشین کی نامزدگی کا اختیار نہیں تھا اس کے علاوہ سلطان کو اختیار ہوتا تھا کہ اس کے حکم کو منسوخ کر دے۔ اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا۔ وزیر تنفیذ کے فرائض میں یہ داخل تھا کہ حکمران کے احکامات نافذ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ وزیر کی ذمہ داریاں وسیع بھی تھیں اور مختلف النوع بھی اس لئے اس کے اختیارات بھی وسیع ہوتے تھے۔ اپنے عہدے کی وجہ سے وہ اکثر رشک و حسد کا نشانہ بن جاتا تھا۔ کیونکہ محصولات وصول کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی اس لئے وہ مختلف طبقوں میں نامقبول ہو جاتا تھا۔ اگر وصول یابی میں وہ سختی کرتا تو لوگ اس کے مخالف ہو جاتے اور اس میں نرمی سے کام لیتا تو خزانہ کو نقصان پہنچتا۔ اس طرح اس کی حیثیت انتہائی نازک تھا۔ وزیر کا سیکرٹریٹ و دیوان وزارت بہت وسیع ہوتا تھا۔ نائب وزیر کے علاوہ اس دیوان میں اکونٹنٹ جنرل اور آڈٹ جنرل کے دفاتر بھی ہوتے تھے۔ مسالک الابصد کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے وزیر کے پاس چار دبیر تھے اور ان میں سے ہر ایک کا دفتر یا سیکرٹریٹ علیحدہ تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دفاتر کی ترتیب اور ان کا کام نہایت قاعدہ کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

Marfat.com

دوسری وزارتیں

وزارت مالیات کے بعد دوسری اہم وزارت دیوان رسالت تھی جس کے سپرد دینی امور، علماء وفضلاء اور اوقاف کے معاملات تھے۔ دیوان رسالت کا سربراہ صدرالصدور یا قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ مسجد کے اماموں اور خطیبوں اور شہروں اور قصبوں میں قاضیوں کا تقرر اسی وزارت کے ذمہ تھا۔ اقطاع اور ولایات میں جو قاضی مقرر ہوتا وہ اپنے علاقہ کا صدر بھی ہوتا تھا۔

دیوان عرض

حکومت کا تیسرا رکن عارض ممالک تھا جس کو آج کل کے اصطلاح میں وزیر دفاع کہہ سکتے ہیں۔ سپاہیوں کی بھرتی میں اس کی مدد کے لئے بہت سے افسر ہوتے تھے۔

دیوان انشاء

دیوان انشاء یعنی سلطانی سیکرٹریٹ کا افسر اعلیٰ دبیر خاص کہلاتا تھا۔ اس کے فرائض اس قسم کے تھے کہ سلطان کا اس سے قریبی تعلق رہتا تھا۔ اس کی راز کی باتیں بھی دبیر خاص کو معلوم رہتی تھیں کیونکہ ہر قسم کی اہم مراسلت اسی ہی کی نگرانی میں ہوتی تھی اور سلطان کی طرف سے جوابات کا پہلا مسودہ وہی تیار کرتا تھا۔ فرامین اور دوسرے حکمنامے بھی وہی مرتب کرتا تھا۔ دبیر خاص کی ایک اہم ذمہ داری یہ تھی کہ فتوحات کے واقعات کو فتح ناموں کی شکل میں تحریر کرے۔ ان میں اکثر مسجع اور مقفی عبارت لکھی جاتی تھی۔ دبیر خاص وہی شخص ہوتا تھا جو ذہن رسا رکھتا تھا اور جس کی معلومات وسیع ہوتی تھیں کیونکہ اکثر دبیر خاص کو ترقی دے کر وزیر بنا دیا جاتا تھا۔

برید

ان چار وزارتوں کے علاوہ نظام حکومت سے متعلق متعدد محکمے اور دفاتر تھے

Marfat.com

ان میں سے بعض اہم محکموں کا ذکر کیا جا سکتا ہے - ان کے اختیارات اور ذمہ داریاں مختلف تھیں مثلاً برید ممالک کی حیثیت بہت عہدہ تھی اور اس کے فرائض میں بہت سی اہم باتیں شامل تھیں وہ اپنے ماتحتوں کے ذریعہ جن کا تقرر مختلف علاقوں میں ہوتا تھا وہاں کے معاملات سے خود کو باخبر رکھتا تھا - اس عہدہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر صرف ان لوگوں کا تقرر کیا جاتا تھا جو اپنی ذہانت اور قابلیت کے لئے مشہور ہوتے تھے - مقامی اور علاقائی برید اور محکمہ کے دوسرے افسر صرف بغاوتوں اور سازشوں ہی سے مرکزی حکومت کو باخبر نہیں رکھتے تھے بلکہ مختلف امور کے متعلق رپورٹیں بھیجتے تھے - مثال کے طور پر حکام کی زیادتیاں یا کاشت کاروں کی حالت وغیرہ - مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ واقعہ جس کی کچھ بھی اہمیت ہوتی اس کے متعلق برید مرکز کو اپنی رپورٹ بھیجتا تھا - برید کی رپورٹوں کے علاوہ اکثر مرکزی حکومت اور بھی طریقوں سے معلومات حاصل کرتی تھی - اس طرح یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ برید کے محکمہ نے کسی فرض کی انجام دہی میں کوتاہی تو نہیں کی - علاؤالدین نے بہت بڑی تعداد میں اپنے جاسوس مقرر کئے تھے جن کی وجہ سے تقریباً ہر اہم معاملہ کی اطلاع مل جاتی تھی -

امیر حاجب : باربک

امیر حاجب کو ہم موجودہ اصطلاحات میں ماسٹر آف دی سیری منیز (MASTER OF THE CEREMONIES) کہتے ہیں - اسی کے فرائض میں تھا کہ یہ دیکھے کہ ہر شخص دربار کے آداب کو ملحوظ رکھتا ہے اور خلاف قاعدہ کوئی کام نہیں کرتا لوگوں کی درخواستیں جو سلطان کو پیش کی جاتی تھیں ان کا انتظام بھی اسی کے سپرد تھا چونکہ یہ عہدہ وقار کے لحاظ سے بہت بلند سمجھا جاتا تھا اس لئے اس پر اکثر شاہی خاندان کے افراد کا تقرر کیا جاتا تھا - سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں فیروز شاہ اس عہدہ پر فائز تھا - امیر حاجب کے ماتحت متعدد حجاب اور دوسرے افسر ہوتے تھے -

وکیل در

وکیل در کے سپرد شاہی خاندان اور محل کے جملہ امور ہوتے تھے اس سلسلہ

Marfat.com

بیں امراء کے علاوہ شاہی خاندان کے افراد سے متعلق بھی بہت سے معاملات کی نگرانی وغیرہ اسی کے فرائض میں داخل تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ یہ عہدہ بہت اہم سمجھا جاتا تھا اور یہ افسر بہت زیادہ اثر رکھتا تھا۔

مالیات

عہد وسطیٰ میں حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کا لگان تھا اسلامی ریاستوں میں زیر کاشت زمین دو قسموں میں منقسم ہوتی تھی۔ عشری اور خراجی بالعموم عشری زمین وہ ہوتی تھی جس پر مسلمان کاشت کرتے تھے۔ برصغیر میں عشری زمین خراجی کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ مسلم فاتحین نے قدرتی طور پر ابتداء میں وہی طریقہ جاری کیا جس کا ہندو عہد میں رواج تھا۔ جہاں ضرورت محسوس کی اس میں خفیف سی تبدیلیاں کر دیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم تو یہ تھا کہ حکومت کے حصہ کی شرح متعین کی جائے اور دوسرا یہ کہ اس کی وصولیابی کس طرح جائے۔ فصل کو تقسیم کرنا یعنی بٹائی ان حالات میں سب سے بہتر طریقہ تھا لیکن اس کے لئے بہت سے کارکنوں کی ضرورت تھی جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ وصولیابی کے سلسلہ میں حکومت کو بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ ملازمین کی جس قدر تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ اسی قدر دقتیں زیادہ ہوتی جاتی تھیں۔ ان دقتوں اور اخراجات کی زیادتی کے پیش نظر اندازہ (APP RAISE MENT) کا طریقہ نکالا گیا۔ تجربہ اور مہارت رکھنے والے لوگ کھڑی فصل کی قیمت کا اندازہ لگانے اور اسی بنیاد پر حکومت اور لگان دینے والے کے درمیان معاملہ طے پا جاتا ہے۔ اس کے لئے زمین کی پیمائش ضروری تھی۔ اس لئے اس کا یہی نام پڑ گیا (یعنی مساحت) یہ تین طریقے تھے جن کا سلطنت کے مختلف علاقوں میں رواج تھا اور ان ہی کے ذریعہ حکومت کے حصے کی رقم یا قیمت مقرر کی جاتی تھی۔

واقعات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان علاؤ الدین کے عہد تک بٹائی کا رواج دوسرے طریقہ کے مقابلہ میں زیادہ عام تھا کیوں کہ برنی کے بیان کے مطابق اس نے پیمائش کا طریقہ اختیار کیا غیاث الدین تغلق نے اس کو بدل کر پھر بٹائی کو ترجیح دی۔ اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں پیمائش کا طریقہ بھی جاری رہا۔ دوسرا مسئلہ وصولیابی لگان کے سلسلہ میں حکومت کے حصہ کی شرح کا تعین تھا۔ ہندوؤں کے عہد کی روایتی شرح

Marfat.com

پیداوار کا چھٹا حصّہ (⅙) تھی۔ لیکن عمل اس پر نہیں ہوتا تھا۔ اس کو کافی بڑھا دیا گیا تھا۔ سلطنت دہلی کے قیام کے بعد سلطان قطب الدین نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ پانچواں حصّہ (⅕) مقرر کیا جائے۔ اس کے بعد علاؤالدین کے عہد میں اضافہ کیا گیا۔ اس نے بعض انتظامی اور زرعی اصلاحات بغاوتوں کو ختم کرنے اور ضروریات کے تحت نافذ کی تھیں۔ اسی سلسلہ میں شرح لگان بڑھا کر نصف کر دی گئی تھی، یہ یقیناً بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن علاؤالدین پہلا شخص نہ تھا جس نے شرح لگان میں اتنا اضافہ کیا ہو۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ ہندو عہد میں بھی شرح لگان ایک زمانہ میں سینتالیس(۴۷) فیصد تک بڑھا دی گئی تھی[1] خود فقہائے اسلام نے بھی بعض مخصوص فصلوں پر شرح لگان نصف پیداوار مقرر کی ہے۔

حکومت کے واجبات کبھی نقد اور کبھی جنس کی شکل میں لیے جاتے ہیں۔ علاؤالدین نے جب اشیاء کے نرخ مقرر کئے اور سرکاری گودام اور ذخیرے قائم ہوئے تو اس نے دوآبہ کے علاقہ میں حکومت کا لگان جنس کی شکل میں وصول کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

مبارک شاہ خلجی کے عہد میں اس کے باپ کی بہت سی اصلاحات کو ختم کر دیا گیا شرح لگان بھی گھٹا کر وہی کر دی گئی جو پہلے سے رائج تھی یہ ہی سبب تھا۔ کہ سلطان غیاث الدین نے اجازت دی۔ کہ وہ مختصر سا اضافہ کر سکتے ہیں جو کسی صورت میں دسویں حصّے (⅒) سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ محمد بن تغلق نے اپنے پیشرو کی مقرر کی ہوئی شرح کو جاری کیا۔ لیکن دوآبہ کے علاقہ میں جہاں کے لوگوں کو وہ آئے دن کی بغاوتوں کی سزا دینا چاہتا تھا۔ اس نے بھی اضافہ کیا جو کہیں پانچ اور کہیں دس فیصد تھا۔

یہاں جاگیریں دینے کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جب مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے بعد حکومت کا کام شروع کیا، تو یہ طریقہ یہاں جاری تھا۔ عمال حکومت کو تنخواہ کی جگہ جاگیریں اور زمین دی جاتی تھیں، شروع شروع میں سلاطین دہلی نے اس کو جاری رکھا کیوں کہ سہولت اس میں تھی علاءالدین نے اس میں تبدیلی کی اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ جاگیرداروں کی موجودگی بغاوتوں کا ایک بڑا سبب ہے چنانچہ اس نے بہت ہی کم زمینیں دیں اور اس نے جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ اس کے بیٹے نے اس طریقہ میں پھر

---

[1] ڈاکٹر قریشی (صـ۱۱۱) بحوالہ پولیٹیکل انسٹی ٹیوشنز آف دی ہندوز

Marfat.com

تبدیلی کی اور جاگیروں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا، تغلق خاندان کے پہلے دو حکمرانوں نے کوئی غیر معمولی تبدیلی اس سلسلہ میں نہیں کی۔ لیکن فیروز شاہ کے عہد میں جاگیریں دینے کا رواج بہت بڑھ گیا۔ اور اسی کے بعض بڑے جاگیردار تھے۔ جنہوں نے موقع پا کر مرکز سے بغاوت کی اور خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔ اس سے پہلے محمد بن تغلق کے عہد میں امیران صدہ نے دولت آباد میں بغاوت کر کے سلطنت بہمنی کی بنیاد ڈالی تھی۔ جاگیرداری کی رسم لودھی سلاطین کے عہد میں اپنے انتہائی کمال پر پہنچی کیونکہ انہوں نے تو تقریباً ساری سلطنت کو بہت سی جاگیروں میں تقسیم کر دیا۔

محصولات

اسلامی حکومت میں دو قسم کے ٹیکس ہوتے ہیں۔ دینی اور دنیوی سب سے اہم دینی ٹیکس زکاۃ ہے اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ اس کا مقصد غرباء کی مدد کر کے نفس پاک کرنا ہے۔

زکوٰۃ سونے، چاندی اور دوسرے مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس کی مقررہ مقدار (نصاب) ایک شخص کی ملکیت میں سال بھر سے زیادہ رہے، زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے حضرت ابوبکر کی خلافت کا مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کچھ لوگ چاہتے تھے کہ زکوٰۃ ادا نہ کریں۔ حضرت ابوبکر نے نہایت سختی سے کہا تھا کہ زکوٰۃ پوری وصول کی جائے گی چاہے جنگ ہی کرنا پڑے۔

دنیوی ٹیکسوں میں جزیہ اور خراج بہت اہم ہیں جزیہ صرف ان غیر مسلموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں۔ ان کو ذمی کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر ذمی مسلمان ہو جائے تو ان کے لیے ریاست کے دفاع میں حصہ لے کر حکومت کی مدد کرنا ضروری ہوتا۔ اور کسی وقت بھی وہ لڑائی میں شرکت کے لیے طلب کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ اسلامی ریاست میں جہاد ہر اس بالغ مسلمان پر فرض ہوتا ہے جو لڑنے کے قابل ہوتا ہے یعنی بیمار اور ضعیف پر نہیں ہوتا لیکن ذمی یعنی غیر مسلم اس ذمہ داری سے بری ہیں اس لیے ان کو ایک مقررہ رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ بعض مورخین نے بیان کیا ہے کہ جزیہ غیر مسلموں سے صرف غیر مسلم ہونے کی وجہ سے لیا جاتا ہے یعنی ایک قسم کا

Marfat.com

جرمانہ ہے۔ قطعاً یہ غلط ہے جزیہ عورتوں بچوں اور ضعیفوں سے نہیں لیا جاتا بلکہ اس سے غرباء اور بے روزگار طبقہ بھی مستثنیٰ تھا۔ برہمنوں اور پنڈتوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن فیروز شاہ کے زمانہ میں ان پر بھی یہ ٹیکس لگانے کی کوشش کی گئی آخر کار یہ مسئلہ اس طرح طے ہوا کہ مالدار لوگوں نے پنڈتوں کی طرف سے رقم ادا کرنے کا عہد کیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سلطنت کی پوری تاریخ میں جزیہ کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہو گا۔ کہ اس قسم کے ٹیکس ہندوؤں کے عہد میں بھی کہیں کہیں لگایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جزیہ کی رقم زیادہ نہ ہو اور وہ لوگوں پر گراں نہیں گزرتا تھا۔ سب سے کم استطاعت رکھنے والا طبقہ دس تنکہ۔ متوسط طبقہ بیس تنکہ اور مالدار طبقہ چالیس تنکہ ادا کرتا تھا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ علاء الدین نے جزیہ بند کرایا تھا غلط ہے۔

ان ٹیکسوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول بھی بعض سلاطین کے زمانہ میں وصول کئے جاتے تھے۔ مثلاً جزّاری (ذبح کی جانے والی گاؤں پر) چرائی (مویشیوں کے چرائی پر) وغیرہ ان میں سے زیادہ تر وہ محصول تھے۔ جو پہلے سے یہاں جاری تھے۔ مسلم فاتحین نے ان کو جاری رکھا۔ لیکن چونکہ شرعی قوانین سے ان کا جواز نہیں ملتا تھا۔ فیروز شاہ نے ان کو بند کر دیا۔

فوج

قرونِ وسطیٰ کی جنگوں میں گھوڑے اور سوار فوج کا سب سے زیادہ موثر حصہ سمجھے جاتے تھے۔ سوار کے پاس اسلحہ میں تلوار خنجر اور تیر کمان عام طور پر ہوتے تھے۔ سوار لوہے کی زرہ یا ایسے کوٹ جن میں روئی بھر دی جاتی تھی۔ اپنی حفاظت کے لئے پہنتے تھے۔ ڈھالوں سے بھی حفاظت کرتے تھے جن سپاہیوں کو ایک سے زائد گھوڑے دیئے جاتے ان کو مرتب کہتے تھے ایک گھوڑا رکھنے والے سپاہی کو سوار کہتے تھے۔ مرتب کے دوسرے گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے جو شخص مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کو دواسپہ کہتے تھے۔ علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں   کے بیان کے مطابق مرتب کو ۲۳۴ تنکہ سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ یعنی ۸۷ تنکہ اس کے اپنے خرچ کی اور ۷۸ تنکہ ہر گھوڑے کی

Marfat.com

دیکھ بھال اور خرچ کے لیے۔ سوار کی تنخواہ ۲۳۴ تنکہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کو گھوڑا خود لانا پڑتا تھا۔ چونکہ فوج کی قوت کا انحصار سواروں کے دستوں پر ہوتا تھا اس لیے گھوڑوں کی تجارت بہت وسیع پیمانہ پر تھی۔ اور یہاں عرب ترکستان اور دوسرے ممالک سے کافی تعداد میں گھوڑے لائے جاتے تھے۔ علاؤالدین کے عہد میں دہلی میں ستر ہزار گھوڑے تھے۔ باہر سے منگوانے علاوہ حکومت گھوڑوں کی نسل بڑھانے کا انتظام بھی کرتی۔ فوج کی تعداد مختلف زمانوں میں مختلف تھی۔ اس کا انحصار وقتی ضروریات اور سلطان کی مخصوص پالیسی پر ہوتا تھا۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں اس کی تعداد چار لاکھ ستر ہزار تھی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں بڑھ کر نو لاکھ ہو گئی تھی۔ ان دونوں کو دفاع اور جنگی مہمات کے سلسلہ میں زیادہ فوج رکھنا پڑتی تھی۔ ان کی وہ فوج بھی جو دہلی میں تیار رہتی تھی (STANDING ARMY) کافی زیادہ تھی۔ فوج کا معیار کارکردگی بلند رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ گاہے بگاہے فوجی دستوں کی پریڈ اور معائنہ ہوتے رہیں ان موقعوں پر سواروں اور گھوڑوں کی حالت کا تفصیلی معائنہ کیا جاتا تھا۔ اس موقع پر اکثر لوگ وقتی طور پر عمدہ گھوڑے مہیا کر کے پیش کر دیتے۔ معائنہ کے بعد ان کو علیحدہ کر کے کم قیمت جانور رکھ لیتے اس کو روکنے کے غرض سے علاؤالدین نے سرکاری گھوڑوں کو دغوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی طرح ہر سپاہی کا حلیہ دیوان عرض میں درج کیا جاتا تاکہ سواروں وغیرہ میں تبدیلی نہ کی جا سکے۔ گھوڑا سواروں کے بعد فوج کا دوسرا اہم حصہ ہاتھی تھی۔ بعض سلاطین ان کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ مثلاً کہا کرتا تھا۔ ایک ہاتھی سے پانچ سو آدمیوں کے برابر کام لیا جا سکتا ہے یہ بیان تو یقیناً مبالغہ آمیز ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہاتھیوں کی زیادہ تعداد سے کے دل میں خوف ضرور پیدا کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر بیرونی افواج کے مقابلہ میں یہ بہت مفید ثابت ہوتے تھے۔ ان کو لوہے کی پلیٹوں سے ڈھک کر اور ان کے دانتوں میں بڑے بڑے برچھے لگا کر ان سے دشمن کی صفوں پر حملہ کرتے تھے یقیناً وہ ہزاروں کی تعداد میں مخالف سپاہیوں کو کچل کر مار ڈالتے تھے لیکن ہاتھیوں کے ساتھ یہ بڑا خطرہ تھا۔ کہ اگر وہ خود بھڑک جاتے تو پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے اپنی ہی فوج کو کچل ڈالتے تھے ہاتھیوں کی اس حرکت سے فوج کو سخت نقصان پہنچتا اور اکثر شکست ہو جاتی تھی۔

Marfat.com

اس زمانہ میں پیادہ فوج کی اہمیت سواروں وغیرہ کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ پیادے کو پائک کہتے تھے، اور یہ لوگ اکثر مقامی آبادی میں سے لیے جاتے تھے۔ حفاظتی دستوں میں اکثر پائک ہی ہوتے تھے۔

سلاطین دہلی کی فوج میں مختلف نسلوں کے لوگ ہوتے تھے۔ کون۔ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ یہاں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مسلم فاتحین نے بہت جلد خود کو اس قدر مقبول بنا لیا تھا کہ انہوں نے اپنی فوجوں میں ہندوستانیوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کی فوج میں ہندو افسر تھے۔ قطب الدین ایبک نے اپنی فوج کے سوار دستوں کے لیے بھی ہندوستانیوں کی بھرتی کی ان میں ہندو بھی کافی تھے۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور بہت جلد ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہندو سواروں کی زیادتی ہی کی وجہ سے بلبن کے عہد میں افسر کو راوت[1] عرض کہتے تھے۔ یہ سب سے زیادہ مضبوط شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں نے ابتدا ہی سے اپنی بنیادی پالیسی یہ بنائی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن بنائیں گے۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔ اور آخر کار عالم اسلام میں ایک اور قوم ہندی مسلم وجود میں آ گئی۔ جس کی تاریخ صرف اسی لئے شاندار نہیں کہ اس نے برصغیر میں تہذیب و تمدن کی عمارت مکمل کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ بلکہ اس لیے بھی زریں حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے کہ اس نے آزادی کی جدوجہد کو آخری نقطہ پر کر دنیا کی عظیم ترین مسلم مملکت کی شکل میں خود اپنے وطن کی تخلیق کی۔

سلاطین دہلی کی فوج کے کارنامے ایسے ہیں جن کو تاریخ نظر انداز کر سکے۔ برصغیر کے تحریلی علاقوں کو ایک ہی حکومت کے تحت رکھنے کے علاوہ اس نے اس خطہ ارض کو قرون وسطیٰ کے سب سے بڑے فوجی طوفان یعنی منگولوں کے حملوں کا مقابلہ نہایت ہوشیاری اور شجاعت کے ساتھ کیا اور یہاں کے لوگوں کو تباہی اور بربادی سے بچایا۔ تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ایشیا کے مختلف ممالک قیامت خیز تباہیوں سے دوچار ہوئے لیکن دہلی نسبتاً محفوظ رہا۔ اس پر غور کیا جائے بلبن اور علاء الدین کی تربیت دی ہوئی فوجوں نے کس قدر نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

---

[1] راوت ہندو گھوڑا سوار کو کہتے تھے۔

عدلیہ

سلطان خود سب سے بڑی عدالت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ نظام عدلیہ کی دو قسمیں تھیں دیوان مظالم اور دیوان قضا۔ سلطان کی عدم موجودگی میں اوّل الذکر کا سب سے اعلیٰ افسر امیرداد اور آخرالذکر کے قاضی القضاۃ ہوتا ہے۔ امیرداد کے فرائض میں زیادہ تر عدلیہ کے متعلق انتظامی امور تھے۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ عدالتوں کے جاری کئے ہوئے احکامات نافذ ہوئے یا نہیں۔ اسی طرح قضاۃ وغیرہ اپنے فرائض ٹھیک طور پر انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ یہ عہدہ نہایت اہم تھا کیونکہ بڑے بڑے امراء کے معاملات میں اس کو مداخلت کا اختیار تھا۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں امیرداد کی تنخواہ پچاس ہزار تنکہ تھی۔ قاضی ممالک یا قاضی القضاۃ کو اسی عہد میں ساٹھ ہزار تنکہ تنخواہ ملتی۔ اس کے فرائض میں زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ دیوان مظالم سے متعلق مقدمات حاجب کے پاس جاتے تھے اس کے فیصلہ کی اپیل قاضی ممالک سنتا تھا چونکہ کام بہت زیادہ ہوتا تھا اس لئے نائب قاضی القضاۃ کا بھی تقرر کیا جاتا تھا۔ شروع میں وہ دہلی میں بحثیت قاضی شہر بھی کام کرتا تھا بعد میں کام کی زیادتی کی وجہ سے شہر کے لیے ایک علیحدہ قاضی کر دیا گیا کچھ عرصہ کے لیے ابن بطوطہ بھی اسی عہدہ پر فائز رہا۔ اس کو بارہ ہزار تنکہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ قاضی ممالک، صدر الصدور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس حیثیت میں مذہب سے متعلق جملہ امور بھی اس ہی کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ ہر شہر میں ایک قاضی اور اس کا اسٹاف رہتا تھا۔ عدالت کے کام کے علاوہ قاضی کے اور بہت سے کام بھی تھے مثلاً یتیموں اور پاگلوں کے مال کا انتظام اور اس کی دیکھ بھال اوقاف اور بیواؤں کی امداد تاکہ ان کی مناسب جگہ شادیاں ہو سکیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سڑکوں کی دیکھ بھال اور ان سے متعلق تمام جھگڑے یا اختلافات بھی قاضی ہی کی سپردگی میں دیئے جاتے تھے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ شہر کے متعلقہ امور اسی کی نگرانی میں تھے۔ اور اسی لیے وہ حکومت کا ایک اہم کارکن سمجھا جاتا تھا۔

فوجداری (CRIMES) کے تمام مقدمات اور دیوانی (CIVIL) کے وہ مقدمات جن میں دونوں فریقین مسلمان ہوتے شرعی قوانین کے مطابق طے کئے جاتے

Marfat.com

تھے آخرالذکر میں اگر ایک فریق بھی غیر مسلم ہوتا تو مقامی قانون کے لحاظ سے فیصلہ کیا جاتا تھا گاؤں میں ہندوؤں کے مقدمات زیادہ تر مقامی پنچایتیں طے کرتی تھیں۔

سلاطین دہلی تفصیلی حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصاف پر بہت زور دیتے تھے۔ تاریخ کے صفحات میں متعدد واقعات موجود ہیں۔ جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سلاطین کو دادرسی اور انصاف پروری کس قدر عزیز تھی۔ مثلاً بلبن کا باثر حکام کو سزا دینا اور محمد بن تغلق کا خود کو عدالت میں پیش کر کے قاضی کے فیصلہ کی تعمیل کرنا۔ کہا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات سزائیں حد سے زیادہ سخت ہوتی تھیں لیکن ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انتہائی ظلم کی سزا شاہی ہونی چاہیئے محمد بن تغلق باوجود سخت سزاؤں کے جو اس کے حکم سے دی گئیں انصاف پر بہت زور دیتا تھا

حسبہ

اسلامی ریاست میں یہ بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے کہ لوگوں کو دینی اور اخلاقی زندگی پر نظر رکھتے۔ کیونکہ شریعت زندگی کے اجتماعی اور انفرادی دونوں پہلوؤں کی نگہبانی کرتی ہے۔ اس کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم تھا۔ جس کو حسبہ کہتے تھے۔ محتسب اس محکمہ کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ محتسب کے فرائض کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ اس کی وسعت حکمران کے مزاج کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ جو حکمران خود ہی اخلاقی پستی کا شکار ہوتا جیسے مبارک شاہ یا خسرو خان تھے ان کے زمانہ میں احتساب کی مشین یقیناً سست ہو جاتی ہوگی بہرحال محتسب کے فرائض میں داخل تھا کہ یہ دیکھے کہ مسجدوں میں نماز جماعت باقاعدہ ہوتی ہے اور لوگ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں کوئی شخص نشہ کی حالت میں سڑکوں وغیرہ پر نہیں گھومتا پھرتا ہے اور شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں عام طور پر پبلک طریقہ سے فروخت نہیں ہوتی ہیں۔ قمار بازی۔ فحاشی اور اس قسم کے اور سماجی جرائم کی روک تھام بھی کرتا تھا وہ مقروض لوگوں سے قرضوں کی ادائیگی بھی کراتا تھا۔ اگرچہ اس قسم کے معاملات کا باقاعدہ فیصلہ قاضی ہی کرتا تھا۔ محتسب کے فرائض میں ان تمام جرائم کی روک تھام بھی تھی جو سماجی مفاد کے خلاف ہوتے یا شریعت کی نظر میں مذموم ہوتے مثلاً غلاموں یا جانوروں پر مظالم کو روک سکتا تھا۔ بلکہ وہ ان مدرسین سے بھی باز پرس کر سکتا تھا۔ جو بچوں پر غیر ضروری سختی کرتے تھے رفاہِ عام کے کام اور ان سے متعلق عمارتیں مثلاً کنویں وغیرہ بھی اسی کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

Marfat.com

کوتوال

کوتوال پولیس کا سب سے زیادہ اہم اور با اثر افسر ہوتا تھا اس کے علاوہ اس کو مجسٹریٹی کے بعض اختیارات حاصل تھے کوتوال سے امید کی جاتی تھی کہ اس کو شہر کے ہر شخص اور ہر مسئلہ کے متعلق معلومات ہونا چاہیئے اس سلسلہ میں وہ ایک بڑا سٹاف رکھتا تھا جس میں اس کو خفیہ طور پر معلومات پہنچانے والے بھی ہوتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس شہر کے ہر حصے کے لئے رجسٹر ہوتا تھا اور ہر علاقہ میں اس کا ایجنٹ رہتا تھا۔ اس کے اہم فرائض میں یہ دیکھنا بھی تھا کہ کوئی شخص چوروں اور بدمعاشوں کو پناہ نہیں دیتا ہے ہر شہر میں کوتوال کی حیثیت اہم سمجھی جاتی تھی۔ لیکن دارالحکومت میں چونکہ بعض معاملات میں وہ براہِ راست سلطان سے رابطہ رکھتا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ علاء الملک کی شخصیت سے لگایا جا سکتا ہے جب علاءالدین کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ وہ ایک نئے دین کی بنیاد ڈالے تو دہلی کے کوتوال نے ہی اس کو سمجھا کر اس سے ہٹایا تھا۔

لوکل گورنمنٹ (والی، مقطیع)

دہلی کی وسیع سلطنت انتظامی سہولتوں کے لحاظ سے متعدد ولایتوں اقلیموں اور اقسطاع میں تقسیم کی گئی تھی۔ یہاں کے حاکموں کو والی یا مقطیع کہا جاتا تھا صوبہ کی اصطلاح کا رواج بعد میں ہوا اگرچہ کہ آسانی کے خیال سے مورخین نے ولایتوں اقلیموں اور اقسطاع کے لیے یہ لفظ (PROVINCE) استعمال کیا ہے ہم بھی جب اس اصطلاح کو استعمال کریں گے۔ اس سے مراد وہی حصے ہوں گے۔ جن کا ذکر فارسی ماخذ میں تعلیم ولایت یا اقسطاع کے تحت کیا گیا ہے۔ صوبوں کی تعداد سلطنت کی وسعت کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ گورنر (یعنی والی یا مقطیع) اپنے صوبہ میں فوجی اور انتظامی معاملات کا مکمل اختیار تھا۔ صوبہ کا انتظام قریب قریب اسی طریقہ اور طرز پر ہوتا تھا۔ جو مرکز میں تھا۔ اس دور میں گورنر کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ رسل و رسائل کے ذرائع اس قدر کم اور کم رفتار تھے کہ دور دراز علاقوں میں بڑے گورنر جن کے وسائل زیادہ ہوتے تھے کم و بیش نیم خود مختار حکمران بن جاتے تھے۔ لکھنوتی یعنی بنگال کے گورنر کی مثال اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ دہلی

Marfat.com

سے دور بھی ہوتا تھا اور اس کی ولایت بھی وسیع تھی چنانچہ اس کو مرکز کے خلاف بغاوت میں سہولت تھی۔ یہی سبب تھا کہ علاء الدین نے ابتداء میں دکن کی ریاستوں کو ان کے قدیم حکمرانوں ہی کے سپرد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حکمرانوں کے اختیارات بہت وسیع تھے گورنروں کے جملہ اختیارات کا ذکر کرنا مشکل ہے لیکن ان اختیارات کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ بعض بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جو اس عہد کی تاریخوں میں کہیں کہیں ملتے ہیں مثلاً تاج المآثر کا مصنف لکھتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔ جس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ حکومت کے جملہ ملازمین کی نگرانی کرے گا۔ جن میں فوجی بھی شامل ہیں۔ اس کام میں اس کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا تاکہ وہ شجاعت و سخاوت کی ان روایات کو قائم رکھ سکے۔ جن کے ذریعے ابدی نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔ قطب الدین ایبک نے اپنے ایک والی کو جو ہدایات دیں ان کی بنیاد پر اس کے فرائض میں مندرجہ ذیل امور شامل تھے۔

۱۔ قوانین ضوابط اور روایات کو نافذ کرنا۔ اور نگرانی۔
۲۔ علماء، فوجی اور سول حکام کی دیکھ بھال اور نگرانی۔
۳۔ لوگوں کو محصولات کی کمی کے ذریعہ خوش کرنا اور ان کے لئے خوش حالی کے اسباب مہیا کرنا۔
۴۔ زراعت کی توسیع۔
۵۔ لوگوں کی داد رسی کرنا۔ کمزوروں کو قوی اور ظالموں کی زیادتی سے بچانا۔
۶۔ عدالتوں کے فیصلوں پر عمل کرنا۔
۷۔ سزائے موت سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کرنا۔
۸۔ شاہراہوں کو محفوظ بنانا۔ تاجروں کی ہمت افزائی اور تجارت کو فروغ دینا۔

گورنر کے فرائض سلطان کی مخصوص پالیسیوں کے پیش نظر کم و زیادہ ہوتے رہتے تھے۔ لیکن اس کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ مرکز کی پالیسی کو عملی شکل دینے کی کوشش کرے۔

پرگنہ

بڑے بڑے صوبے بعض اوقات طرفوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ بعد میں ہم کو شق کی اصطلاح ملتی ہے اس کا افسر شق دار کہلاتا تھا۔ اس کے بعد دوسری تقسیم پرگنوں میں ہوتی

Marfat.com

تھی۔ جہاں تک پرگنوں اور گاؤں کا تعلق تھا مسلم حکمرانوں نے قدیم انتظام میں بہت کم تبدیلیاں کیں۔ لیکن پھر بھی بعض نئی اصطلاحات جاری ہوئیں پرگنہ کا سربراہ اب بھی پہلے کی طرح چودھری کہلاتا تھا۔ حساب اور کاغذات رکھنے والا پٹواری کہلاتا تھا۔ گاؤں کے سربراہ کو مقدم کہتے تھے قانون گو کا تقرر بھی پرگنہ میں ہوتا تھا۔ پرگنہ کا ایک اور افسر متصرفہ (عامل) ہوتا تھا۔ اس کا کام لگان کی وصول یابی سے متعلق تھا۔ اس کام میں اس کی مدد جو افسر کرتے تھے۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ مشرف (فصلوں کا انسپکٹر) محصّل (رقوم وصول کرنے والا) گماشتہ (ایجنٹ) سرہنگ (چپراسی) اس کے علاوہ کلرکوں کی بڑی تعداد ہوتی تھی۔ جن کا ذکر صرف رکن کہہ کر کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ چھوٹے چھوٹے عہدہ دار اور بھی ہوں گے۔ جن کا کتابوں میں ذکر نہیں ہے۔

ذرائع حمل و نقل

مسلمانوں نے ابتداء ہی سے ذرائع حمل و نقل کو بہت ترقی دی تھی اس سلسلہ میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ان کی فتوحات کا سلسلہ اتنی تیزی سے بڑھا اور بہت جلد اتنا وسیع ہو گیا کہ ان کو اس کے لیے غیر معمولی کوشش کرنا پڑی۔ دوسرے یہ کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں حجاج دنیا کے مختلف حصوں سے سفر کر کے حجاز پہنچتے تھے چنانچہ ان علاقوں میں راستوں کی تعمیر اور حفاظت بہت ضروری ہو گئی تھی۔ چنانچہ عالم اسلامی کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان بہت جلد سڑکیں تعمیر ہو کر تیار ہو گئیں۔ فتوحات کے لیے بھی بعض اوقات سڑکیں بنانا اور محفوظ کرنا ضروری ہوتا تھا۔ البیرونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی افغانستان کے علاقوں میں جو راستے سلطان محمود نے اپنی فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے استعمال کئے وہ اس کے باپ امیر سبکتگین نے بنوائے تھے سلاطین دہلی نے جلد ہی سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ گورنروں کو خاص طور پر ہدایات دی جاتی تھیں کہ وہ اس سلسلہ میں کوشش کریں کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل شمالی اور جنوب کے علاقے علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان کے درمیان آمد و رفت اور تجارت وغیرہ کا سلسلہ بہت کم تھا بہت سے علاقوں میں علاء الدین کی فوجوں نے اکثر راستے پہلی مرتبہ طے کئے۔ لیکن اس کے بعد آمد و رفت کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔

Marfat.com

سوال ۵:- سلاطین دہلی کے عہد میں وہ شہری اور اقتصادی زندگی پر تبصرہ کیجئے۔

اسلام اور ہندو مذہب

اسلام نے صرف ایک نیا کلچر ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کو ایک نیا منصب عطا کیا، قدیم تہذیبوں سے جب اس کا ٹکراؤ ہوا تو اس نے ان کی شکستہ عمارتوں کو از سرِ نو تعمیر کر کے ایک نئی دنیا کی تخلیق کی بعض جگہ تو اس تعمیر نو کو بنیادوں سے لے کر اختتام تک مکمل کرنا پڑا۔ لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ قدیم تہذیبوں کے کچھ حصے نئی تعمیر میں کام آگئے۔ برصغیر میں صدیوں سے برہمن مت اور بدھ مت میں بالادستی کی جنگ جاری تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں جب اسلام یہاں آیا تو بدھ مت شکست کھا کر گمنامی کی گہرائیوں میں جا چکا تھا۔ اور برہمنی عروج اپنے انتہائی کمال پر تھا اب اس کو ایک نئے حریف یعنی اسلام سے دوچار ہونا پڑا اسلام اور ہندو مت کے بنیادی اصولوں میں اس قدر زیادہ فرق تھا کہ جب ان میں سے کچھ کو ترک نہ کیا جائے دونوں ایک نہیں ہو سکتے تھے یہ بھی ظاہر تھا کہ اسی بنیادی فرق کے پیش نظر ہندومت اسلام کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کر سکتا تھا جو اس نے دوسری اقوام کے ساتھ کیا تھا۔ گذشتہ صدیوں میں اس نے نوآمدہ مذاہب اور کلچروں سے مقابلہ کر لیا۔ ان کے کچھ اصول اور بعض اوقات ان کے دیوتاؤں کو بھی تسلیم کر کے ان کو اپنے وجود میں ضم کر لیا اس کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا۔ کہ خود ہندومت کے عقائد و رسومات اور اس کے دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی چلی گئی لیکن ساتھ ہی نئے مذہبوں اور کلچروں کا علیحدہ وجود باقی نہ رہا۔ ہندو تہذیب ایک سمندر ہو کر رہ گئی جس کے اندر بہت سی تہذیبیں مل گئیں۔ اور کچھ اثرات چھوڑ کر غائب ہو گئیں۔ لیکن اسلامی اور ہندو تہذیبوں کے ٹکراؤ کا یہ نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا اس کا خاص سبب یہ تھا کہ اسلام کی نظر میں سیاست اور مذہب زندگی کے دو علیحدہ خانے نہ تھے۔ اسلام درحقیقت ایک ایسا نظام حیات تھا جو مادی اور روحانی زندگی کو یکساں اہمیت دیتا تھا۔ اگر اسلام کے سیاسی اور حربی رہنما فتوحات حاصل کر کے اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تو مسلم صوفیا اور مبلغین نے دینی اشاعت کے میدان میں نمایاں ترقی کی۔ ان یہ ضرور تھا کہ فتوحات حاصل کرے اور سیاسی اقتدار قائم

Marfat.com

کرنے کے بعد مسلم حکمرانوں نے اپنی بنیادی پالیسی یہ رکھی کہ یہاں کے رہنے والوں کی مذہبی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ امن و امان قائم کرنے حکومت کو استحکام بخشنے اور لوگوں کو خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے کے مواقع بہم پہنچانے پر مرکوز رکھی۔ اشاعت اسلام کا کام ان لوگوں نے ذمہ رہا جو مذہب کے بنیادی اصولوں سے ایک قدم بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کے اصولوں کو پسند کرتا تو اس کے لیے صرف یہی راستہ کھلا تھا کہ وہ اس کو تمام و کمال قبول کرلے یہ ممکن نہ تھا کہ اس کے کچھ حصے کو لے کر اپنے مذہب میں شامل کرے اس میں شک نہیں کہ بعض لوگوں نے دونوں مذہبوں کو ملا کر ان کے اجزا سے ایک مشترک دین قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی یہ کوششیں ناکام رہیں غیر مسلموں کی مذہبی زندگی میں مداخلت نہ کرنے اور رواداری برتنے کی جس پالیسی پر مسلم حکمرانوں نے عمل کیا اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تبلیغ اسلام کے لیے عمدہ ماحول پیدا ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اگر مسلم حکمران دوسری پالیسی اختیار کرتے اور سنگینوں کے بل پر اسلام پھیلاتے تو شاید برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی لیکن وہ طریقہ کار ایک طرف تو اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہوتا اور دوسری طرف اس سے حاصل کی ہوئی کامیابی تاریخ کے صفحات کو داغ دار بنا دیتی۔ آج خود غرض یا متعصب مورخین کے علاوہ اسلامی عہد کی تاریخ پر کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکتا۔ کہ یورپ کی طرح یہاں بھی لوگوں کا خون مذہبی عقائد کی بنیاد پر بہایا جاتا تھا

مسلم معاشرہ

سب سے پہلے مسلم فاتحین جو یہاں آئے وہ نسلاً عرب تھے سندھ اور ملتان کے متعدد علاقو۔ انہوں نے اپنی آبادیاں قائم کیں اور شہر بنائے ابتداء میں مسلمانوں کی آبادیاں لازمی طور پر شہروں ہی تک محدود رہیں لیکن جلد ہی مبلغین نے اپنا کام شروع کیا اور ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے لگی۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت جلد ملتان اسلامی تہذیب کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ فتوحات کے نتیجہ میں اگرچہ ایک محدود علاقہ ہی اسلامی حکومت کے تحت آیا لیکن پھر بھی سلطان محمود کے حملوں نے مسلمانوں کو برصغیر کے اندرونی حصوں اور راستوں کے علاوہ یہاں کے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے

Marfat.com

روشناس کرایا۔ علماء و مشائخ کے لیے اب یہ علاقے اجنبی نہ تھے۔ وہ تبلیغ کا کام اطمینان سے کر سکتے تھے۔ اسی صدی میں لاہور اسلامی تہذیب کا ایک اور بڑا مرکز بن گیا غزنوی اقتدار کا انحطاط شروع ہونے کے بعد ایک مدت تک سیاسی فتوحات کا سلسلہ بند رہا۔ لیکن اس دور میں تبلیغ کا کام جاری رہا۔ چنانچہ مسلم آبادی میں اضافہ ہوتا رہا۔ سلطان معزالدین محمد بن سام کے حملوں سے اسلامی فتوحات کا تیسرا دور شروع ہوا لیکن اس نے اپنی وہ یادگار فتح حاصل نہیں کی تھی۔ جس کے نتیجہ میں دہلی اور اجمیر کے وسیع علاقے اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے لیکن برصغیر کے مشہور ترین صوفی شیخ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر کو مستقر بنا کر تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ تیرھویں صدی کے شروع میں قطب الدین ایبک نے سلطنت دہلی کی باقاعدہ بنیاد رکھی اب تبلیغ کے دائرہ کی حدود بھی ہر چہار طرف بڑھنے لگیں سو سال کے اندر سلطنت دہلی کا اقتدار شمالی برصغیر کے سارے علاقے پر قائم ہو گیا۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گی۔ دوسرے ممالک سے مسلم خاندانوں کی ہجرت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنگیزی تاخت و تاراج شروع ہونے کے بعد یہ بہت بڑھ گیا، لیکن یہاں کی آبادی میں اکثریت ان ہی لوگوں کی تھی جنہوں نے یہاں اسلام قبول کیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مسلمانوں کی زندگی میں یہاں کی بعض روایات اور رسوم کی جھلک باقی رہی۔

صوفیا اور علماء

چونکہ تبلیغ کا کام زیادہ تر صوفیا نے کیا تھا اس لیے یہ بات بھی حیرت انگیز نہیں کہ تصوف کی مقبولیت اور مشائخ کا اثر یہاں کی سوسائٹی پر بہت زیادہ بڑھ گیا۔ سلاطین اور امراء اور علماء اور فضلاء اہل حرفہ اور صنعت کار نیز فوج کے سپاہی غرض کہ کسی شعبہ سے لوگوں کا تعلق ان میں سے اکثر صوفیہ کے سلاسل سے خود کو منسلک کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور اس کو اسلامی تعلیمات کے راستہ پر چلانے کی کوشش میں صوفیہ کا بہت بڑا حصہ ہے ان کا یہ کارنامہ برصغیر کی تاریخ کے اہم ترین الواب میں شمار کیا جانا چاہیئے لیکن اس پر حیرت ہوتی ہے کہ مورخوں نے چاہے وہ قرون وسطی سے تعلق رکھتے ہوں یا دور جدید سے اس کا نہ غور سے مطالعہ کیا ہے اور نہ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوشش ہے اس لیے ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ مشائخ کے ان سلاسل اور شخصیتوں

Marfat.com

کا اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کیا جائے جنہوں نے تبلیغی اور اصلاحی کوشش میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اختصار کی وجہ سے صرف چند ہی شخصیتوں کے کارناموں کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے تصوف کی اصل قرآن اور رسول اللہ کی حیات طیبہ میں ملتی ہے اگرچہ لفظ صوفی کا استعمال بعد میں شروع ہوا۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔ صوفیہ اور مشائخ نے یہاں اسلامی فتوحات کے بعد ہی آنا شروع کردیا تھا۔ لیکن ان میں سے اکثر کے حالات بہت کم دست یاب ہوسکے ہیں اور نہ اس جگہ سب کے ذکر کی گنجائش ہے پہلے مشہور صوفی شیخ جن کے حالات اور کارناموں کا خاکہ تیار کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ مواد موجود ہے شیخ علی ہجویری ہیں جو داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہیں ان کی تصنیف کشف المحجوب تصوف کی مستند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے اس کے انگریزی اور اردو ترجمے شائع ہوچکے ہیں۔ برصغیر کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول صوفی شیخ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں ان کے ہند میں تشریف لانے کی تاریخ پر مورخوں میں اختلاف ہے۔ لیکن اتنا یقیناً صحیح ہے کہ وہ سلطان معزا اور پرتھوی راج کی جنگ (۱۱۹۲ء) سے کافی پہلے آکر اجمیر میں قیام پذیر ہوگئے تھے ان کے خلیفہ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی میں سکونت اختیار فرمائی ایلتمش دونوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ہی بزرگوں سے عقیدت کا اثر تھا۔ جس نے اس کو ایک نیک اور متقی شخص بنا دیا تھا خواجہ قطب الدین کے خلیفہ بابا فرید گنج شکر کی خانقاہ پاک پٹن میں تھی۔ ان کے ہاتھ پر بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کے خلفاء شیخ علاءالدین علی احمد نے کلیر (یوپی) میں اور شیخ نظام الدین اولیاء نے دہلی میں قیام کیا۔ ان دونوں حضرات سے جو سلسلے جاری ہوئے اور یہ ان ہی کے نام پر صابری اور نظامی کہلاتے ہیں۔ وہ بہت مقبول ہوئے اور ان کی بڑی اشاعت ہوئی۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ نے دہلی کی سوسائٹی پر کیا اثر کیا۔ اس کا بیان تاریخ کی کتابوں میں قدرے تفصیل سے مل جاتا ہے خود برنی کا بیان جو شیخ سے بیعت تھا۔ اس موضوع پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ شیخ علاءالدین صابر کے واحد خلیفہ شمس الدین ترک نے پانی پت کو اپنا مستقر بنایا۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء کے متعدد خلفاء برصغیر کے مختلف علاقوں

Marfat.com

میں جا کر قیام پذیر ہوئے۔ ان میں سے اخی سراج جو بنگال سے آئے تھے وہاں واپس گئے ان کا سلسلہ مشرقی علاقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کے علاوہ بنگال میں دو اور بزرگوں نے بہت کام کیا۔ شیخ جلال الدین تبریزی جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ہمعصر تھے اور شیخ جلال الدین سلہٹی آج بھی ان کی درگاہیں بڑے دینی مرکز ہیں، دکن میں بھی شیخ نظام الدین ہی کے ایک خلیفہ گئے تھے۔ بعد میں ان کے ایک اور خلیفہ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے خلیفہ خواجہ گیسو دراز نے گلبرگہ کو اپنا مستقر بنا کر وہاں بہت کام کیا۔ ان سے قبل محمد بن تغلق کے منصوبے کے تحت دولت آباد میں بھی اس سلسلہ کے کئی بزرگ جا کر آباد ہوئے ان میں امیر خسرو کے دوست اور ساتھی امیر حسن سجزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صابری سلسلہ کے اکثر بزرگوں نے دارالحکومت سے علیحدہ رہ کر عوام کی تربیت کی۔ شیخ شمس الدین ترک پانی پتی کے خلیفہ جلال الدین تو وہیں رہے لیکن ان کے خلیفہ شیخ عبدالحق کی خانقاہ ردولی (اودھ) میں تھی۔ ان کی دو نسلوں کے بعد اسی خاندان کے بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے بہت شہرت اور عزت حاصل کی۔ لودھی سلاطین اور ان کے امراء میں کئی بااثر امیران سے اعتقاد رکھتے تھے۔ شیخ کے خطوط کا ایک مجموعہ موجود ہے جس میں ان لوگوں کے نام خطوط ہیں۔ شیخ نے ان کو اسلامی شریعت کے راستہ پر قائم رہنے اور تزکیہ نفس وغیرہ سے متعلق نصیحتیں کی ہیں۔ جنگ پانی پت کے موقع پر ابراہیم کے اصرار کی وجہ سے شیخ موجود تھے اور یہی سبب تھا کہ مغلوں نے ان کو گرفتار بھی کر لیا۔ اور پانی پت سے آگرہ تک پیادہ چلنے پر مجبور کیا بعد میں ان کی شخصیت کا اندازہ بابر کو ہوا تو وہ بے حد احترام کرنے لگا۔ چنانچہ اس کے نام بھی آپ کا خط موجود ہے۔ ابوالفضل کا بیان ہے ہمایوں دو مرتبہ گنگوہ میں ان کی میں حاضر ہوا۔ شیخ عبدالقدوس کے مکتوبات میں جو خطوط امراء یا سلاطین کے نام ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مشائخ کس طرح ان سیاسی رہنماؤں کو تربیت دینے کی کوشش کرتے تھے ان میں سے اکثر ان سوالات کے جواب میں ہیں جو ان سے دریافت کئے گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس تعلیم سے متاثر تھے اور چونکہ یہی عوام کی راہنمائی کرتے تھے۔ اس لئے عوام تک بھی یہ تعلیم پہنچتی تھی۔ شیخ عبدالقدوس سے بھی پہلے ایک اور بزرگ شیخ یحییٰ منیری نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ بھی مکتوبات کے ذریعہ لوگوں کی تربیت کرتے تھے۔ ان کے

Marfat.com

مکتوبات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

چشتی مشائخ کے برابر تو نہیں لیکن پھر بھی بہت وسیع پیمانہ پر سہروردیہ خاندان کے صوفیہ نے بھی اصلاحی کام کیا۔ ان کے دو بڑے مرکز ملتان اور اچھ تھے اس سلسلہ کے بانی شیخ شہاب الدین سہروردی تھے۔ وہ خود تو یہاں نہیں آئے لیکن ان کے خلیفہ شیخ بہاء الدین زکریا نے جو خواجہ قطب الدین بختیار اور بابا فرید گنج شکر کے ہمعصر تھے۔ ملتان میں اپنی خانقاہ قائم کی۔ اس سلسلہ کو سب سے زیادہ فروغ ان کے پوتے شیخ رکن الدین (ف ۷۳۵ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ ان کے تعلقات شیخ نظام الدین سے بہت خوشگوار تھے۔ دہلی میں شیخ نے ان کا استقبال کیا تھا جب شیخ رکن عالم کی مبارک شاہ خلجی سے ملاقات ہوئی۔ تو اس نے دریافت کیا کہ دہلی میں سب سے پہلے آپ کس شخص سے ملے شیخ نے جواب دیا کہ اس شہر کی عظیم ترین ہستی سے سلطان خاموش ہو گیا۔ شیخ رکن عالم کے بعد اس سلسلہ کے مشہور ترین بزرگ مخدوم شیخ جلال الدین جہانیاں جہاں گشت ہوئے۔ جن کی وجہ سے اُچھ کو بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس عہد کے سلاطین اور امراء میں سے اکثر ان سے اعتقاد رکھتے تھے۔ فیروز شاہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ سلطان ان کا کس قدر احترام کرتا تھا اور ان کی تعلیمات سے کس حد تک متاثر تھا اس کا ذکر مشائخ کے تذکروں کے علاوہ عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں بھی موجود ہے۔ چند پشتوں کے بعد اس سلسلہ کے ایک اور بزرگ شیخ سماء الدین قابلِ ذکر ہیں۔ سلطان سکندر لودھی ان سے اور ان کے مشہور خلیفہ مولانا جمالی مصنف سیر العارفین سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ چشتی و سہروردی سلسلوں کے علاوہ اور سلسلوں کے مشائخ بھی یہاں کام کر رہے تھے۔ لیکن ان میں سے مشہور شخصیتیں زیادہ تر سولھویں صدی میں ہوئی ہیں ان کا ذکر اس جگہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ لیکن اس سے قطعی طور پر غیر متعلق طریقوں سے ان مشائخ نے ایک طرف تو مسلم معاشرہ کو اسلامی تعلیمات سے قریب رکھنے میں پوری کوشش کی اور دوسری طرف غیر مسلموں کو قریب لا کر ان میں تبلیغ کی اور لاتعداد خاندانوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ صوفیہ عام طور پر اور چشتی مشائخ خاص طور پر درباری سیاست سے علیحدہ رہتے تھے یہ ان کے بلند کردار ہونے کی بہت

Marfat.com

زبردست شہادت تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ سلاطین ان کا احترام کرتے ہوئے ان کی تعلیمات سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے یہ لوگ صرف سیاست ہی سے علیحدہ نہیں رہتے تھے بلکہ اکثر حکمرانوں کی دی ہوئی جاگیریں بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ اور توکل اور فقر کی بنیاد پر زندگی گزارتے تھے۔ ان اوصاف کی وجہ سے وہ ہر طبقہ میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جابر سے جابر بادشاہ ان کے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ملتان کے ایک موقع پر بغاوت فرو کرنے کے بعد محمد بن تغلق وہاں قتل عام کرانا چاہتا تھا۔ لیکن جب شیخ رکن عالم نے اس سے سفارش کی۔ کہ ایسا نہ کرے تو اس نے فوراً اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ علاؤالدین خلجی اپنی مشکلات میں شیخ نظام الدین اولیاء سے دعا کا طلب ہوا کرتا تھا اس نے اپنے دو بیٹوں کو ان سے بیعت بھی کرا دیا تھا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہد سلطنت میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں صوفیا نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

تبلیغی کوششوں کی کامیابی کا انحصار اس پر تھا کہ مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات خوشگوار ہوں۔ اس سلسلہ میں بھی ان مشائخ نے بہت کوشش کی۔ حربی اور سیاسی فتوحات کے بعد ایک ایسا دور آتا ہے جس میں مفتوحہ اقوام فاتحین سے نفرت کا اظہار کرتی رہتی ہیں برصغیر میں اس جذبہ نفرت کو ختم کرنے میں صوفیا کی روا داری اور وسعت خیال کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ ان لوگوں نے خدمت خلق کو اپنا اولین مقصد قرار دیا اور یہ کوشش کی کہ غیر مسلم اقوام کو مسلمانوں کے قریب تر لائیں اس سلسلہ میں تبلیغ کی خاطر انہوں نے مقامی زبانوں سے واقفیت حاصل کی اور موقع بہ موقع ان کی اصطلاحات کا بھی استعمال کیا۔ تذکروں میں ہم کو ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خانقاہوں میں غیر مسلم آتے تھے۔ اور ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایمان لے آتے تھے ہندو اور مسلم اقوام کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی یہ کوشش اسلامی سلطنت کے استحکام کے لیے بھی مفید ثابت ہوئی۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ قیام سلطنت کے بعد ہندوؤں نے کوئی بڑی بغاوت مذہبی اختلافات کی بنیاد پر نہیں کی جن بغاوتوں کا ذکر تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے وہ یا تو ہندو راجاؤں اور سرداروں کی بغاوتیں تھیں یا ہندو علاقوں میں رہزنوں کی۔

Marfat.com

علما: اسلامی معاشرہ میں دو اہم طبقہ علماء کا تھا۔ بعض مورخوں نے علماء کو اسلام میں پروہت یا پادری کا قائم مقام سمجھ لیا ہے یہ بہت بڑی غلطی ہے اور اس کی وجہ سے انہوں نے بے سروپا نتائج اخذ کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ اسلام میں نہ کلیسا (CHURCH) کی گنجائش ہے نہ پروہت (PRIEST) کی کیونکہ اسلامی شریعت کے لحاظ سے ہر شخص کا خدا سے براہ راست تعلق ہے۔ اسلام کی تاریخ میں کلیسا اور ریاست (CHURCH AND STATE) کی کشمکش کا کوئی باب نہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔ علماء دراصل ان فضلاء کو کہتے تھے جو دینی علوم میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ اور اپنی زندگی اسی کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ حکمران اور دربار سے علماء کا تعلق، اس لئے ناگزیر تھا کہ جو قانون حکمران کو نافذ کرنا ہوتا تھا۔ اس کی تشریح اور ترجمانی کی اہلیت ان ہی میں ہوتی تھی۔ علم فقہ، دینی اور دنیوی زندگی کے ہر پہلو کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے ہر مسئلہ پر فقہاء فیصلہ اور اجتہاد مستند سمجھا جاتا تھا۔ صدر الصدور اور عدلیہ کے دوسرے حکام کا فقہ سے واقف ہونا ضروری تھا۔ اس علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ علماء اور ان کے مدرسے ہی تھے۔ چنانچہ معاشرہ میں ان کا اثر بہت زیادہ تھا۔ علماء کا دینی زندگی سے بہت گہرا تعلق تھا۔ لیکن ان کے فرائض کی انجام دہی دنیوی امور سے بھی ان کو بے تعلق رہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ یہ بھی کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں کہ دنیوی امور میں پھنس کر ان میں سے بعض کا کردار بگڑ جاتا تھا۔ اور لالچ کی وجہ سے وہ ایسی حرکات کا مرتکب ہوتے تھے جو دینی رہنماؤں کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھیں۔ ہم کو اس دور کے ادب میں علماء کا ذکر ملتا ہے مفتیوں اور قاضیوں میں بھی بعض یقیناً ایسے ہوں گے۔ لیکن دیانت پر عزت وجاہ یا مال و دولت کو ترجیح دیتے ہوں گے۔ لیکن ان مستثنیات کی بناء پر علماء کی خدمات اور ان کے کارناموں کو نظر انداز کرنا یا ان پر بحیثیت ایک طبقہ کے تنقید کرنا مطالعہ تاریخ کے اصول کے خلاف ہوگا۔ ڈاکٹر کے ایم اشرف نے اپنی کتاب لائف اینڈ کنڈیشنز آف دی پیپل آف ہندوستان (صفحہ ۱۸۴) میں علماء کے پورے طبقہ پر تنقید کی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علماء مال و دولت کے لالچ میں آکر حق کے راستہ سے ہٹ جاتے تھے اس سلسلہ میں انہوں نے دو واقعات کا ذکر کیا ہے اور ان ہی کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا ہے ایک تو یہ کہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے وقت بلبن نے کہا " اے محمود تو نے ان علماء مشائخ او

Marfat.com

بزرگوں کو نہیں دیکھا، جن کو میں نے اپنے مالک شمس الدین ایلتمش کو پند و نصیحت کرتے ہوئے سنا ہے اب اس زمانہ میں علماء اور مشائخ اپنے متدین اور خدا ترس نہیں کہ بادشاہ کے سامنے محنت بات کہیں اور اس کو ایسی نصیحت کریں جو اس کو تلخ معلوم ہو دوسرا واقعہ جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں یہ ہے کہ بعض علماء نے کیقباد کو اجازت دے دی تھی کہ وہ روزے نہ رکھے دونوں مثالوں میں بعض علماء کا ذکر ہے شاید یہ مخصوص لوگ ہوں گے جن کے شہزادہ سے تعلقات ہوں گے۔ ان بیانات کی بناء پر علماء کے طبقہ کو کلیتہً لالچی یا بددیانت نہیں کہا جا سکتا ان کو اس طبقہ سے علیحدہ کیا گیا ہے اور ان کے لیے یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں " دانشمندان بے دیانت نامسلمان " یہ بات دلچسپ ہے کہ مورخ نے ان کو دانشمندان کہا ہے علماء نہیں کہا۔ ان واقعات کی روشنی میں ڈاکٹر اشرف کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ بلبن کے زمانہ میں بھی ایسے علماء موجود تھے جن کی وعظوں میں وہ شرکت ہی نہیں کرتا تھا کیونکہ ان کی تقریروں سے متاثر ہو کر اس پر رقت بھی طاری ہو جاتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی اور ادبی زندگی میں علماء نے بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں یہی لوگ مدرسے چلاتے تھے تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ اور وہ اس سلسلہ میں بڑا ایثار کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی وہی انجام دیتے تھے۔ عدلیہ کے لیے لاتعداد مفتی اور قاضی درکار تھے۔ یہ سب علماء ہی کے زیر نگرانی تربیت حاصل کرتے تھے ان ہی خدمات کا نتیجہ تھا کہ علماء معاشرہ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

امراء

سلطنت کے نظام حکمرانی میں امراء کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ابتداء میں تو ان کا بہت اثر تھا۔ اور سلطان ان پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ ان کے عام طور پر تین طبقے تھے خان۔ ملک۔ اور امیر ان میں سے بعض غیر معمولی اثر قائم کر لیتے تھے اور ان کو مخصوص خطابات سے سرفراز کیا جاتا تھا۔ مثلاً۔ بلبن کو الغ خان کا خطاب ملا تھا۔ شروع میں تو امراء میں زیادہ تر بیرونی عناصر تھا۔ دوسرے اسلامی ممالک سے جو لوگ آتے تھے۔ یہاں ان کو ان کی صلاحیت کے مطابق مناصب مل جاتے تھے۔ ان میں اکثریت ترکوں کی تھی۔ لیکن خلجی خاندان کا اقتدار قائم ہونے کے بعد مقامی امراء کی تعداد بڑھنے لگی۔ سلطان محمد بن تغلق کے

Marfat.com

عہد میں بیرونی عنصر بھی کافی ہو گیا ۔ تیرھویں صدی میں چالیس با اثر امراء نے ایک گروہ بنا لیا تھا ان کا اثر اس قدر بڑھ گیا تھا ۔ ایلتمش کے بعد کئی حکمرانوں کو انہوں نے تخت پر بٹھلایا اور معزول کیا آخر کار بلبن نے ان کے اس اثر کا خاتمہ کر دیا ۔ بعض مورخوں نے یہاں کے درباری امراء کو یورپ کے فیوڈل لارڈز سے مشابہت دینے کی کوشش کی ہے یہ نظریہ غلط ہے امراء کی اس زمانہ میں بھی جب کہ جاگیریں ان کو ملتی تھیں ۔ یہاں وہ حیثیت نہیں رہی جو یورپ میں لارڈز کی تھی ۔

مسلم عوام

مسلمانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ وہ لوگ تھے ۔ جنہوں نے یہاں شادیاں کرکے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی ۔ یا یہاں کے رہنے والوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ آخر الذکر اپنے ساتھ اپنی قدیم روایات لے آئے تھے ۔ مسلمان ہونے کے بعد ذات پات کی تقسیم تو ختم ہو جاتی تھی ۔ لیکن پھر بھی اس کا اثر اتنا ضرور باقی رہتا تھا کہ بعض پیشے خاندانوں میں وراثتاً نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے مثلاً سنار ۔ لوہار ۔ نوربافت وغیرہ کے پیشے یہ لوگ اسی نام سے پکارے جاتے تھے ذات ختم ہونے پر اس کی جگہ برادری نے لے لی تھی ۔ بہرحال اس پیشہ وارانہ تقسیم اور برادریوں کے وجود میں آجانے سے اسلامی مساوات متاثر نہیں ہوتی ۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مسجدوں میں جاہل مسلمان عالم کے برابر اور غریب مسلمان مالدار کے برابر کھڑا ہو کر نماز با جماعت ادا کرتا اس طرح کھانے میں یہ لوگ ایک دوسرے کے برابر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے ۔ اس نظریہ سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ نماز، تہواروں اور کھانے وغیرہ کی محفلوں میں اسلامی مساوات کا مظاہرہ یہاں کے لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہوگا ۔ اور ان پر اس کا اثر ضرور ہوتا ہوگا ۔ اس طرح اسلام کی اشاعت میں اس چیز سے مدد ملتی ہوگی ۔ ہندوؤں کی محفلوں کی اونچی ذات کا فرد نیچی ذات والے کے ساتھ نہ برابر بیٹھ سکتا تھا نہ کھانا کھا سکتا تھا ۔

Marfat.com

ہندو معاشرہ

ہندو معاشرہ کی سب سے نمایاں خصوصیت ذات کی بنیاد پر تقسیم رہی ہے ابتدا میں صرف چار ورن یا ذاتیں تھیں ۔ لیکن زمانہ کے ساتھ ان کی تعداد بڑھتی رہی اور ذاتوں میں دوری بھی زیادہ سخت ہوتی گئی ۔ ابتدائی چار درنوں میں برہمنوں کو اعلیٰ مقام حاصل تھا ان کے سپرد علمی اور مذہبی معاملات تھے چھتری ان سے کمتر حیثیت رکھتے حکومت اور سپہ گری ان کے مخصوص پیشے تھے ۔ اہل حرفہ ۔ صنعت کار ۔ کاریگر وغیرہ سب ولیش ذات سے تعلق رکھتے تھے ۔ چوتھی ذات شودر تھی ۔ یہ لوگ غلام اور ذاتی ملازم ہوتے تھے ۔ ان کو تینوں ذاتوں سے کمتر خیال کیا جاتا تھا ان کو یہ بھی اجازت نہ تھی کہ اونچی ذات والوں کے نزدیک رہ سکیں اس لئے اچھوت ہو گئے تھے ۔ یوں تو ہندوؤں کی زندگی کے ہر شعبہ میں حصہ لینے کی اجازت تھی ۔ لیکن قدرتی طور پہ وہ فوج اور حکومت میں اتنی تعداد میں نہ تھے جتنے مختلف پیشوں اور تجارتی کاروبار میں تھے ۔ عہد سلطنت میں معاشری زندگی کا ایک دلچسپ مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات تھے اس طویل دور میں ہم کو ہندو مسلم مناقشات یا ہندوؤں کی بغاوتوں کے واقعات نہیں ملتے اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے ۔ کہ مسلم حکمرانوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ سب امن کی زندگی بسر کر سکتے تھے یہ تو ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں فرد کی آزادی کا وہ تصور موجود نہ تھا جو آج ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں کی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مسلم حکومت مداخلت نہیں کرتی تھی ۔ دیہاتوں کی تقریباً ساری آبادی ہندو تھی ۔ یہ لوگ اپنی زندگی اس اطمینان اور آزادی سے بسر کرتے تھے جیسے کہ ہندو عہد میں ۔ ہندو معاشرہ کی جملہ روایات اور خصوصیات ہندو مذہب کے عقائد اور رسومات اور یہاں کی مختلف زبانیں اس دور میں زندہ رہنے اور ان کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچا ۔ یہ اسلامی حکومت کا بہت عظیم الشان کارنامہ ہے ۔

بھگتی تحریک

اسلام اور بالخصوص صوفیا و مشائخ نے جس طرح ہندوؤں کے مختلف طبقوں کو اپنے تصورات اور کردار سے متاثر کیا تھا ۔ اس کا ردِ عمل لازمی تھا ۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات میں اس کی شہادت موجود ہے کہ بعض وہ لوگ بھی اسلام کی بنیادی تعلیمات کے کچھ حصے سے متاثر ہوئے جنہوں نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا ۔ اسلام کے تصور توحید نے اور صوفیہ

Marfat.com

کے اس نظریہ نے کہ عشق الٰہی مذہب کی روح ہے ان لوگوں پر گہرا اثر کیا اس طرح سماجی تصورات، یں انسانی مساوات کے نظریہ کو اسلام ہی کی بدولت جگہ ملی بھگتی تحریک جس سے ان تصورات کو ہم انتہائی واضح شکل میں دیکھتے ہیں اسلامی تعلیمات کے رواج پانے کے بعد ہی مقبول ہوئی۔ اگرچہ اس کی ابتداء اور اصل ہم کو قدیم عہد میں ملتی ہے مورخین کا خیال ہے کہ اس کی اصل جین اور بدھ تحریکوں میں تلاش کی جا سکتی ہے بعد میں ہندو مذہب کی ویشنو شاخ میں بھی اس کا وجود نظر آتا ہے۔ لیکن آٹھویں صدی کے بعد یہ کمزور پڑ گئی۔ ایک خاص سبب شنکراچاریہ شیومت کو رواج دینا اور اس کے لئے وسیع پیمانے پر تبلیغی کوشش کرنا تھا۔ گیارھویں صدی میں جنوبی ہند میں ایک مفکر رامانج نے اس کا احیا کیا۔ انہوں نے بتلایا کہ خدا صرف خیالی ہستی نہیں ہے بلکہ اس کی ذات صفات سے متصف ہے، نیز یہ کہ ہر روح اس کی ذات سے اس طرح نکلتی ہے جیسے آگ سے چنگاری، بھگتی کا دوسرا اہم راہنما بھی جنوب ہی میں تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم میں کرشن کو اعلےٰ مقام دیا لیکن اس تحریک کے عظیم رہنما راما نند ہوئے انہوں نے رام اور سیتا کی عبادت پر زور دیا اور تقسیم ذات کی بہت سختی سے مخالفت کی۔ ان کی تحریک بہت جلد پھیلی کیوں کہ وہ زیادہ ترنیچی ذات کے لوگوں کو اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ تبلیغ کا کام عوام کی زبان میں کرتے تھے۔

Marfat.com

کبیر چیتنیہ اور نانک

رامانند کے سب سے مشہور عقیدت مند اور چیلے کبیر تھے وہ بنارس کے ایک برہمن عورت کی ناجائز اولاد تھے۔ جو اپنے گناہ کو چھپانے کی غرض سے اپنے بچہ کو ایک تالاب کے کنارے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ اس بچہ کو اتفاق سے ایک مسلمان جولاہے نیرو نے دیکھا وہ اس کو اٹھالے گیا اور اس کی بیوی نے اس کی پرورش کی ابھی کبیر کی عمر زیادہ نہ تھی کہ وہ رامانند کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور ان کے ارادت مندوں میں داخل ہوگئے۔ ان کے عقائد اور دینی رجحانات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ خدا کی محبت کے علاوہ کسی مذہب کے خصوصی عقائد اس کی ظاہری رسوم اور عبادات وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے مستند حالات بہت کم دست یاب ہوئے ہیں۔ لیکن اکثر ایسی روایتیں مشہور ہو گئی ہیں جن پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا، ان ہی بیانات میں ایک یہ روایت بھی ہے۔ کہ وہ ہندو پنڈتوں اور مسلمان صوفیا سے مناظرے کیا کرتے تھے ان کی وفات پر کہا جاتا ہے۔ کہ ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا دونوں کہتے تھے۔ کہ وہ ان کے ہم مذہب ہیں اور اسی طریقہ سے ان کی تجہیز و تکفین ہونا چاہیئے قصہ مشہور ہے کہ ان کی میت پر چادر ڈال دی گئی جب اس کو اٹھایا گیا تو بجائے مردہ جسم کے پھول تھے۔ آدھے پھول مسلمانوں نے ناگہر میں دفن کر دیئے اور آدھے ہندوؤں نے بنارس لے جا کر جلا دیئے۔ کبیر نے زندگی گذاری اور کہا جاتا ہے۔ کہ ان کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کبیر رامانند کے چیلے مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی فکر اور تعلیمات پر ان کا گہرا اثر تھا۔ وہ خدا کو رام کہتے تھے۔ اور اس کے متصف بہ صفات ہونے میں اعتقاد رکھتے تھے وہ تقسیم

Marfat.com

ذات کے سخت خلاف تھے۔ اور برہمنوں نے جو رسومات قائم کر رکھی تھیں۔ ان کو پسند نہیں کرتے تھے ان کا ایک قول ہے ہر شخص یا بے وقوف ہے یا عقل مند۔ لیکن رام کو کوئی نہیں جانتا حالانکہ وہ ہر ایک دل میں ہے کبیر صرف توحید اور خدا کی محبت پر زور دیتے تھے اس لئے مسلمانوں اور ہندو دونوں کا ایک طبقہ ان کا احترام کرتا تھا۔ صوفیا بھی توحید اور عشق الٰہی پر زور دیتے تھے مگر ان میں اور کبیر یا بھگتی تحریک دوسرے راہنماؤں میں بہت بڑا فرق یہ تھا کہ صوفیا قرآنی تعلیمات اور رسول اللہ کی ہدایت ہی کو خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ جانتے تھے۔

اس دور کے ایک اور مشہور رہنما چیتنیہ تھے وہ ۱۴۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ لیکن بہت جلد ان کا دل دنیا کی طرف سے ہٹ گیا وہ گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے لگے اس سلسلہ میں وہ پوری میں قیام پذیر ہوئے اور تقریباً اٹھارہ سال تک وہیں رہے ۱۵۳۳ء میں انہوں نے وفات پائی۔ انہوں نے ہندومت کی مذہبی رسوم اور طریقہ عبادت کی مخالفت کی۔ تقسیم ذات کی مذمت کی۔ اور ہندوؤں کے عقیدہ کرم کو غلط کیا۔ انہوں نے عشق الٰہی پر بہت زور دیا ان کی نظر میں کرشن دیوتا کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ خود محبت کا دیوتا ان سے محبت کرتا تھا۔ کرشن کی "دل لگی"، کا سلسلہ سورج کے طلوع و غروب کی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔ کرشن کی تین قوتیں ہیں۔ دوامی جو در حقیقت عقل (INTLLIGENCE) ہے بیرونی جو ظاہری شکل کو وجود میں لاتی ہے۔ اور متمیزہ (DEFERENTIATE) جو انفرادی روح بناتی ہے اس کی خاص قوت ہے جس سے محبت پیدا ہوتی ہے جب یہ محبت کسی دل میں داخل ہو جاتی ہے تو وہ ہہا بھاؤ (بہترین احساس) بن جاتی ہے اور جب محبت اپنی انتہائی بلندی پر پہنچتی ہے تو وہ رادھا کا روپ اختیار کر لیتی ہے جو سب سے زیادہ محبت کئے جانے کی اہل ہے اور جس میں جملہ خوبیاں موجود ہیں وہ کرشن کی انتہائی محبت کا مرکز ہے اور چونکہ حقیقتاً وہ مجسم محبت ہے دل کے بعض لطیف احساسات اس کا زیور سمجھے جاتے ہیں گو یا ان کی "دل لگیاں" صرف پریم کی وجہ سے ہیں۔ پرماتما یعنی روح اعلےٰ لامحدود ہے اور عقل سے متصف فرد کی روح ایک ایٹم ہے۔ جس میں عقل موجود ہے وہ لازمی طور پر ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور یہ تعلق کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ مختصراً چیتنیہ کی تعلیمات نے روح میں جذبات کی تہذیب پر بہت زور دیا محبت ان تعلیمات کی روح رواں تھی۔

گورو نانک جو بعد میں سکھ مذہب کے بانی ہوئے لاہور کے قریب ایک گاؤں تلونڈی میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے کبیر کی طرح انہوں نے بھی بت پرستی اور ہندوؤں کی تقسیم ذات کی سخت مذمت کی اور

Marfat.com

توحید پر بے حد زور دیا ان کے خیال میں نیک کام اور صاف زندگی خالی اور بے نتیجہ بحثوں سے بہتر تھے ان کی تعلیمات کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے مذہب صرف زبانی باتوں کا نام نہیں جو شخص سب انسانوں کو برابر سمجھتا ہے وہ ہی خود مذہبی انسان ہے مذہب مزاروں پے مردہ گھاٹوں پر جانے اور ایک خاص طرز سے بیٹھ کر مراقبہ کا نام نہیں نہ مذہب دوسرے ممالک کا سفر کرنے اور گاہوں کے مقامات پر جا کر نہانے کو کہتے ہیں دنیا کی گندگیوں میں رہ کر صفائی حاصل کرو اس طریقہ سے تم کو مذہب کا صحیح راستہ ملے گا۔ بھگتی اور سکھ تحریکوں کے بانی راہنماؤں کی ان تعلیمات میں اسلام کے تصورات کا اثر نہایت نمایاں نظر آتا ہے وہ سب توحید پر زور دیتے تھے۔ جو اسلامی عقائد کی بنیاد ہے اسی طرح تقسیم ذات کو وہ سب ختم کرنا چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کی تعلیمات بنیادی طور پر ہندو مذہب سے ٹکراتی تھیں۔ برصغیر کی سماجی زندگی کی انہوں نے بھی صوفیا کی طرح بہت زیادہ اصلاح کی اور اخلاقی پہلوؤں پر زیادہ زور نہیں دیا۔ جس سے ہندو اور مسلم اقوام کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے بعض مورخین نے بھگتی تحریک میں ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی ابتدا دیکھنے کی کوشش کی ہے جو لوگ ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم کہتے ہیں وہ مذہب کو قومیت کی بنیاد نہیں تسلیم کرتے اور بھگتی خالص مذہبی تحریک تھی۔ قومیت سے اس کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں قومیت کا تصور مذہب ہی بنیاد پر ابھرا یہی سبب ہے کہ یہاں ایک نہیں بلکہ دو قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلم ان کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی مذہبی اقلیتیں بھی علیحدہ قومیں ہو کر رہ گئیں۔

اقتصادی زندگی

یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں کی اقتصادی زندگی، سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ بعض مورخوں نے سلطان محمود کے حملوں اور ان کے نتیجہ میں یہاں سے جو دولت باہر جاتی تھی۔ ان پر زور دیتے ہوئے اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس سے برصغیر کی اقتصادی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا یہ تو صحیح ہے کہ محمود اپنے ساتھ ہر حملہ کے بعد مال غنیمت لے گیا لیکن زر و جواہر کے وہ ڈھیر جو محمود لے گیا۔ یہاں کی اقتصادی زندگی کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہو رہے تھے یہ زیادہ تر مندروں یا راجاؤں کے محلوں میں ذخیروں کی شکل میں تھے۔ آج کل کسی ملک میں سونے وغیرہ کے سرکاری ذخیرے اس کی حکومت کی بین الاقوامی سیاست اور تجارت میں ساکھ قائم کرنے کے

Marfat.com

لئے ضروری بلکہ ناگزیر ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اپنے سونے کے ذخیروں میں اضافہ کرتا رہتا ہے لیکن جو سونا یا جواہرات محمود لے گیا ان سے یہ کام نہیں لیا جا رہا تھا۔ محمود کے بعد مسلم فاتحین نے اپنی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کی۔ انہوں نے برصغیر کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ قطب الدین ایبک کے زمانہ سے سلطنت دہلی، ایک علیحدہ سلطنت ہو گئی۔ اور غزنہ سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ التمش اور بلبن کی پالیسیوں اور کارناموں پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ عوام کو خوش حال بنانے اور قیام امن کے لئے کتنی کوشش کرتے تھے۔ بلبن نے منگولوں کے خلاف دماغی استحکام کے لئے اقدامات کئے۔ میوات میں رہزنی کا استحصال کیا۔ اور کٹھیر اور دوآبہ کے علاقوں میں ڈاکوؤں اور لیٹروں کو ختم کیا۔ اس کے ان اقدامات سے راستے محفوظ ہو گئے سفر میں سہولتیں پیدا ہو گئیں اور تجارت کے سلسلہ میں آمد و رفت بہت بڑھ گئی۔ سلطان علاؤالدین کا عہد اقتصادی تاریخ میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی انتظامی اور زرعی اصلاحات کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس نے دولت مند طبقہ کو بڑی حد تک کمزور کر دیا برنی نے یوں تو اقتصادیات کے متعلق تفصیل سے نہیں لکھا ہے۔ لیکن چند اشارات اس کی تاریخ میں بہت دلچسپ اور اہم ہیں۔ وہ کہتا تو یہ ہے۔ کہ دولت مندوں کی دولت لے کر ان کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا سارا وقت سازشوں کے متعلق سوچنے اور بغاوتوں کے منصوبے تیار کرنے کی بجائے روزی کمانے میں صرف کریں۔ یہ بیان غلط نہیں لیکن ان الفاظ کے ظاہری معنی سے علیحدہ بھی ان کی ایک اور اہمیت ہے دولت مند طبقہ کو اس طرح ختم کر دیا گیا اور ایک متوسط طبقہ وجود میں آ گیا قرون وسطی میں متوسط طبقہ کا وجود نہ تھا۔ لوگ یا غریب تھے یا مالدار اور جاگیردار متوسط الحال لوگ اتنے کم تھے۔ کہ زندگی کے کسی شعبہ میں ان کی کوئی آواز نہ تھی علاؤالدین نے جاگیرداری کو ختم کر کے اور مالدار طبقہ پر ٹیکسوں کا بار بڑھا کر اس طبقہ کو گویا، متوسط طبقہ میں تبدیل کر دیا۔ دوسرا قابل غور بیان برنی کا یہ ہے کہ سلطان علاؤالدین نے ایسے اقدامات کئے کہ دولت مند خاص طور سے گاؤں کے سربرآوردہ اور بااثر لوگ جن میں چودھری۔ مقدم۔ خوط اور بلاہر وغیرہ شامل تھے۔ اپنے ٹیکسوں کا بوجھ غربا پر نہیں ڈال سکتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ یورپ کے فیوڈل لارڈز کی طرح یہاں بھی یہ لوگ اپنی ادائیگیوں کا بوجھ غریبوں پر ڈال دیتے تھے۔ علاؤالدین نے اپنی ان اصلاحات سے اس خرابی کو دور کیا ان حالات کو سامنے رکھ کر علاؤالدین کی اقتصادی اصلاحات یعنی اشیا کی قیمتوں پر کنٹرول قائم کرنے کے منصوبہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی مقصد عوام کی اقتصادی حالت سنبھالنا ہی تھا شیخ نصیرالدین چراغ ۔۔۔ کے ملفوظات "خیر المجالس" میں ذکر ہے کہ ان اصلاحات کا مقصد صرف فوج کی تعداد بڑھانا ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ

Marfat.com

سلطان کے ذہن بھی عوام کو فائدہ پہنچانا بھی تھا۔اگر ہم علاؤالدین کے ان سب اقدامات کا مجموعی مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس نے ایک بااثر مگر خطرناک طبقہ کا وجود ختم کر دیا۔ دولت مند طبقہ صرف سلطان ہی کے لئے خطرناک نہ تھا یہ بات تو تاریخ کے ہر صفحے سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی خونی انقلاب یا خانہ جنگی ایسی نہ تھی جس میں اس طبقہ کے لوگ ملوث نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس طبقہ کا وجود عوام کے لئے بھی خطرہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اپنے مفاد اور خود غرضی کے پیش نظر یہ لوگ کاریگروں مزدوروں اور نچلے طبقہ کے دوسرے لوگوں کو ان کی محنت کا پورا فائدہ نہیں اٹھانے دیتے تھے یہ لوگ جو محنت اور کوشش کرتے تھے۔ اس کا ان کو پھل نہیں ملتا تھا اس کی وجہ پوشیدہ نہ تھی۔ اس محنت کی پیداوار کا بیشتر وہ جائز یا ناجائز طریقہ سے دولت مندوں کو پہنچتا تھا۔ اس دور کی سب سے بڑی صنعت زراعت تھی۔ اس کی کی کامیابی کا انحصار کاشت کار پر تھا۔ پیداوار اسی محنت کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس کے فائدے کا سب سے کم حصہ اس کے حصہ میں آتا تھا۔ بقیہ دولت مند طبقہ یا حکومت کے پاس کسی نہ کسی شکل میں چلا جاتا تھا۔ اس نفع گیری کے سب سے بڑے ایجنٹ گاؤں کے سربرآوردہ لوگ تھے ان ہی کے خلاف علاؤالدین نے سخت اقدام کئے تھے۔ امراء اور سرداروں میں جاگیرداری کی وجہ سے دولت کی فراوانی تھی اس نے اس سلسلہ کو بھی ختم کر دیا غرضیکہ اس سلطان نے جو اصلاحات نافذ کیں۔ ان کے نتیجہ میں شمالی برصغیر کی اقتصادی زندگی میں انقلاب آگیا۔ دولت مند طبقہ کا اثر کم ہونے سے قدرتی طور پر غربا یعنی عوام کی حالت بہتر ہو گئی۔ علاؤالدین اپنے منصوبہ کی تکمیل کا کس قدر خواہاں تھا اور عوام کے مفاد کا کس حد تک خیال رکھتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ابن نے بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے "اہل ہندا ب تک اس (علاؤالدین) کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ خود امور حکومت کو انجام دیتا تھا۔ اور ہر روز نرخ وغیرہ کی بات دریافت کر لیتا تھا۔ اور محتسب سے رپورٹ لیتا تھا۔ محتسب کو اس ملک میں رئیس کہتے تھے۔ ایک دفعہ اس نے محتسب سے دریافت کیا کہ گوشت کے گراں ہونے کا کیا سبب ہے اس نے کہا کہ گائے اور بکری پر زکوۃ (غالباً کوئی محصول ہوگا) لی جاتی ہے بادشاہ نے اسی روز سے کل محصول اس قسم کے معاف کر دیئے اور سوداگروں کو بلا کر راس المال اپنے خزانہ سے دیا اور کہا کہ اس کی گائے اور بکریاں خرید لاؤ اور ان کو بیچ کر قیمت خزانہ میں داخل کر دو۔ اور ان کی کچھ اجرت مقرر کر دی"۔

علاؤالدین کی اصلاحات میں سے اکثر اور اس کے مقرر کردہ نرخ اس کی موت کے بعد جلد ہی ختم ہو گئے اور اس کے بیٹے مبارک شاہ خلجی نے عیاشی فحاشی اور غیر ذمہ دارانہ زندگی کے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جس میں ان سنجیدہ مسائل پر عمل تو کیا غور بھی نہیں ہو سکتا تھا اس نے اور اس کے بعد اس کے

Marfat.com

غلام خسرو خان نے اقتصادی زندگی کو پھر پرانے خطوط پر ڈال دیا اور مزید خرابی یہ پیدا کر دی کہ سرکاری خزانہ کا سارا روپیہ ختم کر کے حکومت کو کنگال کر دیا یہی سبب تھا کہ غیاث الدین تغلق کو ایک خالی خزانہ سے حکومت کا کام چلانا پڑا بہر حال اس حکمران کے عہد میں بھی جیسا کہ ہم جانتے ہیں کاشت کاروں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف حکومت کی توجہ تھی۔ اس کے جانشین محمد بن تغلق کی اصلاحات اور اس کے منصوبے بہت دلچسپ ہیں ان منصوبوں کی تباہ کاری پر مورخوں نے اتنا زور دیا ہے کہ ان کے بعض پہلوؤں کو ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہاں چند اشارے کئے جا سکتے ہیں دولت آباد کو دار الحکومت کی حیثیت دینے سے جو نتائج بر آمد ہوئے ان میں اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ شمالی علاقوں میں سے بڑی تعداد میں صنعت کار تاجر اور کاریگر دکن میں پہنچے ہوں گے۔ اس سے یقیناً وہاں کی زندگی متاثر ہوئی ہوگی۔ فن تعمیر پر جو اثرات ہوئے ان کی نشانیاں تو آج تک موجود ہیں لیکن جہاں تک اقتصادی زندگی کا تعلق ہے۔ تجارت اور صنعت نے زبردست ترقی کی ہوگی۔ اسی طرح محمد بن تغلق کے دوسرے منصوبہ یعنی تانبے کا سکہ چلانے کا غور کے ساتھ تجزیہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا۔ اس کی تباہ کاری کے بیانات میں بھی ایک پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں سکوں کے سلسلہ میں جعل سازی کے ایک گروہ کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ چاندی کے سکے حاصل کرتے رہے اور خزانہ ان سے خالی ہوتا رہا۔ اس سے حکومت کی مالی حالت تو یقیناً بری طرح متاثر ہوئی لیکن چاندی کے سکوں کی بڑی تعداد جو خزانہ سے نکلی وہ خود یہیں کے لوگوں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا یہ پہلو تو یقیناً افسوس ناک ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کا ایک گروہ اس طرح دولت مند ہو گیا اور بہت سے ایمان داری کے ساتھ کام کرنے والے لوگ مفلوک الحال ہو گئے ہوں گے۔ لیکن سکوں کے اس ردوبدل کو اگر بلندی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سلطنت کے اندر ہی رہے بلکہ ایک حد تک ان سے یہ فائدہ ہوا ہوا ہوگا۔ کہ وہ کاروبار میں لگا دیئے گئے۔

محمد بن تغلق کے جانشین فیروز شاہ کا بہت سے محصولوں کو منسوخ کرنا اور زیر کاشت رقبہ کو بڑھانے کی غرض سے نہریں اور کنویں کھدوانا خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے عوام کی خوشحالی میں یقیناً اضافہ ہوگا جس کا سب سے بڑا ثبوت ہم کو اس سے ملتا ہے کہ اس کے دور میں بھی اجناس اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتیں دوبارہ کم ہو گئیں اور اس موقع پر ان کو شاہی احکامات کی مصنوعی مشین کے ذریعہ سے کم نہیں کیا گیا تھا بلکہ معاشی اور اقتصادی حالات کے قدرتی اثرات سے بازار کے نرخوں میں کمی ہوئی۔

Marfat.com

معاشی خاکہ

جنس	علاؤالدین خلجی کا عہد	محمد بن تغلق کا عہد	فیروز شاہ کا عہد
گیہوں	۷½ جتیل فی من	۱۲ جتیل فی من	۸ جتیل فی من
جو	۴ 〃 〃 〃	۸ 〃 〃 〃	۴ 〃 〃 〃
دھان	۵ 〃 〃 〃	۱۵ 〃 〃 〃	۴ 〃 〃 〃
نخود	۵ 〃 〃 〃		۴ 〃 〃 〃
شکر	۱½ فی سیر		۳½ فی سیر

بعض تاریخوں میں چند اور اشیاء کا نرخ بھی دیا گیا ہے اس نقشہ کو وسعت دی جا سکتی ہے لیکن اندازہ لگانے کے لئے یہ کافی ہے۔ اقتصادی زندگی کے اس مختصر خاکہ سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں عوام خوش حال زندگی بسر کرتے تھے اس کا ایک بڑا سبب اشیاء ضرورت کی قیمتوں کا کم ہونا تھا۔

سوال :- سلاطین دہلی کے عہد کی علمی اور ادبی ترقی پر مفصل بحث کیجئے۔

سلاطین دہلی کے سوا تین سو سالہ عہد میں ادب کی بعض شاخوں نے نمایاں ترقی کی۔ اس زمانہ میں صرف قدیم زبانوں کو ہی فروغ نہیں ہوا بلکہ ایک نئی زبان (اردو) بھی وجود میں آئی۔ اس کی نشوونما کی ابتدائی منزلیں اسی دور میں طے ہوئیں۔ لیکن یہاں یہ ممکن نہیں کہ ان تمام مسائل کی تفصیلات پیش کی جائیں۔ بہرحال تہذیب وتمدن کی رفتار کا خاکہ تیار کرنے میں ان مختصر اشارات سے بھی کافی مدد مل سکتی ہے جو بیان کئے جا رہے ہیں۔ تاریخی ادب اور بعض معاصر کے متعلق قدرے زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں۔

البیرونی

سلطان محمود غزنوی کے عہد میں جن فضلا، شعرا وغیرہ کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی ان میں البیرونی کی کتاب کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے۔ البیرونی کی تاریخی تصنیف کتاب الہند ہے۔ البیرونی خود برصغیر میں آیا اور کئی سال یہاں قیام کر کے اس نے یہاں کے حالات معاشرہ ادب فلسفہ دینی اور سماجی رسوم وغیرہ کا بغور مطالعہ کیا چونکہ مورخ اور ادیب ہونے کے علاوہ وہ سائنس کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس لئے اس

Marfat.com

نے جو نتائج اخذ کئے ہیں اور جو حالات لکھے ہیں ان کو ہم اس دور کی اصطلاحی زبان میں "سائنٹفک اور اسٹڈی" کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کی تاریخ اور حالات کے مطالعہ کے لئے یہ انتہائی مستند اور مفید ماخذ ہے قرون وسطی اور دور جدید کے مورخ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر ای۔ ڈی سخاؤ نے اس کا عربی متن بھی شائع کیا ہے اور انگریزی ترجمہ بھی اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں لکھی جانے والی تاریخی تصانیف میں سب سے پہلی قابل ذکر کتاب تاج المآثر ہے اس کے مصنف صدر الدین حسن نظامی اپنے وطن نیشاپور کو چھوڑ کر پہلے غزنہ آئے اور وہاں سے دہلی آگئے ۱۲۰۶ء میں شرف الملک قاضی القضاۃ کی سرپرستی میں صدر الدین نے یہ کتاب شروع کی۔ اس میں سلطان معزالدین قطب الدین اور التمش کے ابتدائی دور کے حالات میں اس کا طرز تحریر مرصع اور مسجع ہے۔ مصنف نے ادبی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ چنانچہ اس میں تاریخی معلومات بہت محدود ہیں۔

فخر مدبر

اس عہد کا ایک اور مورخ مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر ہے۔ اس کی کتاب کا ایک حصہ سر ڈینی سن راس نے تاریخ فخرالدین مبارک شاہ[1] کے نام سے شائع کیا ہے اس کی دوسری اہم کتاب آداب الحرب و الشجاعۃ ہے جو التمش کے زمانہ میں لکھی گئی اور اسی کے نام معنون کی گئی ہے۔

قاضی منہاج الدین سراج

تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں کے حملوں نے اسلامی دنیا میں جو تباہی مچائی اس کے نتیجہ میں بہت سے بڑے بڑے شہر غارت ہو گئے ان علاقوں سے بہت سے لوگ بھاگ کر یہاں آتے رہے ان میں شاہی خاندان کے ... امرا و سپاہی علما، فضلا، مشائخ غرض کہ ہر طبقہ کے لوگ تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنے قدیم وطنوں کی روایات ا... کمالات بھی لاتے چنانچہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان لوگوں کی آمد کے اثرات محسوس ہونے لگے اور یہاں تہذیب و تمدن کی ترقی میں ان سے بہت مدد ملی۔ ابتدائی دور کے آنے والوں میں ایک نمایاں شخصیت طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین سراج تھے۔ ان کی تاریخ

---

[1] مصنف کا یہ نام ہیں۔ ڈینی سن راس کو دھوکا ہوا اسی دور کا ایک اور اہل قلم یہ نام رکھتا تھا آداب الحرب والشجاعۃ کے مصنف کا نام صرف مبارک شاہ تھا وہ فخر مدبر بھی کہلاتا تھا۔

Marfat.com

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سلطان ناصرالدین کے نام سے منسوب ہے اور اسی کے عہد تک کے حالات ہم کو اس کیں ملتے ہیں قاضی منہاج نے اسلامی دنیا کے اور حصوں کی تاریخ بھی اس میں شامل کی ہے لیکن ہمارے لئے اس کا وہ حصہ بہت مفید ہے جس میں سلطنت دہلی کے حالات ہیں۔

عوفی

ایلتمش کا ہم عصر اور حریف ناصرالدین قباچہ بھی علمی سرپرستی اور ادب نوازی کے لحاظ سے سلاطین دہلی کے ہم پلہ تھا۔ اس کے دربار اور درباریوں سے بہت سے ادبا، اور فضلا منسلک تھے یہاں ہم ان میں سے کم از کم دو مورخوں کا ذکر کرتے ہیں یعنی عوفی اور ابوبکر کوفی۔

سدید الدین محمد عوفی بخارا میں پیدا ہوا۔ اس عہد کے مشہور مراکز علم و ادب میں قیام کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد مختلف مقامات میں قیام کرتا ہوا واپس وطن پہنچا لیکن منگولوں نے جب اس علاقہ پر حملے شروع کئے تو وہ ترک وطن کر کے پہلے غزنہ اور پھر لاہور آیا۔ یہاں سے وہ اُچھ گیا اور قباچہ کے دربار سے منسلک ہو گیا اس کو شاہی امام اور واعظ کے عہدے پر مامور کر دیا گیا۔ یہاں اس کی خوب قدر افزائی ہوئی اور قباچہ کے وزیر عین الملک نے اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہیں اس نے اپنی کتاب لباب الالباب مرتب کی۔ اس میں شعر و شاعری کی فضیلت اور معنی پر بحث ہے . . . . سلاطین ملوک امراء اور وزراء کی فارسی کا ذکر ہے . . . اور بعض مقامات کے ائمہ علما اور فضلا کی شاعری پر تبصرہ ہے مجموعی حیثیت سے یہ کتاب فارسی کے ابتدائی دور کے شعراء کا تذکرہ ہے . . . . فارسی کے بہت سے قدیم شعراء کے حالات اور ان کی شاعری کے نمونے صرف اسی کتاب کی بدولت ملتے ہیں[1] عوفی کی دوسری مشہور کتاب جوامع الحکایات ولوامع الروایات بھی قباچہ کے حکم سے شروع کی گئی تھی۔ لیکن ختم نہ ہونے پائی تھی۔ کہ قباچہ کو شکست ہو گئی اور اس نے وفات پائی۔ عوفی دربار دہلی سے منسلک ہو گیا اور وہیں ایلتمش کے وزیر الجنیدی کی سرپرستی میں اس کی تکمیل کی اور اسی کے نام معنون کی۔ اس کی چار جلدوں میں دو ہزار سے زیادہ حکایتیں اور روائتیں ہیں ان میں تاریخی واقعات بھی شامل ہیں۔ اور ایسی حکایات بھی جن کا مقصد اخلاقی تعلیم تھا بہر حال اس سے مولف کی وسعت نظر اور وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[1] بزم مملوکیہ ص۱۵

Marfat.com

کوفی مترجم چچنامہ

چچنامہ درحقیقت ایک عربی تصنیف کا عربی ترجمہ ہے لیکن چونکہ اصل کتاب نایاب ہے۔ اس لئے فارسی ترجمہ ہی نے اہمیت حاصل کرنی ہے محمد بن علی (مترجم) کا وطن تو کوفہ تھا لیکن وہ وہاں کی سکونت ترک کرکے اچھ آگیا تھا۔ یہاں سے وہ بھکر گیا جہاں اس کی ایک عالم سے ملاقات ہوئی انہوں نے عربی میں سندھ کی تاریخ جو ان کے اجداد میں سے کسی نے تیار کی تھی اس کو دکھلائی اس کا ترجمہ کرکے اس نے اس کو فتح نامہ کا نام دیا جو مقبول نہ ہوا اب چچ نامہ ہی مشہور ہے۔

چچنامہ سندھ اور اس کے بعد کے عہد کی تاریخ ہے یہ صحیح ہے کہ اس کی بعض روایتیں بے بنیاد ہیں مثلاً محمد بن قاسم کی موت کا سبب اور طریقہ جس کا اس نے ذکر کیا ہے قطعی غلط ہے لیکن مجموعہ حیثیت سے یہی کتاب سندھ کے اس دور کی تاریخ کا بڑا ماخذ ہے اور ہر زمانہ کے مورخوں نے اس سے استفادہ کیا ہے اس کا ترجمہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہو چکا ہے فارسی متن ڈاکٹر داؤد پوتہ نے معہ مقدمہ و تعلیقات شائع کیا ہے۔

قباچہ کے دربار میں بہت سے شعرا بھی تھے۔ ان میں سے بعض باکمال شعرا میں شمار کئے گئے ہیں جن کا ذکر ہم کو عوفی کی کتاب میں ملتا ہے ان میں شمس الدین محمد بلخی ضیا الدین سجزی اور فضلی ملتان قابل ذکر ہیں

ضیاالدین برنی

ضیاالدین برنی اس دور کا مشہور ترین مورخ ہے۔ اس کی کتاب تاریخ فیروز شاہی بلبن سے فیروز شاہ کے ابتدائی حالات تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ گویا سلاطین دہلی میں سب بڑے حکمرانوں کے حالات اس میں موجود ہیں فیروز شاہی کی یہی خصوصیت قابل ذکر ہیں کہ وہ عہد سلطنت کے کے اہم ترین دور کی تاریخ ہے حقیقت یہ ہے کہ اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے یہ کتاب ہمارے تاریخی ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکی ہے۔ وہ مجموعی طور پر بہت عمدہ تاریخ ہے اور اس دور کے لئے بہترین ماخذ ہے ہر زمانہ کے مورخوں نے اس کو سب سے زیادہ مستند ذریعہ معلومات شمار کیا ہے۔ برنی نہایت ذہین مورخ ہے اسلامی تاریخ پر اس کی نظر بہت وسیع ہے۔ ابتدا میں اس نے مقدمہ کے طور پر فن تاریخ کی خوبیوں اور اس کے منافع پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ شاید آج ہم کو اس کے بعض بیانات مبالغہ آمیز معلوم ہوں۔ لیکن اگر ہم اس عہد کے حالات کو پس منظر کے طور پر سامنے رکھ کر بیانات کا مطالعہ کریں تو ہم اس کے نقطہ نظر کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اس نے مورخ کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے سچائی اور صدق بیانی پر بہت

Marfat.com

بہت زور دیا ہے۔ اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ اچھے مورخ کی یہ سب سے پہلی صفت ہے کہ وہ واقعات پیش کرنے میں صدق بیانی اور دیانت داری کے راستے سے ہٹے۔ تاریخ فیروز شاہی کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ برنی ان مورخوں میں نہیں ہے۔ جو اپنے فرائض صرف واقعات کو صحیح طریقہ پر پیش کرنے تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ ان واقعات اور مسائل پر تنقید ضروری سمجھتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو اہم شخصیتوں کے کردار اور ان کے خصائل پر تنقید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اس کی کتاب نے ایک خاص حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ہم اس کی ہر تنقید سے اتفاق کریں، لیکن اس کے بعض بیانات یقیناً قابلِ تسلیم ہیں۔ برنی ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ معاشرتی نقطۂ نظر سے اس کی ہمدردیاں اعلیٰ طبقہ کے اشراف کے ساتھ تھیں اس لئے لازمی طور پر اس کے تنقیدی بیانات میں ہم کو اس کے اپنے تصورات کی جھلک نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ صاحب نظر ہے اور یہ کہ اس کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے وہ واقعات کی صحیح تصویر پیش کرنے میں یقیناً کامیاب ہے وہ شیخ نظام الدین اولیاء سے بیعت تھا۔ اس لئے علما اور مشائخ کے اس طبقہ سے بھی اس کو ملنے کا موقع ملتا تھا۔ جو دربار سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنی علمی قابلیت فطری صلاحیت اپنے تعلقات اور ذاتی حیثیت کی بنا پر برنی کو یہ موقع حاصل تھا۔ کہ اس دور کی مستند اور جامع تاریخ مرتب کرے۔ اس سے پورا فائدہ اٹھائے تاریخ فیروز شاہی کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے سر سید احمد خان نے اس کو ترتیب دیا ہے یہ کتاب سلطنت دہلی کی تاریخ کے لئے ہمیشہ بہت ضروری ماخذ کا کام دیتی رہے گی۔

برنی نے کئی اور رسالے لکھے ہیں۔ ان میں فتویٰ جہانداری اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں سیاسیات کے موضوع پر بہت کم کتابیں لکھی گئیں ہیں۔

امیر خسرو

امیر خسرو کی ذات مجموعۂ کمالات تھی۔ وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے اور ایک نہایت مستند مورخ بھی انہوں نے ایک صوفی شیخ کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی اور فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی کس حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت ہوئی شاعری میں ان کا یہ مرتبہ ہے کہ آج بھی ان کا کلام خاص طور پر ان کی غزلیں وہی اثر پیدا کرتی ہیں۔ جو چودھویں صدی میں کرتی تھیں صوفیاء کی مجالس سماع اور فضلاء کی ادبی نشستوں میں آج بھی ان کے کلام کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے خسرو کی طبیعت شروع ہی سے شاعری کی طرف مائل تھی۔ وہ اس وقت بھی اچھے شعر کہتے تھے۔ تذکرہ

Marfat.com

نگاروں نے متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بچپن میں بھی بلند پایہ شعر کہتے تھے۔ ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر اٹھ سال تھی۔ اس وقت سے وہ اپنے نانا عماد الملک کی سرپرستی میں رہے وہ نہایت بااثر اور نیک طبیعت امیر تھے۔ ایلتمش سے بلبن کے عہد تک عرض ممالک کے عہدے فائز رہے امیر خسرو کی تصانیف اور کلام سے ہم اندازہ لگا سکتے۔ انہوں نے اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم پائی تھی۔ وہ لکھتے تو صرف فارسی اور ہندی میں تھے لیکن ان کی عربی دانی کی شہادت ہم کو ان کی تصانیف میں ملتی ہے۔ مثلاً اعجاز خسروی میں۔ امیر خسرو کے حالات اور شاعری سے متعلق حیات خسرو سید صباح الدین کی بزم مملوکیہ اور ڈاکٹر وحید مرزا کے مقالہ انگریزی میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی قدیم اور جدید تصانیف میں ان کا ذکر موجود ہے اقبال صلاح الدین ایم اے نے امیر خسرو پر جامع کام کیا ہے۔ جس کو ادارہ پیکجز لمیٹڈ تین جلدوں میں شائع کر رہا ہے۔ جلد اوّل منظر عام پر آ چکی ہے۔ جس کو ادبا اور مورخین نے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ اور اس پر نہایت اعلیٰ تبصرے ہو چکے ہیں۔ ان تبصروں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس وقت تک امیر خسرو پر جو کام ہوا ہے۔ ان سب میں یہ کتاب ایک ممتاز مقام رکھتی ہے یہاں ہم نہایت مختصر الفاظ میں ان کی تاریخی تصانیف کا ذکر کریں گے۔ انہوں نے کئی دیوان مرتب کئے۔ جس میں زندگی کے مختلف ادوار کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نظامی کے مشہور خمسہ کے طرز پر پانچ مثنویاں لکھیں۔ جن کو سلطان علاؤالدین کے نام سے معنون کیا ہے۔ ان میں ہم کو اس دور کی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق معلومات ملتی ہیں لیکن تاریخ کے طالب علم کے لئے ان کی پانچ مثنویاں بہت مفید ہیں ان کا سلسلہ کیقباد کے زمانہ سے شروع ہوا اور غیاث الدین تغلق کے عہد تک پہنچتا ہے بغرا خان اور کیقباد کی تاریخی ملاقات کا حال ان کی مثنوی قرآن السعدین میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جلال الدین خلجی کے عہد کا حال مفتاح الفتوح میں ملتا ہے۔ علاؤالدین کے بیٹے خضر خان اور گجرات کے راجہ کی لڑکی دیول دیوی کی محبت کی داستان، مثنوی خضر خاں و دولرانی میں نہایت دلکش انداز میں لکھی ہے۔ مبارک شاہ خلجی کے عہد میں نہ سپہر لکھی۔ آخری مثنوی تغلق نامہ میں مبارک شاہ کا قتل۔ خسرو خاں کی شکست اور غیاث الدین کی تخت نشینی کے واقعات ہیں۔ یہ پانچوں تاریخی مثنویاں تاریخ کے طلبا کے لئے نہایت دلچسپ اور مفید ہیں امیر خسرو کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ شاعری کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اور تاریخی واقعات کی صداقت کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے عام طور پر شاعر تاریخی واقعات لکھتے وقت شعر گوئی کے جذبہ میں بہ جاتا ہے۔ اور اپنے بیانات میں مبالغہ اور قصہ گوئی سے کام لیتا ہے ایسے شاعروں کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ کہ ان کے کلام کو تاریخ کا مرتبہ دیا جا سکے۔ امیر خسرو ان ہی شعراء میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے واقعات کو واقعات ہی کی طرح پیش کیا ہے۔ بے شک بعض اوقات حکمرانوں اور امیروں

Marfat.com

وغیرہ کی تعریف میں مبالغہ آمیز اشعار ملیں گے۔ لیکن اس دور میں شاعروں کے کلام نے ایک طرز کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ان الفاظ کی حقیقت میں کوئی معنی نہیں ہوتے تھے اس سے کوئی شاعر مستثنیٰ نظر نہیں آتا۔ امیر خسرو کا کلام (نظم میں) اتنا زیادہ اور اس قدر بلند پایہ ہے کہ یہ شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ وہ نظم اتنی ہی روانی سے لکھتے جیسے کوئی اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ لیکن ان کو قدرت نثر پر بھی تھی نثر میں ان کی تین کتابیں موجود ہیں اور تینوں ہی تاریخ کے طلبا کے لئے سب کارآمد ہیں خزائن الفتوح میں علاؤالدین خلجی کے عہد کی دکنی فتوحات کا مفصل ذکر ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ جو ہم کو اس کتاب میں ملتا ہے وہ اور کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ ادب کے لحاظ سے بھی یہ کتاب بلند پایہ ہے۔ اس میں ایک مخصوص صنعت کا لحاظ رکھا گیا ہے عنوان میں جیز کا ذکر ہے اس کے تحت سارے بیان میں اس کی رعایت سے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس نے عبارت کو قدرے مشکل بنا ہے لیکن مصنف کا کمال ظاہر ہے علاوہ ازیں واقعات کی صحت اور تفصیل کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے دوسری کتاب اعجاز خسروی صنائع و بدائع پر ہے مگر اس میں بھی بعض اصل دستاویزات موجود ہیں ان کی تیسری تصنیف افضل الفوائد ہے۔ ان کے شیخ خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں جو امیر حسن سنجری کی تالیف فوائد الفواد کے طرز پر جمع اور مرتب کئے گئے ہیں۔ بعض مورخوں نے ان کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے۔

خسرو ہندی کے بھی بڑے شاعر تھے۔ ان کی شہادت ہم کو ان کے کلام اور تصانیف میں ملتی ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سے ہندی کے گیت وغیرہ ان سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ اپنے لقب طوطی ہند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

چو من طوطی ہندم راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

Marfat.com

نجم الدین حسن بن علاء

سنجری ۱۲۵۳ - ۱۳۳۵ء

امیر خسرو کے دوست اور پیر بھائی حسن سنجری بھی اسی دور کے جلیل القدر شعراء مانے جاتے ہیں. برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ ان دونوں کی ملاقات اسی نے کرائی تھی. بہرحال کچھ مدت کے بعد یہ تینوں اہل قلم ایک دوسرے سے اسقدر مانوس ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا۔ برنی کے بیان کے مطابق حسن کی تالیفات نظم و نثر بسیار است، لیکن اب تک ان کا دیوان اور نثر میں فوائد الفواد مل سکتے ہیں. حسن کی غزلیں بہت بلند پایہ اور مقبول تھیں. چنانچہ بقول برنی وہ سعدی ہند کہلاتے تھے. حسن نے اپنے شیخ کے ملفوظات کا جو مجموعہ (فوائد الفواد) تیار کیا. وہ اس وقت سے آج تک لوگوں کے زیر مطالعہ رہا ہے. آج بھی تاریخ کے طلباء کے لیے وہ ایک اہم ماخذ ہے. محمد بن تغلق کے منصوبہ کے تحت دلی کے جو مشائخ دیوگیری بھیجے گئے تھے. ان میں حسن بھی تھے. وہ اپنی وفات تک وہیں رہے. برنی کے علاوہ محمد بن تغلق کے عہد کے دو اور مورخ قابل ذکر ہیں. عرب سیاح ابن بطوطہ اور فتوح السلاطین کا مصنف ان دونوں کا ذکر اسی سلطان کے سلسلہ میں کیا گیا ہے. ایک اور اچھا ماخذ اس عہد کے لیے شہاب الدین العمری کی عربی تصنیف مسالک الابصار فی ممالک الامصار کا وہ حصہ ہے. جس میں برصغیر کا ذکر ہے. یہ کتاب نہایت مفید ذریعہ معلومات ہے. اس میں ہم کو بعض بیانات ایسے ملتے ہیں جو دوسری تاریخوں میں موجود نہیں.

فیروز شاہ کے عہد کے لیے سب سے زیادہ مفصل تاریخ شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی ہے. اس کا فارسی متن اور اردو ترجمہ شائع ہو چکے ہیں. سیرت فیروز شاہی کے مصنف کا نام معلوم نہیں لیکن اس کے دور کے بہترین ماخذ میں اس کا شمار کیا جاتا ہے. یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی. خود فیروز شاہ کا مختصر رسالہ فتوحات فیروز شاہی بھی معلومات کے لحاظ سے مفید ہے.

پندرھویں صدی میں یحییٰ بن احمد نے تاریخ مبارک شاہی لکھی ابتدائی دور کے اس میں بہت مختصر حالات ہیں. لیکن یہ ایک مستند کتاب ہے. خاص طور پر یہ اس لئے مفید ہے کہ اس میں اکثر واقعات کی تاریخیں مل جاتی ہیں. لودھیوں کے عہد میں خود تو کوئی تاریخ مرتب نہیں ہوئی. لیکن ان کے تفصیلی حالات پر مغلوں کے ابتدائی دور میں کتابیں لکھی گئیں. سلاطین دہلی کے عہد میں شاعری اور تاریخ کے علاوہ دوسرے علوم نے بھی

Marfat.com

ترقی کی۔ فقہ اور حدیث ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں ان علوم کے متعلق زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں لیکن امام حسنؒ صنعانی (متوفی ۱۲۵۲ھ) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں مشارق الانوار سب سے زیادہ مشہور ہے۔

سنسکرت اور ہندی

سنسکرت میں تاریخی ادب تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ حقیقتاً صرف ایک کتاب یعنی راج ترنگنی قابلِ ذکر ہے۔ یہ کشمیر کی تاریخ ہے۔ بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں لیکن پھر بھی مفید ہے۔ دوسرے مضامین پر اس زبان میں ضرور کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ہندی میں پرتھوی راج کے درباری شاعر چاند بردائی کی طویل نظم پرتھوی راج راسا قابلِ ذکر ہے۔ "یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس کے بہت سے حصے بعد میں لکھے گئے ہیں۔" اس نظم میں جس کے پانچ ہزار اشعار اس وقت لکھے جاچکے ہیں۔ جب کہ اس کا مفروضہ مصنف چاند بردائی شہاب الدین کے خلاف جنگ میں مارا گیا۔ بہادری کے ایسے ولولہ انگیز واقعات بیان کئے گئے ہیں کہ اس کو راجپوتوں کی اس نہ مرنے والی ہمت کی یادگار کہہ سکتے ہیں۔ جو ہتھیار ڈالنے پر جوہر کو ترجیح دیتی تھی۔"[1]

اردو

قرونِ وسطیٰ میں برصغیر کی تہذیب و تمدن کی ایک نمایاں خصوصیت اور کارنامہ اردو کا وجود میں آنا اور اس کا ابتدائی نشوونما ہے۔ مسلمانوں کی دینی زبان تو عربی تھی۔ لیکن آپس کی گفتگو اور تصنیف و تالیف کا کام زیادہ تر فارسی میں ہوتا تھا۔ اس کی مقبولیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ سلاطین دہلی باوجودیکہ ان میں سے اکثر ترکی النسل تھے۔ فارسی ہی بولتے تھے۔ اور یہی زبان ان کی دفتری زبان تھی۔ یہ زبانیں یہاں کی بولیوں پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ بالآخر ان کے امتزاج سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جس کو اردو کا نام ملا۔ اردو کے معنی لشکر کے ہیں۔ اس بنا پر بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کہ اس کے ابتدائی نشوونما میں لشکریوں کا آپس میں ملنا جلنا ایک بڑا سبب ہوا ہوگا۔ لشکریوں کے علاوہ صوفیہ نے بھی اس سلسلہ میں کچھ کام کیا۔ یہاں کے عوام سے روابط بڑھانے کی غرض سے ان لوگوں نے یہاں کی بولیوں میں گفتگو کرنے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ان کی بعض کتابوں اور تذکروں میں ہم کو ایسے حوالے ملتے ہیں جو اس کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے

---

[1] ایچ ایچ گوون اے ہسٹری آف انڈین لٹریچر ص ۴۷۵

Marfat.com

ہیں۔ بھگتی تحریک کے مشہور رہنما کبیر کا کلام اس سلسلہ میں اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ دوہا قابل غور ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت یہ زبان کس قدر صاف ہو چکی تھی

کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمن کو بوجھ کیا

لودھیوں کے عہد میں سکندر لودھی کی ہمت افزائی کی وجہ سے ہندوؤں میں فارسی علوم کا رواج بہت عام ہو گیا اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد سے اس زبان نے تیز رفتاری سے ترقی کی۔ سکندر کے بیٹے ابراہیم لودھی شکست اور سلطان کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ داؤدی کا مصنف لکھتا ہے۔ "سر ش (سلطان ابراہیم) بریدہ، پیش بابر بادشاہ اورند شخصے دران معرکہ حاضر بود۔ این شعر بر زبان راند

نوسی اوپر تھا تبیا	پانی پت بھارت دلیا
اٹھیں رجب سکروار	بابر جیتا ابراہیم ہارا

(یعنی نو سو سے بتیس اوپر تھے (کہ) پانی پت بھارت دیس (میں) اٹھو رجب جمعہ کو بابر جیتا (اور) ابراہیم (ہارا)

اردو کی نشو و نما کا مختلف کتابوں میں مفصل بیان موجود ہے۔ اس لیے یہاں تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا۔

سوال :۔ سلاطین دہلی کے عہد میں فن تعمیر کے متعلق مفصل بحث کیجئے۔

جواب :۔ اسلام نے مصوری کی ہمت افزائی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی اس فن نے ترقی کی وہاں فنکاروں نے اپنے کمالات کا بہترین اظہار مذہبی تصاویر میں کیا۔ جلد ہی فن کی حد سے گذر کر لوگ تصویر پرستی کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔ جو اسلامی توحید کے تصور کے خلاف تھی ابتدائی دور میں اس پر بہت سختی سے عمل کیا۔ یہی سبب ہے کہ ہم کو اسلامی دنیا میں فن سنگتراشی ہی نہیں بلکہ نقاشی اور مصوری بھی نہیں ملتے۔ جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے۔ چھوٹے چھوٹے فنون کو چھوڑ کر مسلمانوں نے خطاطی اور تعمیر پر بہت توجہ دی۔ اور ان میں بے حد ترقی کی۔ ان کے جو عمدہ نمونے موجود ہیں۔ وہ آج بھی انتہائی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد مصوری و نقاشی کی مخالفت میں کمی ہونے لگی۔ اس فن نے ایران میں اور اس کے بعد دوسرے اسلامی ممالک میں بہت ترقی کی۔ سلطنت دہلی کے علاقوں میں معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کا رواج تو شروع ہو گیا تھا۔ مگر وہ زیادہ عام نہیں ہو سکا یوں تو بعض بنو امیہ کے سکول پر بھی تصاویر تھیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مصوری

ا۔ نقد ارمغان۔ فرزند شاہد، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۱۹۵۴ء صلا۔

Marfat.com

کی ہمت افزائی اسی وقت شروع ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ اہم وہ بیان ہے جو ہم کو سلطان محمود کے ایک درباری شاعر کے کلام میں ملتا ہے۔ اور جس میں اس نے سلطان مذکور کے تصویر خانہ ———— (PICTURE GALLERY) کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس میں دیواروں پر تصاویر تھیں۔ اور بیچ میں خود سلطان محمود کی بھی ایک تصویر تھی۔ دہلی کی بعض عمارات پر بھی تصویریں تھیں اور لوگ برتنوں اور کپڑوں پر بھی تصاویر بناتے تھے۔ یہ شہادت ہم کو فیروز شاہ کے ایک بیان میں ملتی ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ یہ سب غیر شرعی ہیں۔ اس لیے اس نے ان کی ممانعت کر دی اور دیواروں کی تصویریں مٹا دینے کا حکم دیا۔ تصویر کشی کی ممانعت کا نتیجہ یہی تھا کہ مسلم عمارتوں کی تزئین کے لیے ماہرین فن کتابت اور بیل بوٹے استعمال کرتے تھے۔ اس طریقۂ تزئین نے مسلمانوں میں بہت رواج پایا اور اس میں انہوں نے نمایاں ترقی کی۔ کتبوں میں فنی کمال کے علاوہ تاریخی معلومات بھی محفوظ ہو جاتی ہیں۔ بہر حال ابتدائی دور میں سنگ تراشی اور مصوری کا کمال ہم کو عمارتوں کے کتبوں اور پھول پتیوں ہی میں ملتا ہے۔

فن تعمیر

فن تعمیر میں مسلمانوں نے بہت جلد ترقی کرنا شروع کر دی تھی۔ بنو امیہ کے عہد کی عمارتیں آج بھی اس فن کے اعلیٰ نمونے کہی جاتی ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب سلطان محمود نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ تو اسلام کا اقتدار ایشیا، افریقہ، یورپ، کے متعدد علاقوں میں قائم ہو چکا تھا ان مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں نے بہت بڑی تعداد میں اور اعلیٰ پیمانہ پر عمارتیں بنائی تھیں۔ اور اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات اور روایات مستحکم ہو چکی تھیں۔ سلطان کی فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ اس کا دارالحکومت اپنی عمارات کے لحاظ سے دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ علاؤالدین جہاں سوز نے اس خوبصورت شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا اور ان شاندار تعمیرات کے کھنڈر بھی باقی نہیں رہے۔ بہر حال سلطنت دہلی کے قیام کے بعد فاتحین نے تعمیرات کا سلسلہ جلد ہی شروع کر دیا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ اس میں نمایاں ترقی ہوئی۔ یہ ظاہر تھا کہ اسلامی فن تعمیر جس علاقہ میں پہنچتا تھا۔ وہاں کی کچھ خصوصیات کو وہ قبول کر لیتا تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا۔ کہ مسلمانوں کی عمارتوں میں کام کرنے والے معمار اور کاریگر زیادہ تر مقامی لوگ ہی ہوتے تھے۔ اور ان کی خصوصیات اور روایات کا کچھ نہ کچھ حصہ ان کی تعمیرات میں ضرور آ جاتا تھا۔ برصغیر میں بھی یہی حالت پیش آئی۔ اور اسلامی فن تعمیر نے اپنی بنیاد ی

Marfat.com

خصوصیات قائم رکھتے ہوئے یہاں کے کچھ اثرات قبول کئے۔ اسی بناء پر بعض مورخین نے یہاں کی عمارتوں کے لیے ایک نئی اصطلاح انڈو مسلم فن تعمیر (ANDO MUSLIM ARCHILECHTURE) کے نام سے ایجاد کی ہے۔ اگر ہم فن تعمیر کی ترقی بغور مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس استدلال میں زیادہ جان نہیں۔ کیونکہ برصغیر کی اسلامی عمارات دراصل اسلامی فن تعمیر ہی کے نمونے کاریگروں وغیرہ کی وجہ سے کچھ عرصہ تک ان میں مقامی روایات کا اثر آتا رہا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ یہ اثر کم ہوتا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ فن کی علیحدہ ایک قسم نہیں بہرحال اکثر مورخوں نے اصطلاح کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور وہ اس کا بار بار استعمال کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں اس کو ہند پاکستان میں اسلامی فن تعمیر کہنا زیادہ صحیح ہوگا یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فن تعمیر میں زیادہ بنیادی فرق ہیں۔ اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات میں گنبد۔ محراب، محراب دار چھت نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ہندو فن میں ستون اور کڑیوں کی چھت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوؤں کی عمارتوں میں تزئین کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ اور مورتیاں وغیرہ اس کی زینت کو بہت کچھ بڑھا دیتی تھیں۔ برخلاف اس کے مسلم عمارتوں میں خطاطی اور پھول پتیاں زینت کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ ایک اور نمایاں فرق یہ تھا کہ اسلامی عمارتیں کھلی ہوئی، کشادہ اور صحن دار ہوتی تھیں۔ ہندو عمارتیں بالخصوص مندر گھرے ہوئے اور تنگ ہوتے تھے۔ اسلامی عمارتوں میں روشنی اور ہوا کا کافی اہتمام ہوتا تھا۔ ہندو عمارتوں میں بہت کم ان میں سے بعض خصوصیات متضاد تھیں۔ اور ان کا امتزاج ایک عمارت میں بہت زیادہ آسان نہ تھا۔ لیکن کچھ نہ کچھ اثر جیسا کہ ہم دیکھیں گے ہندو فن کا ابتدائی عمارتوں میں یقینی طور پر موجود ہے۔

ابتدائی دور کی عمارتیں

مسجد قبتہ الاسلام۔ دہلی فتح ہونے کے بعد سب سے پہلی مشہور عمارت جو وہاں بنائی گئی مسجد قبتہ الاسلام تھی۔ جس کو بعض کتابوں میں قوۃ الاسلام کہا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کی تعمیر میں ہندو معماروں نے کام کیا اور لڑائی کے دوران جو عمارتیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں ان ہی کا ملبہ کام میں لایا گیا اس کی شہادت ہم کو آج بھی اس مسجد کے آثار میں ملتی ہے۔ مسلم فاتحین یہ چاہتے تھے کہ اسلامی فن کی خصوصیات اس عمارت میں موجود ہوں یعنی گنبد اور محرابوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ مگر یہاں کے معمار صحیح گنبد اور صحیح محراب سے واقف نہ تھے جہاں تک نقشہ کا تعلق ہے اس مسجد کا خاکہ وہی تھا جو عام طور پر مسجدوں کا ہوتا ہے۔ گرم ممالک میں مسجد میں صحن ضروری ہے اس لیے چاروں طرف دالان بناتے

Marfat.com

ہیں۔ اور کعبہ کی جانب (یہاں مغرب کی طرف) کے دالان زیادہ کشادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں نماز زیادہ تر ادا کی جاتی ہے۔ ان دالانوں میں سے اکثر کی چھتیں سطح تھیں اور پتھر کی بڑی بڑی سلیوں سے ڈھکی گئی تھیں۔ لیکن کچھ میں گنبد نما چھت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے ایک دوسرے پر آگے کو نکلتے ہوئے اس طرح رکھے گئے ہیں۔ کہ آخر میں اوپر کے ٹکڑے مل گئے اور چھت تیار ہو گئی۔ یہ طریقہ جس کو کاربیلنگ (CORBELLING) کہتے ہیں۔ اسلامی فن کی خصوصیات میں تھیں۔ لیکن اس سے تیار کی ہوئی چھت اگرچہ گنبد ہی جیسی معلوم ہوتی ہے مگر اس کو گنبد نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں گردش بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ گنبد دیوار کی سطح سے گاؤدم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مسجد قبۃ الاسلام کی نمایاں خصوصیت سامنے کی دیوار ہے اس کی شاندار اور بلند محرابیں بھی کاربیلنگ ہی کے طریقہ پر تیار کی گئی ہیں دیوار کی محرابوں کے متعلق بعض ماہرین فن کی رائے ہے کہ بنانے والوں کو ان کا خیال بعد میں آیا۔ کیوں کہ ان کی بلندی اور دالانوں کے ستونوں کے درمیان فاصلہ تناسب نہیں۔ ستونوں وغیرہ میں ملبہ کے جو پتھر استعمال کئے گئے ہیں وہ ہندو عمارتوں کے ہیں۔ لیکن ان کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ عمارت کی تزئین قرآن کی آیتوں اور پھول پتیوں سے کی گئی ہے۔ مسجد قبۃ الاسلام کی توسیع التمش کے عہد میں ہوئی سامنے کی دیوار میں محرابوں کی تعداد بڑھائی گئی۔ اور قرآنی آیات بھی کندہ کی گئیں۔

قطب مینار

مسجد قبۃ الاسلام کے قریب ہی التمش نے وہ بلند مینار مکمل کیا جو ایبک نے شروع کیا تھا۔ اور اس عہد کے مشہور بزرگ قطب الدین بختیار کاکی کے نام پر یہ نام رکھا ابتداء میں اس مینار میں چار منزلیں تھیں لیکن گرنے سے اس کو صدمہ پہنچا۔ اور مرمت کی ضرورت ہوئی۔ سلطان فیروز شاہ نے مرمت کرواتے وقت چوتھی منزل کی بجائے دو چھوٹی منزلیں بنوادیں اور ان پر سنگ مرمر بھی لگوایا۔ مینار کے چاروں طرف کتبے اور پھول پتیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر منزل کے ختم ہونے پر ہر طرف (بالکنیاں) ہیں۔ ان کے نیچے کاربیلنگ ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا۔ کہ کبھی کبھی متعصب مورخین اس کے متعلق مضامین لکھتے ہیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ مینا ہندوؤں نے بنوایا۔ لیکن یہ ایسا بے بنیاد دعویٰ ہے۔ جس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں فن تعمیر کے مغربی ماہرین کی تصانیف میں سے اکثر میں اس مسئلہ پر بحث موجود ہے۔ ان میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس کو کسی نہج سے ہندو عمارت نہیں کہا جا سکتا۔

التمش کے ابتدائی دور میں ایک اور مسجد جو قبۃ الاسلام کے طرز پر بنائی گئی ہے۔ اجمیر میں ہے۔

Marfat.com

اور ڈھائی دن کا جھونپڑا کہلاتی ہے۔ زینت کے لحاظ سے اس کو بہتر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک شاندار ہونے کا تعلق ہے یہ قبۃ الاسلام سے بہت پیچھے ہے۔

مقبروں میں جو تیرھویں صدی میں تعمیر ہوتے التمش اور اس کے بیٹے ناصرالدین کے مقبرے قابل ذکر ہیں۔ ناصرالدین کی وفات لکھنوتی میں ہوئی لیکن ان کی نعش کو دہلی میں لاکر دفن کیا گیا۔ یہ درحقیقت مسجد ہے کھلا ہوا صحن ہے۔ جس کے مشرقی ومغربی جانب دالان ہیں۔ اور شمال وجنوب کی جانب محراب دار دیواریں ہیں۔ اور چاروں کونوں پر برجیاں ہیں۔ ان پر چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں۔ صحن میں ایک طرف کو قبر ہے۔ جس پر سطح چھت ہے مقامی طور پر یہ عمارت سلطان غازی کا مقبرہ کہلاتی ہے۔ صدر دروازہ اور مسجد کی صدر محراب پر سامنے کی طرف سنگ مرمر پر نسخ اور کوفی خط میں کتبے ہیں۔

التمش کا مقبرہ ایک مربع نما (SQUARE) عمارت ہے۔ شمال جنوب اور مشرق کی جانب دیواروں میں محراب دار دروازے ہیں۔ مغربی جانب تین بند محرابیں ہیں۔ اس میں اندر کی طرف سرخ پتھر ہے جس پر نسخ اور کوفی خط میں قرآن کی آئتیں کندہ ہیں۔ صدر محراب اور اس پر بنی ہوئی قبر سنگ مرمر کی ہیں۔ اس وقت تو مقبرہ پر چھت نہیں ہے۔ لیکن ہشت پہلو والی محرابیں اور ان پر کاربیلنگ کی موجودگی اس امر کی شہادت ہے کہ اس پر ابتداء میں گنبد والی چھت تھی۔

خلجی عہد

سلطان علاؤالدین خلجی کا عہد جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ تہذیب وتمدن کی ترقی کے لحاظ سے تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ جہاں تک فن تعمیر کا تعلق ہے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی فن کی روایات اب مستقل حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔ گنبد اور محراب اپنی مکمل شکل اور حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ اس دور کی سب سے زیادہ مشہور اور نمایاں عمارتیں علائی دروازہ اور شیخ نظام الدین اولیا کی مسجد جماعت خانہ ہیں اول الذکر درحقیقت مسجد قبۃ الاسلام کا جنوبی دروازہ ہے۔ علاؤالدین نے بھی اس مسجد کی توسیع کرائی تھی۔ اور اس سلسلہ میں یہ دروازہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ دروازہ کی عمارت مربع نما دیواروں پر مشتمل گھیرا ہے۔ جس میں محرابیں (ACHWAYS) ہیں۔ ان ہی پر اس کا گنبد قائم ہے۔ باہر کی طرف سے یہ گنبد دیواروں پر ہی قائم ہے۔ جیسے کہ قبۃ الاسلام کے گنبد ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر اور شکل میں۔ ان سے مختلف ہے۔ یہ نیم دائرہ کی شکل کا گنبد ہے اور اس کی تعمیر اسی اصول اور بنیاد پر کی گئی جیسی کہ گنبد کی ہونی چاہئے علائی دروازہ کی عمارت سرخ پتھر کی ہے۔ جس میں سنگ مرمر بھی جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ چاروں طرف بلند کھلی ہوئی محرابیں ہیں۔ اور ہر محراب کے دونوں طرف محراب دار کھڑکیاں ہیں جن میں جالی

Marfat.com

لگائی گئی ہے۔ پوری عمارت کی دیواروں پر اندر اور باہر دونوں طرف تزئین کی غرض سے قرآن کی آئتیں اور پھول پتیاں وغیرہ بنائی گئی ہیں۔

جماعت خانہ

شیخ نظام الدین اولیاء کی مسجد (جماعت خانہ) کے تین حصے ہیں۔ صدر حصہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ علاؤ الدین کے بڑے بیٹے خضر خان نے شیخ کے مزار کے لیے بنوایا تھا۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا کہ وہ ان کو اس میں دفن نہ کیا جائے۔ وہ جماعت خانہ کی طرح استعمال ہوتا رہا۔ بعد میں محمد بن تغلق نے ہر دو جانب (شمال و جنوب) دو در اور کمرے بنوا کر اس کو مسجد بنا دیا۔ صدر کمرہ سنگ مرمر کا ہے۔ اور اس پر ایک بڑا گول گنبد ہے جو ڈاٹوں پر قائم ہے دونوں طرف کے کمروں پر بھی گنبد ہیں۔ اس میں کئی خصوصیات مثلاً محرابیں جالی اور کھڑکیاں وغیرہ ایسی ہیں جو علائی دروازہ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ صرف مشرق کی جانب سامنے کی دیوار پر خوشخطی کے نمونے تزئین کے لیے دیئے گئے ہیں اس عمارت کے گنبد قابل ذکر ہیں۔ یہ ایسے ڈھول نما گھیروں پر قائم ہیں جن میں دندانے بنے ہوئے ہیں۔ ڈرم جو بعد میں گنبد کی اہم اور مستقل خصوصیت بن گیا۔ پہلی مرتبہ اسی عمارت میں ملتا ہے۔ فن کے نقطہ نظر سے خلجی دور کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے۔

تغلقی عہد

تغلق عہد کی عمارتوں میں شان و شوکت اور تفصیلات کی وہ خوبیاں موجود نہیں جو خلجی عمارتوں میں ہم کو ملتی ہیں۔ ہاں ان کی مضبوطی بہت نمایاں ہے اور ان پر متانت کا رنگ غالب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تزئین عمارات کے تصور کے خلاف ردعمل شروع ہو گیا تھا۔ لیکن جہاں تک اسلامی فن کی خصوصیات کا تعلق ہے وہ برابر نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ برصغیر کا فن تعمیر اب اسلامی فن تعمیر ہو گیا تھا۔ اب آزادانہ طور پر استعمال ہونے لگا اور گنبدوں محرابوں اور ڈاٹ کی چھتوں کا رواج بھی عام ہو گیا۔ غیاث الدین تغلق کے مقبرہ کے علاوہ ساری عمارتیں معمولی پتھر کے ٹکڑوں اور کنکروں کی چونے کے مسالے میں بنی ہیں۔ اور اسی کا پلاسٹر ہے۔ ان میں تزئین بھی تقریباً مفقود ہے۔ سوائے تعزیہ کی شکل کے چوکھٹے جو دکھائی دیتے ہیں۔ تغلق کا مقبرہ سنگ سرخ کا ہے۔ اور اس کا گنبد سنگ مرمر کا۔ غیاث الدین کی بنائی ہوئی پہلی عمارت تغلق آباد کا قلعہ ہے۔ یہ اب بالکل کھنڈر ہو چکا ہے لیکن اس کی موٹی دیواریں جن میں تیر وغیرہ پھینکنے کے لیے روزن موجود ہیں۔ اور ان میں اب بھی دندانے بنے ہوئے ہیں۔ اب بھی دیکھنے والے پر مضبوط

Marfat.com

اور مستحکم ہونے کا تاثر چھوڑتی ہیں۔ دیواروں پر گاؤ دم پشتے بھی ان کی مضبوطی کو زیادہ کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ محمد بن تغلق کے محل کے کھنڈر جو اس نے اپنے بنوائے ہوئے دارالحکومت جہاں پناہ میں تعمیر کرایا تھا تغلقی کے دور کے محلات وغیرہ کی ایک مثالی عمارت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ محل ایک پہاڑی پر بنا تھا۔ اس کا بڑا ہال کئی دالانوں پر مشتمل تھا۔ جن میں محراب دروازے تھے۔ دالانوں کی چھتیں بھی محرابوں کے کونوں پر قائم ہیں۔ اس محل کے شمال اور جنوب کی طرف اور اس سے قریب ہی دوسری عمارتوں کے آثار موجود ہیں۔ جن میں قصر ہزار ستون بھی ہے۔ اس میں سلطان دربار کیا کرتا تھا۔ مقامی طور پر اس محل کو بجے منڈل کہا جاتا ہے۔ لیکن سرسید احمد خان نے آثار الصنادید میں اس کو بدیع منزل کہا ہے۔

بیگم پوری مسجد

بدیع منزل کے قریب ہی بیگم پوری مسجد ہے۔ یہ بھی غالباً محمد بن تغلق ہی کی بنوائی ہوئی جامع مسجد ہے اس میں ایک گیلری بھی ہے جس کو حجابی کہا جاتا تھا۔ اور سلطان کے استعمال کے لیے تھی جو کہ مسجد کے شمالی جانب ہے۔ یعنی محل کی طرف ہر مسجد کی طرح بیگم پوری مسجد کے بھی بیچ میں صحن ہے۔ اور چاروں طرف محراب دار دالان ہیں مغرب کی جانب ان دالانوں کی تین قطاریں تھیں۔ دالان کے ہر حصہ پر گنبد ہے اس طرح یہ گنبد بڑی تعداد میں ہیں۔ اور تغلقی دور کی عمارتوں کی یہ ایک خصوصیت بن گئی ہیں۔ نمازگاہ میں سامنے کی طرف ایک بلند اور گہری محراب ہے جس کے دونوں طرف گاؤ دم شکل کے چھوٹے بنارہیں۔ یہ خصوصیت ہم کو شروع ہی میں مسجد قبۃ الاسلام میں ملتی ہے۔ اس کے بعد اس کا رواج عام ہو گیا۔

فیروز شاہ کی عمارتیں

فیروز شاہ کو فن تعمیر سے بہت دلچسپی تھی وہ رفاہ عام کے کاموں کی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے متعدد قسم کی عمارات بڑی تعداد میں تیار کرائیں شہروں قصبوں، نہروں، پلوں اور مسجدوں کی تعمیر کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس کی بنوائی ہوئی اہم عمارتوں کا مختصر بیان ضروری ہے۔ اس کے عہد میں مسجد کے طرز تعمیر میں کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ کالی مسجد، سنجر مسجد، (شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی) اور کھڑکی مسجد کو غور سے دیکھا جائے تو یہ تبدیلیاں صاف طور پر نظر آئیں گی۔ کالی مسجد فیروز شاہ کے وزیر خان جہاں مقبول کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کے صحن کو چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دو محراب دار راستے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ ایک راستہ نمازگاہ کی صدر محراب سے مشرقی دروازے تک ہے

Marfat.com

اور دوسرا شمالی دروازہ سے جنوبی دروازے تک صحن کی یہ صلیب نما تقسیم صرف کھڑکی مسجد میں ہے دوسری مسجدوں میں یہ موجود نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس علاقہ کی گرم آب وہوا میں یہ طرز زیادہ آرام دہ نہیں ہے۔ بہرحال فن تعمیر کے لحاظ سے یہ مساجد دلچسپ عمارتیں ہیں۔

فیروز شاہ کی یونیورسٹی اور مقبرہ

فیروز شاہ کی سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ عمارتوں کا وہ سلسلہ ہے جو دہلی کے قریب مشہور تالاب حوض خاص کے کنارے پر آج بھی دیکھا جاسکتا ہے یہ تالاب علاؤالدین کے عہد میں بنا تھا۔ اور اسی کے نام پر حوض علائی کہلاتا تھا۔ بعد میں فیروز شاہ نے اس کی مرمت کرائی۔ اور اس کو حوض خاص کا نام دیا۔ فیروز شاہ کا مقبرہ جنوب مشرقی کونے پر واقع ہے۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں وہ خستہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی مرمت کرائی۔ یونیورسٹی کی عمارتیں اس مقبرہ کے شمال اور مغرب کی جانب واقع ہیں۔ اب وہ کافی ٹوٹ چکی ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر ان کی اصلی حالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حوض کے کنارے کی طرف یہ دو منزلہ ہیں۔ اور دوسری طرف ایک دا وپر کی منزل ہے جو سطح زمین پر واقع ہے۔ یعنی نیچے کی منزل حوض کی دیوار سے ملتی ہے۔ اس عمارت میں کہیں دو اور کہیں تین گہین محراب دار دالانوں کی ہیں۔ ان ہی میں گنبد کی چھت والے کمرے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہیں یہ قیاس کیا گیا ہے کہ نیچے کی منزل کے کمرے رہائش گاہوں کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اور اوپر کی عمارت جو دونوں طرف سے کھلی ہوئی ہے تعلیم کے لیے ہوگی۔ ان عمارتوں میں گنبد محراب اور ستونوں کا عمدہ امتزاج ہے آگے نکلی ہوئی کھڑکیوں نے خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔

سیّد اور لودھی عہد کی عمارتیں

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے۔ فیروز شاہ کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے زمانہ میں سلطنت کا دور انحطاط شروع ہوا۔ اور تیزی کے ساتھ اس کا وقار اور قوت کم ہوتے گئے۔ تغلق خاندان کے خاتمہ پر پہلے سید اور بعد میں لودھی سلاطین حکمرانی کرتے رہے۔ اس طرح سلطنت دہلی تغلق خاندان کے بعد بھی قائم رہی لیکن اس کا گیا ہوا وقار دوبارہ اس حد تک بحال نہ ہوا۔ جیسے تیرھویں یا چودھویں صدی میں تھا۔ زوال سلطنت کے نتیجہ میں متعدد علاقائی ریاستیں قائم ہوگئیں ان کے حکمرانوں کی سرپرستی میں فن تعمیر کے کئی علاقائی طرز بھی وجود میں آئے۔ اور بعض نے نمایاں ترقی کی۔ ان ریاستوں کی بعض

Marfat.com

عمارتوں کے ذکر سے ہم چاہتے ہیں کہ پندرھویں صدی میں فن تعمیر کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سید سلاطین کو جب دہلی کی حکمرانی ملی۔ تو اس کے وسائل بہت کم اور محدود ہو چکے تھے۔ لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان عمارتوں میں ہم کو تغلق خاندان کے عہد کی عمارتوں کے مقابلہ میں تزئینی اور نئی خصوصیات زیادہ ملتی ہیں۔ ان عمارتوں میں خوبصورتی بڑھانے کی غرض سے کونوں پر گلدستے یا کنگرے بنائے گئے ہیں۔ دیواروں پر گہری محرابیں بنا کر بھی اس میں اضافہ کیا گیا ہے۔

مقبرے

اس دور کی قابل ذکر عمارتوں میں زیادہ تر سلاطین اور امراء کے مقبرے ہیں ان ہی مقبروں میں بعض نمایاں خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ مربع نما نہیں کہ مثمن یا ہشت پہل عمارتیں ہیں ان کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان پر چھوٹی چھوٹی گنبد والی چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ مقبرے کی عمارت پر گنبد ہے وہ ایک بلند ڈرم پر قائم ہے اس کے جانب کھڑکیاں ہیں۔ یہ خصوصیت تفصیلی طور پر ہم کو سید خاندان کے مبارک شاہ اور محمد شاہ اور لودھی خاندان کے سلطان سکندر کے مقبروں میں ملتی ہیں۔ اس عہد کے دوسرے مقبرے مربع نما عمارتیں ہیں۔ لیکن ان کی تزئینی خصوصیات وہی ہیں۔ جو ہشت پہل عمارتوں کی ہیں۔

مساجد

اس دور کی بعض مسجدیں بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔ موٹھ کی مسجد اور بڑے گنبد والی مسجد دونوں سکندر لودھی کے عہد میں بنائی گئی ہیں۔ موٹھ کی مسجد بہت شاندار عمارت ہے اس کے تین حصے ہیں، اور ہر ایک پر گنبد ہے۔ یہ عمارت سنگ سرخ کی ہے۔ لیکن اس میں سنگ مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اور رنگین ٹائل بھی ہیں۔ چھت، کے پچھلے حصے میں چھوٹی برجیوں سے خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اندر کی طرف گنبد کے چاروں کونوں کی محرابیں خوابصورت ہیں۔ بڑے گنبد والی مسجد میں پلاسٹر کے کام کے ذریعہ تزئین کی کوشش کی گئی ہے۔ سلطنت دہلی کے عہد اور اس کی سرپرستی میں اسلامی فن تعمیر نے نمایاں ترقی کی اور اس کی خصوصیات اور روایات مستقل خطوط پر قائم ہو گئیں دور انتشار میں جب حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور نئی علاقائی ریاستیں وجود میں آئیں۔ تو ان میں بھی فن تعمیر کی طرف سے حکمران غافل نہیں رہے چنانچہ ہر ریاست میں ایک نیا طرز تعمیر وجود میں آگیا اور ترقی کرتا رہا۔ ان مختلف دبستانوں کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اسلامی فن کی بنیادی خصوصیات اسی حد تک نمایاں ہیں۔ جیسی کہ دہلی کی عمارتوں میں لیکن بعض علاقائی روایات کے اثر سے جو لازمی تھا

Marfat.com

تفصیلات میں کچھ فرق نظر آئے گا۔ ان علاقائی دبستانوں کی تفصیل ذکر یہاں ممکن نہیں۔

سوال :۔ مملوک سلاطین کے دورِ حکومت پر تفصیلی بحث کیجئے۔

جواب :۔ مملوک سلاطین کے خاتمہ پر دہلی سلطنت کے سلاطین کے سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔ جن کا آغاز سلطان شہاب الدین غوری سے ہوا تھا کہ اس کے غلام در غلام تاجدار بن کر تخت نشین ہوتے گئے۔ اس کے ساتھ سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے ہاتھوں سے ہندوستان کو زیرِ نگیں کرنے کی جو مہم شروع ہوئی تھی وہ بھی اس دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے محرکات

غزنوی اور غوری کشور کشائی کے

ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے محرکات کیا تھے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے عام طریقہ سے محمود کی بت شکنی کے جذبہ کو شہرت دی گئی ہے۔ مگر یہ تمام تر یورپ کے مورخین کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ان نومسلم ترکوں میں اس قسم کے کسی جذبہ کے بجائے دراصل اس زمانہ کی سماجی زندگی کے وہ مطالبے تھے جو بلندی اور نام آوری حاصل کرنے کے لیے خصوصی فوجی طاقتیں مہیا کرکے سپہ سالار ایک ملک سے دوسرے ملک میں جایا کرتے تھے۔ ہندوستان کی دولت کی شہرت تھی۔ اس میں بھی ایک خاص قسم کی کشش موجود تھی۔ ان قبائل میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بڑے جرگوں کے ساتھ نکل جاتے تھے۔ اور جہاں سرسبزی نظر آتی تھی۔ وہاں ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ محمود نے ہندوستان کو خاص طور پر رہنے کے لیے پسند کیا تھا لیکن وہ یہاں اقامت۔ اختیار نہ کرسکا (سلاطین دہلی کے زمانہ میں جن حکمرانوں کے ہاتھوں میں تلوار تھی کہ انہوں نے ہندوستان کے پرانے رہنے والوں کو تہہ کرنے کا کبھی قصد نہیں کیا۔ یہاں انہوں نے قانونی اسلحہ جاری کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ نہ مسلمانوں کو عام اجازت تھی کہ وہ ہتھیا بند رہیں۔ اور اپنی مرضی کے مطابق جرگے تیار کریں۔ ان کی سماجی، معاشرتی و اپنی زندگی سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ انہیں ہر قسم کی پوری آزادی حاصل تھی۔ انہیں اپنی اقتصادی و معاشی ترقی حاصل کرنے کے پورے مواقع دیئے گئے تھے اور اسی زمانہ میں وہ حکومت کے مستقبل سے بھی کہیں کہیں وابستہ ہونے لگے تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی حیثیت

ورنہ ... ... سے پہچانا جاتا ہے اگر

Marfat.com

ہندوستان پر محمد تغلق کی کوئی دینی جذبہ کارفرما ہوتا وہ یہاں کی سلطنت کی بنیاد اسلامی اصول و شرائع پر قائم کرتے بعض نے اس سلطنت کو خالص "اسلامی سلطنت" لکھا ہے۔ جس کی بنیاد شرعی احکام پر تھی۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ عملی طور پر دراصل یہ اسلامی سلطنت نہ تھی۔ اور برنی جیسے مورخ کو بھی تصنیف "فتاوی جہانداری" میں یہ اقرار کرنا پڑا ہے۔ کہ یہاں بادشاہی نظام خالص "دنیاداری" پر قائم تھا جو "دین داری" کے قطعی خلاف تھا۔ جس کا قیام غیر اسلامی طور طریق اور طرز حکومت کو اختیار کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ سلطان اگرچہ خود اسلامی عقیدہ کا قائل اور شرائع کا پابند تھا۔ لیکن اس کی سلطنت کا نظام شرائع کے بموجب قائم ہونے کے بجائے خاص تسلط اور فوجی طاقت پر قائم تھا۔ اس نظام میں شریعت کو بھی وہی حیثیت حاصل تھی جو دوسرے قوانین کو تھی۔ اس لیے دراصل یہاں مسلمانوں نے جس سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ مذہبی حکومت کے بجائے غیر مذہبی اور غیر جانب دار سلطنت تھی۔ پروفیسر حبیب اللہ نے یہ صحیح لکھا ہے کہ "مورخین کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطنت خالص اسلامی ریاست تھی جو اپنی پالیسی کو شریعت کے مطابق بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن جیسا کہ گذشتہ ابواب سے معلوم ہوگا۔ کہ عملاً ایسی نہ تھی بادشاہت کے غیر اسلامی طرز کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ برنی اس کا اعتراف کیا ہے "کہ دنیاداری جس کا منتہائے کمال بادشاہت ہے۔ وہ دینداری کے خلاف ہے۔ برنی نے یہ بتایا ہے کہ بادشاہت کے مسترخانہ طریقہ اسلام میں جاری رہے اور اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ غیر اسلامی طریقہ کا بادشاہت ممکن نہیں بعض فرش عقیدہ مذہبی گروہ اپنے کو تسلی دے سکتا ہے کہ سلطان صرف مذہب کی اشاعت اور شریعت کی بقا ہی کے لیے ہوتا ہے لیکن بغیر کسی شک و شبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اعمال میں چیزیں فیصلہ کن ہوتی تھیں وہ قوت اور ضرورت کا قانون تھیں۔ برنی نے بادشاہت کی اصلیت اور نوعیت کی تفصیل بتائی ہے وہ کہتا ہے کہ بادشاہت کے معنی استیلا کے ہیں۔ چاہے وہ قانونی طریقہ سے ہو یا قوت سے ہو اور شریعت کی عملی طور پر اس سے زیادہ توقیر نہ تھی۔ جیسی دوسرے قوانین کی۔ برنی کو یہ اعتراف ہے مسلمانوں کو جو سزائیں دی جاتی تھیں وہ قرآن پاک کے خلاف تھیں۔ لیکن ان کو روا رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح قانونی وراثت اور حلال و حرام کا امتیاز اور دوسری معروف امتناعی پابندیوں کو توڑ دیا جاتا تھا۔ مذہبی طبقہ اس کے خلاف احتجاج ضرور کرتا تھا۔ سود کے متعلق جو شرعی پابندیاں تھیں ان کا لحاظ مطلق نہیں کیا جاتا تھا۔ امیر خسرو نے واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک تنکہ پر ایک جتیل سود ماہوار لیا جاتا تھا۔ اور فریقین میں جب تحریری معاہدہ ہو جاتا تھا اس کو قانونی درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ اور قاضی کو اس کو عمل میں لانا پڑتا تھا۔ وہ جو چار شرائط برنی نے بادشاہوں کو عمل کرنے کے لیے لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی ضابطہ کو جاری کرے تو

Marfat.com

ان میں سے اگر کوئی شریعت کے خلاف ہو تو وہ واپس نہ لیے جائیں. بلکہ جب تک ضرورت ہو اس کو قائم رکھا جا سکتا ہے [1]

ہندوستان میں مسلمانوں کو اس غیر مذہبی سلطنت کی تاسیس عمل میں آئی اور بیشتر زبانوں میں اپنے کو غیر مذہبی حکمران تصور کیا انہوں نے اپنی ذات اور مسلمانوں کے لیے دین کی عام پابندی کو لازم کر رکھا تھا مگر مسلمانوں کے ساتھ اپنے سیاسی برتاؤ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا. اس طرح وہ دینداری اور دنیا داری دونوں پلڑوں میں رکھ کر نظم حکومت سنبھالے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے جو سلاطین دینداری کی طرف مائل ہوتے کا پلڑہ کس قدر جھک جاتا. اور جو خالص دنیاداری کے رخ کو سامنے رکھتے وہ اس سمت کو جھک جاتے تھے۔ یہی طرز ملوک سلاطین ہند سے لے کر تیموری سلطنت کے چراغ بجھنے تک قائم رہا. تیموری دور میں دین داری، و دنیا داری کے دونوں سروں دو حکمرانوں عالمگیرؒ اور اکبر نے اپنے اپنے دوروں میں اپنے کردار سے زیادہ نمایاں کر دیا تھا. اور اسی لیے ان دونوں کی بادشاہی کا نور ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھا۔ بایں ہمہ پورے اسلامی دور میں کسی ایک حکمران کا بھی زمانہ ایسا مشکل سے مل سکتا ہے. جس کو ہم خالص اسلامی حکومت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور جس میں ہم عہد صدیقی فاروقی کی مثالیں دیکھ سکتے ہوں بلکہ یہاں اسلامی حکومت کے بجائے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم تھی. جس میں حکمرانوں اور محکوموں میں ارتباط بڑھا تو دونوں کو یکساں حیثیت کے شہری حقوق حاصل ہو گئے. اور حکومت کا کوئی عہدہ یا منصب محض نامسلمان ہونے کے سبب سے کسی کے لیے بند نہیں رہ گیا۔

ہندوستان کی حفاظت

ملوک سلاطین اپنے دور میں حکمرانی میں مغربی سرحد کی اہم خدمات انجام دیتے رہے. اس دور میں وسط ایشیا میں پے در پے انقلابات آئے اور ان کی لہریں دریائے سندھ تک بھی پہنچیں. لیکن سلاطین نے ان کی موجوں کو بکھیر دیا اور پنجاب تک کے علاقہ کو مضبوطی سے زیر نگیں رکھا. ان کا یہ کارنامہ مغل سلاطین کے کارناموں سے بڑھا ہوا تھا اس لیے کہ مغلوں کے تسلط میں افغانستان اور قندھار کا علاقہ بھی تھا. انہیں آگے بڑھ کر ہندوستان کی سرحد کی حفاظت و مدافعت کا عظیم بار تھا.

حکومت کا ڈھانچہ

اس لیے سلاطین دہلی کی مرکزی حکومت پر ملکی حفاظت و مدافعت کا عظیم بار

---

[1] فاؤنڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا صہ ۲۱۵

Marfat.com

تھا۔ اور اس لحاظ سے ان کے غیر معمولی مصارف بھی تھے۔ اور مرکزی حکومت سب سے زیادہ فوجی اخراجات ہی صرف کرتی تھی۔ اس دور وسطیٰ میں مسلمان سلاطین کی سلطانی کا استناد خلفاء کی منظوری سے حاصل ہوتا تھا۔ ہندوستان کے یہ سلاطین بھی خلفاء سے اپنا رسمی رشتہ قائم رکھتے تھے۔ اور اسماء خلیفۃ المسلمین کو سب پر تفوق حاصل تھا۔ اور یہ سلاطین گویا ان کی طرف سے نیابتہ حکومت کرتے تھے۔ اس لیے خطبہ میں خلفائے اسلام کے ساتھ ان کے نام لیے جاتے تھے۔

حکومت کے شعبے

سلطان کے بعد قدرۃً وزراء کو اہمیت حاصل تھی جنہیں نظام الملک مؤید الملک صدر الملک امین الملک وغیرہ کے خطابات دیئے جاتے تھے۔ لیکن یہ وزراء صرف کشوری امور کے مالک تھے شعبہ عسکری، شعبہ مال دیوان انشاء، معاملات خارجہ، اطلاعات اور وزارت انصاف کے شعبے علیحدہ قائم تھے ان کے علاوہ امیر، حاجب، وکیل دار، سار جاندار اور کبھی نائب مملکت کے عہدہ دار مقرر ہوئے پھر آخر میں نیابت کے عہدے مستقل کر دیئے گئے جن میں نائب وزیر نائب وکیل عہدہ دار تھے۔

فوج

فوج کی کئی قسمیں تھیں۔ ایک تو بادشاہی فوج تھی جو ملک اور خصوصاً سرحد کی حفاظت پر مامور تھی دوسرے صوبائی فوجیں صوبہ داروں کے ماتحت تھیں۔ کبھی ضرورت کے وقت بھرتی ہوتی تھی۔ فوج کے افسروں کو تنخواہیں دی جاتی تھیں جاگیریں سپرد تھیں۔ البتہ قائم فوج کے سپاہیوں کی تنخواہیں جو مواجب کہلاتی تھیں مقرر تھیں۔

آئین وعدالت

قانون شریعت بنیادی آئین سمجھا جاتا تھا۔ مگر ضرورت کے مطابق اس کے خلاف عمل ہوا کرتا تھا۔ ہندوؤں کے لیے ہندو کوڈ کے مطابق قوانین نافذ تھے خصوصاً پرسنل لا میں انہیں کامل آزادی حاصل تھی۔ صدر جہاں کا عہدہ ہندوستان کی مرکزی عدالت کے چیف جسٹس کے لیے تھا امراء و وزراء سے رتبہ واحترام میں اس منصب کا درجہ اونچا تھا۔ چنانچہ مورخین نے فہرست میں شہزادوں کے بعد ان کے نام لکھے ہیں۔ وہ صدر جہاں کے علاوہ قاضی قضاۃ، قاضی ممالک یا شیخ الاسلام بھی کہے جاتے

Marfat.com

ہیں۔ عدالتی نظام و انصرام و تقرر کے سارے اختیارات اسی کو حاصل تھے[1]

پھر اس کے ماتحت عہدہ دار تھے۔ دیوانی کے مقدمات قاضی اور فوجداری کے مقدمات امیرداد سماعت کرتے کوتوال اور محتسب پولیس کا کام کرتے تھے۔

زکوٰۃ کا نظم بھی قائم تھا اور دوسرے محاصل بھی لیے جاتے تھے۔ جنسی نقرئی، طلائی کے سکے کئی قسم کے جاری تھے۔

ڈاک کا نظام

ڈاک کے نظم کا بڑا عہدہ دار "بریدِ ممالک" کہا جاتا تھا۔ اس کا صدر دفتر پایۂ تخت میں تھا۔ اس کے ماتحت راستوں کا معقول نظام قائم رہتا تھا۔

صوبوں کا نظم

صوبوں کا نظم اس طرح قائم تھا کہ صوبہ دار اپنے حدود کا کامل ذمہ دار ہوتے تھے۔ کبھی نائب والی بھی مقرر ہوتے تھے۔ صوبوں میں بھی چھوٹے پیمانہ پہ حکومت کے وہ سب شعبے موجود تھے جو مرکز میں قائم تھے۔ اس زمانے میں صوبوں کے لیے اقطاع کی اصطلاح قائم تھی۔ صاحب اقطاع کو عدالتی نظام میں دخل دینے کا اختیار حاصل نہ تھا۔ صوبہ دار شحنہ و کوتوال کی مدد سے نظم و امن قائم رکھتا تھا۔ اور مرکزی حکومت کی طرف سے خطبہ و سکہ جاری رہتا تھا۔ کبھی باجگذار صوبے اپنا سکہ علیحدہ جاری کرتے تھے

سلاطین کا طرز بود و ماند

مورخین نے ملوک سلاطین کے شاہانہ طرز بود و ماند کی نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے۔ سلطان کے گرد صد ہا نقیب و چاؤش پیادہ سرہنگ امراء فوجی سردار جمع رہتے تھے۔ اور ایسا دبدبہ چھایا رہتا تھا کہ کبھی بڑی بڑی سلطنتوں کے امراء و سفراء "خاک بوسی" یعنی سلام کے وقت شدت اثر سے لڑکھڑا کر گرنے اور بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اس طریقہ سے رعب و دبدبہ قائم کر کے فتنہ انگیزی کو روکنا مقصود تھا۔ حالانکہ خود پرستی و عظمت نمائی کے یہ طریق اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی تھے۔ لیکن بلبن خود کہتا ہے کہ ان کو جائز اس لیے رکھا گیا ہے کہ قیام امن و عدل میں ان سے

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۲۵، ۱۷۷، برنی ص ۴۲، ۱۲۶

Marfat.com

مددطلب ہے۔[1] مظلوموں کی دادرسی ان سلاطین کا خاص شیوہ رہا نیز وہ امور دین میں دینداری کو راہ دینے کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی حکومت کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

اسلام کی اشاعت

اس دور میں اسلام کی اشاعت ضرور تھی مگر وہ حکومت کے بل پر ہونے کی بجائے مسلمانوں کے ہندوستان کی منتشر آبادیوں میں گھل مل کر رہ بس جانے سے ہوئی۔ ہندوؤں میں "مورتی پوجا" عقیدہ کمزور ہوتا گیا۔ توحید اور مساوات انسانی کے جذبات کی ان میں پرورش ہوئی ہندوؤں کے مختلف فرقوں نے بعض اس زمانہ میں اور بعض آگے چل کر توحید کی تعلیمات کو اصول کے طور پر مانا۔ اور ویش، شودر، کھتری، اور برہمن کی تفریقوں کو مٹایا۔ صوفیہ کرام شمالی ہند کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکے تھے۔ اور اسلامی تصوف کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کو فروغ ہوتا جاتا تھا۔ خصوصاً خانوادہ چشتیہ نے وہ خدمات انجام دیئے جو سلاطین دہلی سے انجام نہ پا سکے۔ کلاہ تتری رکھنے والے درویش صفت امیر اور خواجہ حسن نے سلطان نظام الدین کی چوکھٹ چومی۔ اس دور میں علمائے دین بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور خدمتیں انجام دیتے تھے۔ مسجدیں اور مدرسے ان کی سیادت میں معمور تھے۔

علوم کی ترقی

مملوک سلاطین نے علوم کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ ضیاء الدین برنی نے ہر ایک سلطان کے عہد کے بیان میں شعراء، علماء، فقہاء، وغیرہ کی طویل فہرست درج کی ہے۔ تذکرہ کی کتابوں میں مختلف مدارس کا حال ملتا ہے۔ اس دور میں علمی و تعلیمی ترقیاں ہوئیں۔

ایک نئے کلچر کی تخلیق اور انسانی آبادی کے طبقات

ہندوستان کے شمالی حصہ میں اس دور میں ایرانیوں، افغانیوں اور ترکوں نے عربوں کے تمدن سے آمیزش کے بعد مسلمانوں کی سوسائٹی میں یہاں ایک طبقہ اعلیٰ قائم کر لیا تھا۔ اور پھر ہندوؤں میں سے ایک بڑا طبقہ اسلام میں داخل ہوا۔ ترقی کر کے نیابت مملکت کے منصب تک پہنچا۔ اس طرح شمالی ہند میں ایک ایسے

---

[1] برنی ص۱۳۱، ۳۲

کلچر کی بنا پڑی جس میں عرب تمدن آمیز ایرانی افغانی ترکی کلچر میں ہندی کلچر کی آمیزش ہوئی اور ایک نئے کلچر کی تشکیل عمل میں آئی۔ دوسری طرف سندھ میں عربوں کے غالب اثرات سے ہندی کلچر کی آمیزش سے ایک جداگانہ کلچر کی تشکیل ہو رہی تھی۔ اس طرح شمالی ہند کے نئے کلچر میں ایرانی اور سندھ کے نئے کلچر میں عربی اثرات نمایاں تھے۔ ملوک سلاطین کے دور میں شمالی ہند اور سندھ و ملتان کے ان دونوں کلچروں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا۔ اور ایک نیا ہندوستانی کلچر عالم وجود میں آیا اور سوسائٹی میں طبقہ اعلےٰ کے وہ مسلمان جو مختلف نسلوں کے تھے۔ اس کلچر کے روح رواں رہے۔ اس سوسائٹی میں اہل سیف اور اہل قلم کی دو قسمیں تھیں۔ اہل سیف میں ارباب حکومت اور اہل قلم میں ارباب علم داخل تھے۔ عدالت و قضاء کا نظم موخرالذکر طبقہ ہی کے قبضہ میں تھا۔ تیسرا گروہ "عوام" اور "خلق" کا تھا۔ تجار کا طبقہ ان ہی میں سے تھا۔ جن میں ملک التجار بھی ہوتے تھے۔ اور امتیازی نشان حاصل کرتے تھے۔ عوام کا بڑا طبقہ... کاشت کاری اور کارخانوں میں کام کرتا تھا۔ مذہبی حیثیت سے ملک میں سُنی شیعہ صوفیہ اور نامسلمانوں کا تھا۔ شیعوں میں کاغانی طبقہ موسوم بر ملاحدہ قرامطہ تھا۔ اس طرح شیعوں میں حنفی اور شافعی دونوں تھے۔

تجارتی ترقی

اس عہد میں ہندوستان کے تجارتی تعلقات ایران و عرب کے ساتھ قائم تھے حالانکہ ملوک سلاطین کے قبضہ میں کوئی بندرگاہ نہ تھی۔ ملکی تجارت بھی فروغ پر تھی۔ مختلف قسم کے کارخانے قائم تھے۔ جن میں سامان تیار ہوتا تھا۔ زرعی ترقی اس ملک کی جان تھی۔ حکومت امن و امان قائم رکھ کر اور کسانوں میں آسانیاں مہیا کر کے زراعت کو ترقی دیتی تھی۔

اندرون ملک میں راستوں کا معقول نظم قائم تھا۔ تجارتی راستے زیادہ تر دریائی تھے۔ بحری و بری راستوں اور ان کے وسیلوں کا نظم قائم رکھا گیا تھا۔ جس سے ملک میں غیر معمولی تجارتی و صنعتی ترقیاں عمل میں آئیں۔

ہندوستان کی مرکزیت عالم اسلامی میں

ہندوستان کی تجارتی و صنعتی ترقیوں اور فراغ بالیوں کا شہرہ ایسا ہوا کہ ایشیا اور دوسرے اسلامی ملکوں سے لوگ نقل وطن کر کے آنے لگے اور مختلف صناع کاریگر اور اہل حرفہ اس ملک میں آباد ہو گئے۔ اس تمدن کا سب سے اہم مرکز خود پایہ تخت

Marfat.com

دہلی تھا۔ چنانچہ اس دور کے خاتمہ کے چند سال بعد جب ۷۳۴ھ ۱۳۳۲ء میں مشہور ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ دہلی کو نہ صرف بلاد ہند بلکہ تمام مشرقی دنیائے اسلام کے شہروں پر تفوق و ترجیح حاصل ہے۔"

سوال:۔ ہندوستان کے عہد اسلامی کی تعلیمی ترقیوں پر سیر حاصل بحث کیجئے۔

جواب:۔ ہندوستان کو غزنی خراسان ماوراء النہر عراق و عجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا۔ اسی طرح اس کے دل و دماغ کو انہی ملکوں کے ارباب کمال نے اپنا باجگذار بنایا۔ قطار در قطار علماء ان ملکوں سے ہندوستان آئے۔ اور ملتان ٹھٹھہ بھکر لاہور اور سیالکوٹ میں منزلیں کرتے ہندوستان میں اسلام کے دار السلطنت دلی میں آکر ٹھہر گئے۔ پھر جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا گیا علم کی روشنی کی کرنیں بھی اس علاقہ کو اجاگر کرتی گئیں۔ ہندوستان کے عہد اسلامی کے مختلف دوروں میں یہ سارے کے سارے خطے مسلمانوں کی تعلیمی زندگی کے مراکز بنے رہے۔

ہندوستان میں اسلامی تعلیم کی ابتداء

ہندوستان میں اسلامی علوم کی تعلیم پانچویں صدی سے شروع ہوئی۔ کیونکہ ہندوستان کی مسلسل اسلامی تاریخ دراصل غزنویوں کے عہد سے ہوتی ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۳ھ میں لاہور فتح کیا۔ اور سلطان مسعود یہاں کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے دامن دولت سے علماء فضلاء کی جماعت وابستہ تھی۔ اس کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیل متوفی ۴۴۸ھ لاہور آئے اور یہاں توطن پذیر ہوگئے۔ یہ متداول اسلامی علوم تفسیر و حدیث و فقہ کا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے۔ اور ان کے ذریعہ سے یہاں ان علوم کی اشاعت ہوئی تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ یہ اکابر محدثین و مفسرین میں تھے یہ پہلے شخص ہیں جو علم حدیث و تفسیر کو لاہور لائے[1]

ہندوستان میں اسلامی مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت

اس کے بعد ہندوستان میں اسلامی مدرسوں کی عمارتوں کی تعمیر کا زمانہ چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے آغاز کے درمیان قرار پاتا ہے۔ ہندوستان میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت تعمیر ہونے کی جو اطلاع اس وقت تک مل سکی ہے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷

Marfat.com

وہ مولانا قطب الدین کاشانی کے لیے ناصرالدین قباچہ کے ہاتھوں ملتان میں تعمیر ہوئی ہے مولانا قطب الدین ماورالنہر سے ملتان آئے تھے۔ ناصرالدین قباچہ اس زمانہ میں ملتان کا والی تھا۔ اس نے ایک سرائے اور اس سے ملحق ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ اور اس میں ان کا درس جاری رکھا۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی (المولود ۵۷۸ھ) کا ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ روزانہ صبح کو اس مدرسہ میں آتے۔ اور صبح کی نماز مولانا کاشانی کے پیچھے ادا کرتے تھے[1]

ہندوستان میں مدرسوں تاسیس کا رواج

اسی کے ساتھ تاریخی قدامت کے لحاظ سے اجمیر کے ان مدرسوں کا ذکر کرنا چاہیے جن کو سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۵۷ھ میں اجمیر فتح کرنے کے بعد وہاں قائم کیا۔ اس کے بعد ساتویں صدی کے اوائل میں دلی کے دو مدرسوں معزی و ناصری اور اچھ (سندھ) کے مدرسہ فیروزی کا تذکرہ آتا ہے۔ طبقات ناصری کے مصنف ابوعمر منہاج الدین جوزجانی ساتویں صدی کے اوائل کے ذی علم لوگوں میں گذرے ہیں۔ وہ عہدہ قضاءت کے علاوہ اپنے علم و فضل کے باعث ایک سے زیادہ مدرسوں کے مہتمم بنائے گئے۔ وہ ماہ جمادی الاول ۶۲۴ھ میں خراساں سے سندھ کے مشہور شہر اچھ میں داخل ہوئے اور اسی سال ماہ ذی الحجہ میں مدرسہ فیروزی سے وابستہ ہوگئے[2] یہ مدرسہ غالباً سلطان التمش کے لڑکے رکن الدین فیروز کے نام سے منسوب تھا۔ جو یہاں کا گورنر گزرا ہے اس کے بعد ماہ شعبان ۶۲۵ھ میں سلطانہ رضیہ نے ایک دوسرے مدرسہ ناصریہ کو ان کے سپرد کر دیا۔

تیسرے مدرسہ معزیہ کا ذکر دلی میں قرامطہ کی یورش کے سلسلہ میں ملتا ہے کہ یہ بھی سلطان رضیہ کے عہد میں قائم تھا۔ طبقات ناصری میں اس مدرسہ کے دروازے پر قرامطہ کے قتل عام برپا کرنے کا ذکر آیا ہے[3]

ملتان اجمیر سندھ اور دلی کے مدرسوں کے بعد بہار اور بنگال کے اسلامی مدرسوں کا نام آئے گا۔ چنانچہ بہار و بنگال کے سب سے پہلے مسلمان فاتح بختیار کاکی خلجی کے حال میں فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس نے ندیا کے بجائے شہر رنگ پور کی بنیاد ڈالی اور اس کو دارالحکومت قرار دیا ہے اور یہاں مسجدیں خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کئے اور سب بارونق ہوگئے[4]

پھر اسی طرح اس دریا کے تمام مفتوحہ شہروں میں والیان شہر نے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کر دیئے۔ چنانچہ طبقات ناصریہ میں بختیار خلجی کے حال میں مختلف امراء کے مساجد و مدارس کے بناء ڈالنے کا ذکر آیا ہے[5]

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۴ [2] طبقات ناصری ص ۱۴۳ [3] طبقات ناصری ص ۱۸۹ [4] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۹۳

Marfat.com

عہد تغلق میں مدارس کی کثرت

اس اثناء میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں مدرسوں کے قائم کرنے کا عام رواج ہو چکا تھا۔ چنانچہ آٹھویں صدی میں محمد تغلق کے عہد حکومت میں صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔ قلقشندی صاحب صبح الاعشیٰ دلی کے حال میں لکھتا ہے یہاں ایک ہزار مدرسے ہیں۔ جن میں سے صرف ایک شافعیوں کا ہے۔ اور باقی حنفیوں کے لیے اور یہاں تقریباً ۷۰ بیمارستان ہیں جو یہاں دارالشفاء کہے جاتے ہیں۔[۲]

فیروز شاہ کے عہد میں تعلیمی ترقیاں

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق نے مدرسوں کی بناء و تاسیس و تعمیر پر بڑی توجہ کی۔ پرانے مدرسوں کی عمارتوں کی تجدید کی، اور تیس نئے مدرسے قائم کئے۔ اور علماء و طلبہ کے وظائف جاری کئے۔ اس نے اجمال کے ساتھ اپنی فتوحات فیروز شاہی میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور فرشتہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ ان مدرسوں کے مصارف کے لیے جائیدادیں وقف کر دی تھیں۔ اور ان مدارس کے متوسلین کے لیے وظائف مقرر تھے۔[۳]

مدرسہ فیروز شاہی

عہد فیروز شاہی میں سب سے بڑا شاہی مدرسہ دارالسلطنت دلی میں مدرسہ فیروز شاہی تھا۔ اس کے حالات ضیاء الدین برنی اور مطہر کڑوی دونوں نے نثر و نظم میں لکھے ہیں۔ بلکہ ضیاء نے اپنی نثر کو شاعرانہ مبالغہ آمیزی میں نظم سے بڑھا دیا ہے اور اس کی عمارت کی توصیف و تعریف میں یہاں تک کہہ گزرا کہ وہ روئے زمین پر بے مثل عمارتوں میں سے ہے اور مطہر نے جو دربار کی حاضری کے موقع پر پہنچا تھا۔ اس مدرسہ کی زیارت کر کے نظم میں اس کے مفصل حالات قلمبند کئے تھے۔ جس سے یہاں کے استادوں، طالب علموں اور دارالاقامۃ کے کھانے وغیرہ کے مفصل حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ضیاء الدین برنی نے اس مدرسہ کی دل کش اور عالی شان عمارت اس کے گنبدوں کی رفعت اس کی آب و ہوا کی لطافت اور عمارت کی آراستگی و پیراستگی کا نقشہ اس مبالغہ سے کھینچا ہے کہ یہاں پہنچ کر گمان ہوتا ہے کہ آنے والا بہشت عدن میں داخل ہو گیا ہے۔

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۵۱ [۲] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۶۹ [۳] فرشتہ ج ۱ ص ۱۵۱

Marfat.com

عہد فیروز شاہی کے دیگر مدارس

اسی طرح اس زمانہ میں سلطنت کے امراء نے بھی ملک کے مختلف حصوں میں مدرسے تعمیر کرائے تھے۔ جیسے عین الملک نے اسلام آباد کے نواح کے ایک دیہات میں جہاں مطہر کا قیام تھا۔ مدرسہ اور باغ تعمیر کرایا تھا۔ مطہر نے اس کا تذکرہ بھی اپنے قصیدے میں کیا ہے۔ لے (ہ پورا قصیدہ اورینٹل میگزین مئی ۱۹۵۲ء ص ۳۷، ۱۴۸)

غلاموں کی تعلیم کا اہتمام

فیروز شاہ کی تعلیمی خدمات میں یہ بھی شمار کرنے کے لائق ہے کہ اس نے مسلمانوں کے سب سے ناخواندہ طبقہ غلاماں کو اکٹھا کر کے اپنی ملکی و سیاسی ضرورتوں کے لیے ان کی نو آبادیاں بسائیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا چنانچہ ان کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم و حفظ قرآن وغیرہ کا خاص انتظام کیا تھا۔ شمس سراج عفیف نے اس کی مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ لکھا ہے کہ ہر ایک کا مشاہرہ مقرر کر دیا جو دس سے سو تنکہ تک تھا۔ مختلف طلباء حفظ قرآن اور علوم دینی کے درس میں مشغول تھے۔ کچھ لوگوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح بارہ ہزار مختلف فنون کے ماہر تیار ہو گئے۔ مجموعی طور پر ایک لاکھ اسی ہزار غلام علوم و فنون اور مختلف صنعت و حرفت کے ماہر تیار ہو گئے تھے۔ ہے فیروز شاہ نے حوض خاص طلائی کے پرے بھی ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا جس میں سید یوسف بن سید جمال حسینی مشہدی متوفی ۷۹۰ھ مدرس تھے۔ سالہا سال اس خدمت پر مامور رہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخبار میں اس کا تذکرہ کیا ہے ۳ے اخبار الاخبار ص ۱۴۲

لڑکیوں کے مکاتب

اس زمانہ میں بعض مقامات پر لڑکیوں کے جداگانہ مکاتب کے قائم رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ موجودہ علاقہ بمبئی کے اس زمانہ کے مشہور ہنور میں پہنچا۔ یہاں شافعی مذہب مسلمانوں کی بڑی آبادی موجود تھی۔ اس کا بیان ہے کہ عورتیں حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ اور عورتوں کی تعلیم کے لیے تیرہ مکاتب قائم تھے۔ وہ لکھتا ہے ان عورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ سب کی سب قرآن حفظ کرتی ہیں۔ میں نے اس شہر میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے تیرہ اور لڑکوں کی تعلیم کے لیے تیئیس مکاتب دیکھے ایسی بات میں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھی ۴ے سفر نامہ ابن بطوطہ ص ۲

۲ے فیروز شاہی عفیف ص ۲۷۰

Marfat.com

شاہی محل سرا میں جو لڑکیاں رہتی تھیں ان کی تعلیم کا خاص نظم کیا جاتا تھا۔ سلطان غیاث الدین خلجی کے محل میں ۱۰ ہزار باندیاں تھیں۔ اس لیے ان کے لیے ایک نظم عمل بنا دیا تھا۔ اور ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام تھا۔ اور زنانہ نظام میں وزیر خزانہ دار، وکیل و ندیم کے ساتھ محتسب مفتی موذن اور حافظ قرآن کے عہدے بھی قائم تھے۔ اور لڑکیاں اپنی استعداد کے مطابق ان منصوبوں پر مقرر کی جاتی تھیں ۵ے تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۵۵)

سلاطین بہمنی کی تعلیمی خدمات

اسی طرح اس زمانہ میں سلاطین بہمنی نے مفید تعلیمی خدمات انجام دیئے۔ اور دکن کے مختلف مقاموں، گلبرگہ، بیدر وغیرہ میں مدرسے قائم کئے۔ اور علماء محدثین کے وظائف جاری کئے۔ اور یتیموں کی تعلیم کا انتظام کیا فرشتہ نے سلطان بہمنی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے گلبرگہ و بیدر و قندھار و دولت آباد و خیبر و جیول و دابل اور دوسرے شہروں میں تعلیم گاہیں قائم کیں جن میں احادیث کا درس خاص طور پر ہوتا تھا اور محدثین کے وظائف مقرر تھے۔ ۱ے تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۰۲

عہد خلجی میں تعلیمی ترقیاں

اس کے بعد نویں صدی ہجری میں سلطان محمود خلجی کے ہاتھوں ہندوستان میں تعلیمی ترقی انجام پائی۔ مدرسے قائم کئے گئے۔ لڑکوں کو وظیفے جاری کئے اور اپنے حدود حکومت سے باہر بھی اگر کسی باکمال کا شہرہ سنتا امداد کی رقمیں بھیج دیتا ۲ے تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۲۴۳ چنانچہ اسکے دور حکومت میں متعدد نئے مدرسوں کے قائم کرنے کا ذکر آتا ہے جیسے ۸۴۶ھ میں ولایت چتور میں متعدد مدرسے قائم کئے اور اسی سال کے آخری مہینہ ذی الحجہ میں پایۂ تخت شادی آباد میں ایک شاہی مدرسہ قائم کیا۔ ۳ے ماثر رحیمی ج ۱ ص ۱۳۲

اس صدی میں دو ولایتوں کے دو فرماں رواؤں کی تعلیمی خدمات بھی لائق ذکر ہیں۔ ایک گجرات کا محمود بیگڑہ اور دوسرے سندھ میں جام نظام الدین ہیں۔ محمود کے متعلق مراۃ احمدی کا بیان ہے کہ اس نے "مدارس بہشت آئیں و مساجد مانند خلد بریں" تعمیر کیئے ۴ے مراۃ احمدی ج ۱ ص ۹۰

Marfat.com

اس نظام الدین کے بارے میں ناشر رحیمی میں ہے کہ" اوائل عمر میں وہ علم کی طلب میں مختلف مدارس میں جارہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر اس زمانہ حکومت میں علماء و صلحاء و فقراء غیر معمولی فراغ بالی سے تھے اور اس زمانہ میں سنن کا احیا اور مدارس کا رواج اس طریق پر ہے کہ اس کی ستائش سے قلم عاجز ہے"

اس نے مولانا جلال الدین دوانی کو شیراز سے ہندوستان آنے کی دعوت دی ٹھٹھہ میں ان کے لیے عمدہ قیامگاہ کا انتظام کیا۔ اسی اثناء میں ان کا سفر آخرت پیش آگیا۔ ان کے دو عزیز تلامذہ میر معین الدین اور میر شمس کے سوائے ان کی علمی فیوض و برکات ہندوستان میں منتقل ہوئے۔ (ماثر رحیمی ج ۲ ص ۳۲۷)

اسی زمانہ میں سلطاطین شرقیہ جونپور میں حکمران تھے۔ اور شہر جونپور" دار السرور شیراز ہند" کہا جاتا تھا۔ ملا محمد صاحب سیر الملوک کا بیان ہے کہ یہاں صدہا مدرسے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اور علماء و فضلاء دور دراز ملکوں سے آئے جن کے لیے وظیفے اور جاگیریں مقرر ہوئیں۔ جونپور کی تعلیمی وعلمی برتری مغلوں کے ثبات کے زمانہ تک قائم رہی تبھی جونپور نامدار

لودھیوں کے عہد کی تعلیمی ترقیاں

اس کے بعد لودھیوں کا زمانہ آتا ہے۔ اور سلطان سکندر لودھی کا عہد حکومت تعلیمی ترقیوں میں سبقت لے گیا۔ سیر المتاخرین میں ہے کہ" اس نے مساجد و مدارس تعمیر کئے اور ان میں امام موذن خطیب اور مدرس مقرر کئے۔ اور ان کے وظیفے اپنی سرکار سے مرحمت فرمائے" (سیر المتاخرین ج ا ص ۱۱۰)

اس کے عہد میں معقولات کے درس میں شیخ عبد اللہ طلبنی (دہلی) اور شیخ عزیز اللہ طلبنی (سنبھل) کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ سلطان سکندر لودھی بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ شیخ عبد اللہ کے حلقہ درس میں بھی چلا آتا تھا۔ لیکن جب آتا تو تمام شاہی آداب و لوازم ترک کرکے حلقہ کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ رہتا اور درس کے خاتمہ کے بعد سلام و کلام کرتا تھا۔ (منتخب التواریخ ج ا ص ۳۲۴)

ہندوؤں میں فارسی زبان کی تحصیل کی ابتداء

سلطان لودھی کے دور حکومت کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسی زمانہ سے ہندوؤں نے فارسی زبان سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ پھر جلد ہی اس قدر ترقی کرلی۔ کہ اس

Marfat.com

زبان میں شعروشاعری کرنے لگے اور مسند درس پر بیٹھ گئے ۔

سوال :۔ ہندوستان کے عہد اسلامی میں مالگذاری کی تشخیص اور اس کی تحصیل کا انتظام کیا تھا۔

جواب :۔ ہندوستان کے عہد اسلامی میں مالگذاری کی تشخیص، زمین کی پیداوار کی صلاحیت کی جانچ پڑتال کے بعد کی جاتی تھی۔ ابتداءً حکومت کے اعمال کاشت کاروں سے مال گذاری وصول کرتے تھے۔ مالگذاری بالعموم سکوں کی شکل میں وصول کی جاتی تھی۔ عہد اسلامی میں زمین کی پیمائش کا اہتمام رہتا تھا عمل گذار کو ہدایت کی تھی کردہؐ ہر مزارعہ زمین کی پیمائش کرے اور غور و خوض سے دیکھ کر ان قطعات اراضی کی نوعیت وحقیقت سے آگاہی حاصل کرے۔ اور لگان کی تشخیص کرے ۔

بعض خاص زمینوں کی مالگذاری غلہ کی صورت میں بھی وصول کی جاتی تھی، کنکوٹ دانہ بندی بٹائی کے طریقے رائج تھے لیکن اگر کاشت کار پورا غلہ لینا چاہتا ہے تو غلہ کی قیمت بازار کے نرخ سے لگان اور رقم وصول کرتے تھے۔ ہر موضع کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ دفتر اور ان کے عہدہ دار تھے۔ جو معلومات کی مفصل روداد رکھتے تھے۔ اور ایک فصل میں اگر بقایا رہ جاتا تو اس کا اندراج دفتر میں کر لیتے اور اس کے گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کے دستخط لے لیتے اور دوسری فصل کے موقع پر بقایا بھی وصول کرتے تھے ۔

سوال :۔ ہندوستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کے نظام پر بحث کیجئے ۔

جواب :۔ ہندوستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کے نظام قائم رہنے کا تذکرہ اس عہد کی تاریخوں میں عمومی طور پر مل سکتا ہے۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ عہد اسلامی کے مختلف دوروں میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول اور اس آمدنی کے مصارف کا طریقہ شرعی احکام کے بموجب قائم رکھا گیا۔

اس سلسلہ میں پہلے یہ بات ذہن نشین رکھی جائے۔ تو حقیقت کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ کہ ان اسلامی حکومتوں میں جو عہد وسطیٰ میں مشرق و مغرب میں قائم رہی ہیں ان کے مالی نظام میں دو عملی طریق کار جاری ہو گیا تھا ایک طرف وہ شریعت کی پابندی کے ، کوٰۃ کا نظام کو قائم رکھتی تھیں اور دوسری طرف مختلف سلاطین اپنی حکومت کے استحکام اور شاہی مصارف ملکی مہمات اور فوجی ضروریات کے لیے اور دوسرے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی آمدنی و مصارف کی حیثیت ایک قسم سے دینی سرمایہ کی ہوگئی تھی۔ حالانکہ اگر یہ سلاطین دین کے ماہرین اور ارباب حل وعقد کے مشوروں سے اپنی حکومت کے اقتصادی نظام کو قائم کرتے تو انہیں اس دو عملی طریق کار کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ چنانچہ بعض دین دار سلاطین اسپین اور بعض دوسرے ملکوں میں کسی ایک زمانہ میں خالص دینی نظام مالیات تو برقرار رکھ کر کامیابی سے حکومت کی۔ اور انہیں دوسرے ٹیکسوں کے لگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

۱؎ منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۳۲۲

Marfat.com

ہندوستان کے عہد اسلامی میں بھی حکومت کے مالی نظام میں یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ مختلف زمانوں میں بھی یہاں کی حکومتوں کے مالی نظام میں زکوٰۃ کا نظام قائم رہا۔ اگر اس عہد کی تاریخوں کی استقصا سے دیکھا جائے تو مختلف دوروں کی تفصیلات سامنے آسکتی ہیں۔ ذیل میں چند سرسری حوالے پیش ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی حکومت سندھ میں قائم ہوئی۔ یہ حکومت ابتداءً اسلامی اصولوں پر قائم تھی۔ اس لیے شریعت کے مطابق مسلمانوں سے صدقہ و زکوٰۃ اور نامسلمانوں سے جزیہ کی رقم وصول کی جاتی تھی۔ اسی طرح انہیں کی پیداوار میں مسلمانوں سے دسواں حصہ اور نامسلمانوں سے مقررہ خراج وصول کیا جاتا تھا۔ چچ نامہ میں ہے:- ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ غلامی اور جزیہ سے آزاد رہے۔ اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے تین درجے قائم کئے گئے اعلیٰ طبقہ یعنی دولت مند سے ۴۸ درم متوسط لوگوں سے ۲۴ درم اور نیچے طبقہ سے ۱۲ درم تھے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ اس سے معاف کئے گئے اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے انھوں نے جزیہ دیا۔ لیکن ان کی زمینیں اور ان سے جائیدادیں نہیں لی گئیں۔ لے

موجودہ زمانہ میں ایک درم ساڑھے تین آنہ کے برابر ہے۔ اس طرح دولت مندوں سے دس روپے متوسطوں سے پانچ اور غریبوں سے ڈھائی روپے سالانہ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔ اور عورتیں بچے بوڑھے مذہبی عہدہ دار بچارے اور کمانے ۔۔ سے معذور بن مستثنیٰ تھے مسلمانوں سے جزیہ کے بجائے ڈھائی روپیہ سیکڑہ زکوٰۃ اور انہیں کی پیداوار میں دسواں اور نامسلمانوں سے مقررہ خراج وصول ہوتا تھا۔ پھر دوسرے آنے والے فاتحین نے جو حکومتیں قائم کیں۔ ان میں سے فیروز شاہ دور کے متعلق تصریح ملی ہے کہ اس میں رعایا کے درمیان مسلم، ذمی، اماتی اور دوسری طرف حربی کی تقسیم واصطلاح قائم تھی۔ اس دور کے متعلق یہ تصریح معلوم ہے کہ اس میں زکوٰۃ کا نظام قائم تھا۔ لیکن سلطان کے فوجی مہموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے حکومت کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ جب اس نے سلطنت کی اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ اور خصوصاً مسلمانوں کے خلاف لشکرکشی سے جو نقصانات ۔۔۔ ہوئے اور سامنے آئے ان میں ذیل کی دو باتیں تھیں۔

"دوم ان سب کے اموال بیت المال برائے ان جمع می کنند تا قوت در اسلام زیادت گردند و اس کہ بیت المال خرچ کنندہ برائے قلع مسلماں روند،

ششم آن سمت اموال باطل نا مشرع در بیت المال جمع نے شوند لے"

اسی طرح اسلامی ملکوں کے مالی نظام میں دو عملی طریق کار کے جاری ہونے کا جو تذکرہ اوپر گذرا وہی طریقہ اس دور میں ہندوستان میں جاری تھا۔ فیروز شاہ نے اس کو ختم کرنا چاہا۔ ان تمام ٹیکسوں اور

لے چچ نامہ ایسٹ میں صفحہ ۱۸

محصولوں کو جو غیر شرعی طریق سے وصول کیے جاتے تھے۔ معاف کر دیا اور حکومت کے مالی نظام کو خالی شرعی حدود میں لانا چاہا۔ علماء نے غیر شرعی محصولوں کی فہرست تیار کی اور فیروز شاہ نے ان سب کو موقوف کر دیا یہ خرابیاں دو قسم کی تھیں۔ ایک تو جائز محصول زکوٰۃ کی وصولی میں غیر شرعی طریق اختیار کیا جاتا تھا۔ دوسرے سرے نارواٹیکس عائد کئے جاتے تھے۔ علماء نے ان دونوں کے تدارک کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ چنانچہ فیروز شاہ نے ان کے متعلق تحقیقات کرنے کا حکم دیا۔ پھر شرع کے مطابق اپنے فیصلے صادر کئے۔

اس کے بعد ایک شاہی فرمان تیار کیا گیا جس میں مشروع محصولات کی تفصیل درج تھی۔ اس شاہی فرمان کو سنانے کے لیے شاہی لشکر کے مفتی قاضی نصر اللہ ہاتھی پر سوار ہوئے۔ اس کے سننے کے لیے عوام و خواص بڑی تعداد میں یکجا ہوئے اور غیر معمولی خوشی سے اس فرمان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد حکومت کی آمدنی میں بیس لاکھ تنکہ کی کمی ہو گئی۔ یہ محاصل ۷۷۷ھ میں لئے گئے تھے[۱]

دوسری طرف جو شرعی محصول نہیں کئے جاتے تھے ان کی وصولی کا حکم جاری کیا۔ اور غیر معمولی احتجاج کے باوجود منسوخ نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں جزیہ کی وصولی کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اس طرح اس نے اپنی ذاتی املاک میں بھی شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھا اور اپنی بنوائی نہروں سے سیرابی کا معاوضہ میں دسواں حصہ وصول کرتا۔ اور زمینوں کو آباد کیا۔ ان املاک سے دو لاکھ تنکے وصول ہوتے تھے۔ یہ آمدنی بیت المال سے علیحدہ رہتی تھی۔ بیت المال کی مجموعی آمدنی اس زمانہ میں کیا تھی۔ اس کے دریافت کرنے میں ایک طویل تحقیق کی ضرورت ہے جو سر دست نہیں ہو سکتی۔ اگر اس دور کی تاریخوں سے معمولات یکجا کئے جائیں تو وہ فراہم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ باغوں کے محصول کی مجموعی آمدنی کا ذکر آیا ہے۔ وہ ایک لاکھ اسی ہزار تنکہ تھی۔ اسی طرح دوآبہ کا محصول اسی لاکھ تنکہ وصول ہوتا تھا۔ اور دہلی کے جوار سے ۶ کروڑ پچاس لاکھ آمدنی تھی۔

فیروز شاہ نے زکوٰۃ کے مصارف کو ان کے جائز حدود میں صرف کرنے کا اہتمام بھی رکھا تھا۔ ۶ لاکھ تنکہ امدادی وظائف میں دیئے جاتے تھے۔ اور چار ہزار دو سو اشخاص مستقل طور پر وظیفہ یاب تھے خیرات خانے قائم تھے۔ اور نادار دں کو ان کی لڑکیوں کی شادی کے مصارف دیئے جاتے تھے۔ نیز عام صدقات و خیرات کا وسیع سلسلہ قائم تھا۔[۲]

سوال :- علاءالدین خلجی کی اقتصادی اصلاحات پر بحث کیجئے

جواب :- ہمارے زمانہ میں دو چیزیں مملکت کے حسن انتظام اور رعایا کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ دولت کی تقسیم مساوی ہونی چاہیئے تاکہ

۱؎ تاریخ فیروز شاہی میں ص ۳۶۵ ۲؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۵، ۳۷۹

Marfat.com

سرمایہ دار لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں غریبوں پر بے جا ظلم وستم اور زیادتی نہ کرسکیں۔ اور دوسرے یہ کہ اجناس اور دوسری ضروری چیزوں کے نرخ حکومت کی طرف سے مقرر کر دیئے جائیں۔ اور ان چیزوں کی فراہمی کا کام بھی حکومت کے سپرد ہونا چاہیئے۔ تاکہ دولت مند اور ارباب اغراض حد سے زیادہ نفع خوری کی لعنت میں مبتلا ہو کر عوام کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ عجیب بات ہے کہ علاؤالدین خلجی کی بھی ان دونوں باتوں کی طرف توجہ ہوئی۔ اور اس نے ان کا اتنا اچھا انتظام اور بندوبست کیا کہ ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ یا ہندو راج کے عہد میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ اس نے امراول یعنی ملک سے سرمایہ داری ختم کر کے اور لوگوں کو محنت سے پسینہ کمانے کا خوگر بنانے کے لیے یہ کیا کہ ہر قصبہ جو معافی یا وقف یا کسی اور طرح پر رعیت کے قبضہ میں تھا۔ املاک شاہی میں شامل کر لیا۔ اور ہر مسلم وغیر مسلم غریب وامیر پر بے جا ہر طرح کا دباؤ ڈال کر جو کچھ ان کی پونجی تھی۔ ان سے لے کر خزانہ میں داخل کی۔ فرشتہ کا بیان ہے۔

"علاؤالدین نے چاہا کہ سلطنت میں چند ضابطے ایسے جاری کرے جس سے کمزور اور طاقت ور لوگوں میں بالکل مساوات ہو جائے اور گاؤں کے مکھیوں اور چودھریوں کو جو فوقیت رعایا پر حاصل ہے۔ وہ باقی نہ رہے"۔[1]

اس سلسلہ میں رشوت ستانی کا دروازہ بند کرنے کے لیے اس نے یہ حکم جاری کیا کہ کوئی عامل اپنے روز ینہ کے علاوہ کوئی رقم ہرگز وصول نہ کرے۔ اور اگر کوئی عامل ایسا کرتا تو پٹواری کے دفتر کا معائنہ کیا جاتا اور پھر جس شخص کے نام کوئی زائد رقم نکلتی تھی اس سے بڑی سختی کے ساتھ وہ واپس لے لی جاتی تھی۔

اب رہی دوسری چیز یعنی اشیاء کی نرخ بندی ان کی قیمتوں اور ان کی فراہمی کی نگرانی کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں آمدورفت اور خبر رسانی کے وسائل وذرائع کی قلت کے باعث اس نظم کو جاری کرنا اور اسے قائم رکھنا نہایت مشکل کام تھا۔ علاؤالدین خلجی نے اسے جس طرح رائج کیا اور اس کے لیے جو قواعد وضوابط بنائے وہ یقیناً اس زمانہ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ قیمتوں پر کنٹرول علاؤالدین خلجی کی اقتصادی اصلاحات کا ایک حصہ لیا۔ پیشتر اس سے کہ قیمتوں کی تفصیلات بیان کی جائیں اس سلسلے میں ان اسباب و محرکات کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جن کی بناء پر قیمتوں پر کنٹرول کیا گیا اس سلسلہ میں ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی بھی کنٹرول نافذ کیا۔ یہاں قیمتوں کے کنٹرول کے متعلق تین مارکیٹوں کا تفصیلاً ذکر کیا جائے گا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۶

Marfat.com

(ا) غلے کی مارکیٹ۔

(ب) کپڑے کی مارکیٹ۔

(ج) جانوروں اور غلاموں کی مارکیٹ۔

غلے کی مارکیٹ کے متعلق تقریباً سات ضابطے جاری ہوئے۔ پہلے ضابطے کے مطابق (تخت) یعنی سلطان کی طرف سے اشیاء خوردنی جن کی زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے کی قیمتیں مقرر کی گئیں۔ قیمتیں مقرر کردینا بہت آسان بات ہے۔ لیکن مشکل بات تو ان میں استحکام پیدا کرنا ہے۔ اور استحکام کے لیے دیگر تفصیلات کا طے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے علاؤالدین نے دیگر تفصیلات بھی طے کرلی تھیں اور صارفین کو دوکانداروں اور غلہ کے سوداگروں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا تھا۔ اور پہلے ضابطے کے ساتھ دوسرے ضابطے بھی فوری طور پر جاری کردیئے۔

"غلہ منڈی" میں پہلے ضابطے کو پوری طرح عملدرآمد کرنے کے لیے نہایت قابل لیکن سخت ترین افسر مقرر کیے گئے ملک قبول الغ خان کو جو نہایت ہوشیار اور تجربہ کار ملک تھا "شحنہ منڈی" مقرر کیا گیا ہے زمین کے بڑے بڑے اقطاع دیئے گئے بہت سے سوار اور پیادے بھی دیئے گئے۔ الغرض اُسے نہایت بااثر اور طاقتور افسر بنا دیا گیا۔ ایک نہایت ہوشیار اور تجربہ کار شخص کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔ اور قابل "برید" بھی مقرر کردیا گیا۔

افسر خواہ کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں۔ جب تک غلہ کی سپلائی کا مناسب بندوبست نہ ہو۔ تو قیمتوں میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔ علاؤالدین نے غلہ کی سپلائی کے لیے تخت سے تیسرا ضابطہ جاری کیا کہ "سلطانی ذخیروں کے لیے بہت بڑی مقدار میں غلہ جمع کیا جائے۔ دوآب یا دریائے گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ) علاقے خالصہ (سرکاری) زمینوں سے خراج غلے کی شکل میں لیا جائے۔ زرعی اصلاحات کے تحت زمینوں کی پیمائش کے بعد خراج پچاس فیصد مقرر کیا تھا۔ اسلامی فقہ خاص کر ابوحنیفہ کے مکتب فکر کے نزدیک یہ خراج کی آخری حد ہے۔ اس سے زیادہ اسلامی ریاست میں کوئی وصول نہیں کرسکتا یہ نشان دہی یہاں پر اس لیے کہ اکثر مسلمان نقاد بھی علاؤالدین کے پچاس فیصد خراج وصول کرنے کو زیادتی سمجھتے ہیں غلہ سلطانی ذخیروں شہر دہلی میں جمع ہونا قرار پایا۔ یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ "غلہ جھائن اور اس کے مضافات میں بھی سرکاری ذخیرے قائم کئے جائیں۔ اس ضابطے کے تحت احکامات اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتے تھے۔ جب تک غلہ پیدا کرنے والوں غلہ خریدنے والوں سرکاری کارندوں اور غلہ ڈھونڈنے والے سوداگروں کے فرائض کی نشاندہی نہ کردی جاتی قیمتیں مقرر ہونے سے خاص کر

Marfat.com

غلہ کے سوداگروں کے لیے کسی منافع کی کشش باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے کاروبار میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ اس لیے علاؤ الدین نے چوتھا ضابطہ جاری کیا۔ جس کے تحت حکم دیا گیا کہ غلہ ڈھونڈنے والے سوداگروں کو شحنہ منڈی کی رعیت بنا دیا جائے۔

اور ان کے سرداروں کو زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ ان کے بیوی بچوں کو حراست میں لے لیا جائے۔ اور انہیں جمنا کے کنارے دیہات میں آباد کیا جائے۔ اور اس وقت ان کو نہ چھوڑا جائے جب تک غلہ ڈھونڈنے کے سلسلہ میں اپنے فرائض پورے نہ کریں۔ اس سلسلہ میں برنی رقمطراز ہے "ان ضابطوں کے سختی سے نافذ اور قائم ہونے کے بعد منڈی میں اتنا غلہ آنے لگا کہ سرکاری ذخیروں سے غلہ لانے کی ضرورت ہی نہ ہوئی تھی۔ اور غلہ کے نرخوں میں ایک جبہ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔"

غلہ ڈھونڈنے والے سوداگروں پر سختی بے جا ثابت نہ ہو سکتی تھی۔ اگر کسانوں اور سرکاری کارندوں کو تنبیہہ نہ کر دی جاتی۔ کہ وہ بھی اپنے فرائض ایمانداری سے ادا کریں۔ اس سلسلہ میں چھٹا ضابطہ (پانچویں ضابطے کی تفصیل ابھی آ رہی ہے۔) جاری ہوا۔ حکم تھا کہ سرکاری افسروں یعنی متصرفوں اور کارکنوں سے تحریری بیان لیا جاوے۔ جس کی رو سے وہ قافلہ والوں (یعنی سوداگروں غلہ) کو کھیتوں پر ہی کاشت کاروں سے غلہ دلوا دیں گے۔ کاشت کاروں کو سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ کہ وہ غلہ اپنے گھروں کو نہیں لے جائیں گے اور مقررہ نرخوں کے مطابق سرکاری افسروں کی موجودگی میں سوداگران غلہ کو اپنا غلہ فروخت کریں گے۔

اس سلسلہ میں بہت زیادہ سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ اور غلہ باقاعدگی سے سرکاری ذخیروں میں جمع ہونے لگا۔

غلہ کی سپلائی کو چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی متاثر کر سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں سلطان نے پانچواں ضابطہ جاری کیا۔ جس کے مطابق "احتکار" یعنی ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیدیا گیا۔ کوئی دوکان یا دفتر میں مقررہ وزن سے زیادہ غلہ نہیں رکھا جا سکتا۔ سوداگروں، دکانداروں، بقالوں، کسانوں، اور سرکاری افسروں کو سخت تنبیہہ کر دی گئی کہ کوئی "احتکار" یعنی ذخیرہ اندوزی نہ کریں۔ اور جو سرکاری حکم کے خلاف ورزی کرتا تو غلہ بحق سرکار ضبط کر لیا جاتا۔ اور احتکار یا ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو سخت ترین سزا بھگتنا پڑتی۔ نرخوں میں استقامت پیدا کرنے کے لیے احکام بالا کو اچھی طرح منڈیوں اور بازاروں کے معاملات کے مطابق باخبر رہنا چاہیئے۔ علاؤ الدین کو اس امر کا بخوبی احساس تھا۔ لہٰذا اس نے منڈیوں کے نرخوں کے استقامت اور دیگر معاملات کے متعلق باخبر رہنے کے لیے ساتواں ضابطہ جاری کیا۔ اور تین ذریعوں سے سلطان کو نرخوں اور بازار سے دوسرے معاملات کے متعلق خبریں پہنچتی تھیں۔ ایک "شحنہ منڈی ہر روز اپنی رپورٹ پیش کرتا تھا۔ اور دوسرے "برید" کا واقع نویس اپنی علیحدہ رپورٹ

Marfat.com

دیتا تھا۔ اور تیسرے سلطان کے ذاتی جاسوسوں کی رپورٹیں ہوتی تھیں۔ برنی لکھتا ہے "کہ اگر برید اور جاسوسوں کو رپورٹیں "شحنہ منڈی" کے بیان سے مختلف ہوئیں تو شحنہ منڈی کو وہ سزا دی جاتی تھی بس وہی جانتا تھا کہ" اس طرح سلطان کے باخبر رہنے سے کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ احکام منڈی کی تعمیل میں سوئی کی نوک کے برابر بھی فرق ہو جاتا۔ سلطان کے سخت رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ بارش اور قحط سالی میں نرخوں میں اتار چڑھاؤ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بقول برنی خشک سالی کے زمانہ میں ایک دو مرتبہ شحنہ منڈی نے جب عرضداشت پیش کی کہ نصف جیتل غلے کا بھاؤ بڑھ گیا ہے۔ تو مجرم کو لکڑی کی بیس ضربوں کی سزا دی گئی۔ خشک سالی کے زمانہ میں ہر محلہ کی آبادی کے لحاظ سے مناسب غلہ ہر محلہ کے بقالوں کو تقسیم کر دیا جاتا اور عام خریدار کو منڈی سے نصف من غلہ دیا جاتا تھا۔ غریبوں اور ضعیف لوگوں کا ہر لحاظ سے خیال رکھا جاتا۔ کوئی غلے سے محروم نہ رہتا لوگوں کے ہجوم میں اگر کوئی غریب یا ضعیف آدمی پاؤں تلے دب جاتا تو شحنہ منڈی کو سخت سزا ملتی۔

خشک سالی کے دنوں میں غلہ تقسیم کرتے کا ہر عام خریدار کو منڈی سے مناسب مقدار میں غلہ دینے کو آج کے ڈپو سسٹم کا راشن بندی سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ علاءالدین جدید دور سے دُور ہوتے ہوئے کتنا نزدیک تھا۔

روٹی کپڑا مکان موجودہ دور کے غریب عوام کے نعرے کے تین جز ہیں۔ روٹی کپڑا مکان کا مطالبہ علائی دور میں بھی شاید زوروں پر تھا۔ اشیاء خوردنی کی قیمتوں کے کنٹرول سے لوگوں کو اپنے پیٹ کا فکر نہ رہا۔ عام ارزانی اور فارغ البالی پیدا ہو گئی تھی۔ چراغ دہلوی کے ملفوظات کے مطابق یہ زمانہ نہایت ہی خوش حالی کا تھا۔ وہ تین تنکوں یعنی روٹیوں میں بڑی ضیافتیں نپٹائی جا سکتی تھیں۔ روٹی کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں ابھی بنیادی نقص باقی تھا۔ وہ یہ کہ غریب کسانوں کو اس سے نقصان تھا وہ اپنا غلہ یعنی سال بھر کی کمائی تو سرکاری مقررہ کردہ نرخوں پہ فروخت کرنے کے پابند تھے۔ لیکن دوسری چیزیں یعنی کپڑا وغیرہ خریدنے کی ان میں طاقت باقی نہ رہتی تھی علاءالدین غریب کسانوں کی اس بنیادی ضرورت یعنی کپڑے کو سستے نرخوں پر مہیا کرنے سے بے خبر نہیں تھا۔ لہذا کپڑے کی مارکیٹ معرض وجود میں آئی اور کپڑے کے نرخ مقرر ہوئے اس سلسلہ میں پانچ ضابطے جاری ہوئے۔ پہلے ضابطے کے مطابق بدایوں دروازہ کے نزدیک ایک ویران جگہ پر کپڑے کی مارکیٹ کا تعین کیا گیا۔ اور اس کا نام "سرائے عدل" رکھا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ ہر قسم کے کپڑے کی خرید و فروخت صرف سرائے عدل میں ہو۔ دوسرے شہروں سے جو کپڑا لایا جاتے وہ کسی کے گھر یا مکان میں نہ اتارا جائے۔ بلکہ سرائے عدل میں اتارا جائے اور جو اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس کا کپڑا بحق سرکار ضبط کر لیا جاوے گا۔ اور اس

Marfat.com

کا مالک جرمانہ اور دوسری سزاؤں کے مستوجب ہوگا۔ اس ضابطے کی وجہ سے ایک سو تنکہ تک بلکہ ہزار سے دس ہزار تنکہ تک کا سامان بھی سرائے عدل کے سوا کہیں اور نہیں اتارا جاتا تھا۔ دوسرے ضابطے کے مطابق مختلف قسم کے کپڑے کی قیمتیں مقرر ہوئیں۔ سرائے عدل فجر کی نماز سے لے کر عشاء کی نماز تک کھلی رہتی تھی۔

تیسرے ضابطے کے مطابق کپڑے کی مارکیٹ کا کنٹرول کرنے کے لیے "دیوان ریاست" قائم کیا گیا۔ دیوان ریاست میں کپڑے کے تمام سوداگروں کے نام لکھے گئے۔ اور ان سے تحریری معاہدے کئے گئے تھے کہ وہ اپنا کپڑا سرائے عدل ہی میں آکر سرکاری نرخوں کے مطابق فروخت کریں گے۔

چوتھے ضابطے کے مطابق خاص طور پر ملتان کے کپڑے کے سوداگروں سے تحریری معاہدہ کیا گیا کہ وہ دوسرے شہروں سے کپڑا لائیں گے اور سرکاری نرخوں کے مطابق سرائے عدل میں فروخت کریں گے حکومت نے ان سوداگروں کو بیس لاکھ تنکے خاص طور پر پیشگی ادا کیے۔ اس طرح ملتان کے سوداگروں کی دلجوئی کی گئی۔

اس سلسلہ میں بھی پانچویں ضابطے کے مطابق یہ حکم دیا گیا کہ قیمتی کپڑے بغیر دیوان ریاست کے پروانے یعنی اجازت کے بغیر نہیں خریدے جا سکتے۔ خاص طور پر یہ کپڑے مثلاً تبیج، تبریزی، زربفت مختلف اقسام زرنگار خز دہلی، کمخواب، ششتری، حریری، چینی، بھیرم، دیوگری۔ وغیرہ کی خرید پر پابندی لگادی گئی۔ غریب عوام تو یہ کپڑے خرید ہی نہیں سکتے تھے۔ امراء ہی ان کو خریدنے کے قابل تھے۔ یہ پابندی اس لیے لگائی گئی تھی۔ ایک تو طبقاتی احساس نہ بڑھے۔ اور دوسرے یہ خطرہ تھا کہ کوئی سرائے عدل سے سستے داموں کپڑا خرید کر باہر کے شہروں میں زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کا مرتکب نہ ہو۔

غلہ اور کپڑا کے نرخوں کا مقابلہ کرتے سے معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے کی نسبت غلہ سستا تھا۔ کپڑا غالباً اس لیے مہنگا تھا۔ کہ اس کی پیداوار کم تھی۔ اور پھر برنی نے زیادہ تر اعلیٰ کپڑوں کی قیمتیں درج کی ہیں۔ موٹا کھردرا کپڑا ایک تنکے یعنی ایک روپیہ کا بیس گز آجاتا تھا۔ اور غریبوں کو تن ڈھانکنے کا فکر علائی عہد میں نہیں رہا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، روٹی کپڑا مکان کا معروف نعرہ ہے۔ علائی عہد میں یہ نعرہ غالباً یوں تھا۔ روٹی کپڑا استحصان/استحصان سے مراد گھوڑا ہے۔ اس زمانے میں گھوڑے کی بہت زیادہ اہمیت تھی گھوڑے جنگوں میں استعمال ہوتے تھے۔ اور جس حکمران کے پاس گھوڑا سوار زیادہ ہوتے تھے۔ وہی طاقتور رہتا تھا۔ جنوبی ہندوستان کے ہندو راج مسلمانوں کی آمد سے پہلے گھوڑوں کی اہمیت جان چکے تھے۔ وہ عرب اور ایران سے بھاری رقوم خرچ کر کے گھوڑے منگواتے تھے۔ علائی عہد میں چونکہ منگولوں کے مسلسل حملوں کی وجہ

Marfat.com

سے تجارتی راستے بند ہو گئے تھے۔ عرب اور ایران سے گھوڑے نہیں منگوائے جا سکتے تھے۔ اس لیے علاءالدین نے گھوڑوں اور دیگر چوپاؤں کی قیمتیں بھی مقرر کر دیں۔

گھوڑوں اور دیگر جانوروں کی قیمتیں مقرر کرنے کے متعلق تخت سے چار ضابطے جاری کیے۔

پہلے ضابطے کے مطابق سرکاری لشکر میں استعمال ہونے والے گھوڑوں کی قسموں کے لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کیا گیا۔

دوسرے ضابطے کے مطابق گھوڑوں کے سوداگروں اور دلالوں کو بازار میں گھوڑوں کی خرید سے سختی سے منع کر دیا گیا۔ اور وہ گھوڑوں کی مارکیٹ کے نزدیک ٹھیک بھی نہیں لگتے تھے۔

تیسرا ضابطہ بھی سوداگروں اور دلالوں کی گوشمالی ہی کے متعلق تھا۔ سوداگر اور دلال ہیراپھیری سے باز نہیں آتے تھے۔ تو ان کی بازپرس سختی سے ہوتی تھی۔

چوتھا ضابطہ گھوڑوں کی قسم اور قیمت کی چھان بین کے متعلق تھا۔ اور اگر جنس اور قیمت میں اس کے نافذ کیے ہوئے ضابطوں سے کچھ فرق نکلتا تو بڑے بڑے دلالوں کو واجبی سزا دی جاتی اور وہ ایسی ہوتی کہ دوسروں کے لیے تنبیہ کا کام دیتی۔

دوسرے چوپایوں کے متعلق بھی اسی قسم کے ضابطے جاری ہوئے۔ الغرض علاؤالدین خلجی نے ہر قسم کی چیزوں کی قیمتیں مقرر کیں۔ یہاں تک کہ کلاہ (ٹوپی)، موزہ، کنگھی سوئی۔ گنا، سبزی، شوربہ، حلوہ صابون ریوڑی نان، مچھلی، چھالیہ اور گلاب کے پتوں کی قیمتیں مقرر کیں۔

قطع نظر اس کے پرائس کنٹرول سسٹم سارے ملک میں نافذ تھا یا نہیں۔ دہلی میں نافذ شدہ پرائس کنٹرول تقریباً چودہ پندرہ سال تک کامیابی سے چلتا رہا۔

پہلا سبب تو یہ تھا کہ پرائس کنٹرول پوری سوچ بچار کے ساتھ نافذ کیا گیا تھا۔ نافذ کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں پر بحث و تمحیص کر لی گئی تھی۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ جب قیمتیں ایک دفعہ مقرر ہو جاتیں ان میں تبدیلی پھر واقع ہرگز نہ ہونے پاتی۔ خشک سالی ہو یا قحط سالی لیکن کیا مجال کہ قیمتوں میں رد و بدل ہو۔ اگر کوئی تبدیلی ہوتی تو اس کے ذمہ دار بازاروں کے افسر ہوتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ایک دفعہ شحنہ منڈی ملک قبول نے سلطان کے سامنے گندم کی قیمت میں آدھ جیتل زیادہ ہونے کے متعلق اطلاع دی کہ شحنہ منڈی کو لکڑی کی بیس ضربیں لگائی گئیں یہ وہ افسر ہے جو ساری مارکیٹوں کا انچارج تھا اور جس کے تقرر کے وقت سلطان نے اپنے ہاتھوں سے جاگیریں دے کر اس کے اثر و رسوخ کو بڑھایا تھا۔ اور پھر وہ سلطان کے مقربین سے بھی تھا۔ انصاف

Marfat.com

ہو نو ا لیا ۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ بازار میں جتنے بھی افسر مقرر کئے گئے بے حد ایماندار اور انتہائی طور پر سخت تھے ۔ بعض مورخین نے اس سختی کو ظلم قرار دیا ہے ۔ علاء الدین اور اس کے افسروں کو ظالم قرار دیا ہے۔ یہ بالکل ناانصافی ہے ۔ سختی کرنا اور بات ہے ۔ ظلم کرنا اور بات ہے ۔ اور لوگوں سے قانون کی پابندی کرانا ظلم نہیں ہے تاریخ میں ظلم کی اصطلاح اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کہ ناجائز طور پر لوگوں کو تنگ کیا جائے ۔ پرائس کنٹرول سسٹم کے سلسلہ میں علاء الدین یا اس کے افسروں کا سختی کرنا ظلم نہیں تھا ۔ بلکہ یہ سب کچھ غریب عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ہو رہا تھا ۔ دوکانداروں ۔ دلالوں ، بقالوں اور تاجروں کو دھوکہ دہی فریب اور ہیرا پھیری سے سختی کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا جا سکتا تاریخ کا سبق ہے اس سلسلہ میں اگر نرمی برتی جائے تو قیمتوں میں بھی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا ۔

چوتھا سبب سلطان علاء الدین خلجی کا منڈیوں اور بازاروں پر ذاتی نگرانی تھی ۔ وہ منڈی کے تمام معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتا اور اس نے اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے وہ تین ذریعوں سے منڈی کے معاملات کے متعلق اطلاعات حاصل کرتا تھا ۔ ایک شحنہ منڈی ~ ہر روز اپنی رپورٹ منڈی کے تمام معاملات کے متعلق پیش کرتا ۔ دوسرا ذریعہ بریدوں کا تھا ۔ برید سرکار واقعہ نویس ہوتے تھے ۔ اور وہ بھی منڈی اور بازار کے نرخوں کے متعلق روزانہ سلطان کو اطلاع دیتے تھے تیسرا ذریعہ جاسوسوں کا تھا ۔ سلطان نے اپنے ذاتی جاسوس منڈیوں اور بازاروں میں چھوڑے ہوئے تھے ۔ وہ بھی سلطان کو روزانہ رپورٹ دیتے اگر بریدوں اور جاسوسوں کی رپورٹیں جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ شحنہ منڈی کے برعکس ہوتیں تو شحنہ منڈی کو سخت ترین سزا ملتی ۔ سخت سزا کے خوف سے شحنہ منڈی اپنے فرائض کی ادائیگی میں پوری طرح چوکس اور ایماندار رہتا ۔ علاوہ ازیں سلطان چھوٹے چھوٹے غلام بچوں کو بیس بیس دام دے کر بازار سے چیزیں خریدنے کے لیے بھیج دیتا تھا ۔ کوئی رپورٹ لاتا کوئی نان لاتا ۔ کوئی گوشت اور خربوزہ لاتا ۔ سلطان شحنہ منڈی کو بلاتا اور غلام بچوں کی لائی ہوئی چیزوں کا وزن اور قیمتوں کے لحاظ سے چھان بین کرتا اور اگر کوئی کمی بیشی ہوتی ۔ اور یقیناً ہوتی تھی ۔ کیونکہ دہلی کے دوکاندار ہیرا پھیری سے اور بچوں کو تول میں کم چیزیں دینے سے باز نہیں آتے تھے ۔ تو شحنہ منڈی کو تبا دیا جاتا ۔ شحنہ منڈی اسی وقت بازار میں چلا جاتا اور جو دوکاندار مجرم ہوتا اسے انتہائی سخت سزا دی جاتی ۔

پانچواں سبب یہ تھا کہ سرکاری حکام اور رعایا نے سلطان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا ۔ اگر سرکاری افسر اور عوام تعاون نہ کرتے تو سلطان کے سارے ضابطے اور ساری سختی بے اثر ہو کر رہ جاتی ۔ بہرحال

Marfat.com

ان سب اسباب کی بنا پر سلطان علاء الدین خلجی کا پرائس کنٹرول سسٹم نہایت ہی کامیاب رہا۔ اور تقریباً چودہ پندرہ سال کامیابی سے چلتا رہا۔

اگر آج بھی علاء الدین خلجی کی طرح سختی سے قیمتوں پر کنٹرول کیا جائے۔ چور بازاری ذخیرہ اندوزی کم تول اور ملاوٹ پر سخت ترین سزائیں دی جائیں اور بازار میں سخت ترین لیکن با اثر اور ایماندار افسر مقرر کیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قیمتوں میں استحکام پیدا نہ ہو۔

تمام مملکت میں حسب ذیل نرخ مقرر کیا گیا۔

ایک من گیہوں	۷ ½ جتیل	ایک من چنا	۵ جتیل
" " جو	۴ "	" " موٹھ	۳ "
" " چاول	۵ "	ایک سیر شکر تری	۱½ جتیل
" " ماش	۵ "	" " " (سرخ گڑھ)	½ جتیل
۲½ سیر گھی بھینس	۱ جتیل		
۳ سیر روغن کنجد	۱ جتیل		
۲½ من نمک	۵ جتیل		

عہد علائی کا من موجودہ وزن کے لحاظ سے ۱۲½ سیر کا تھا۔ ایک سیر موجودہ چھ چھٹانک تک کے برابر اور ایک جتیل تقریباً دو پیسہ یا ایک دھیلے کی قیمت کا اس لیے اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ ارزانی اور سلوک کے لحاظ سے عہد علائی میں ایک من (یعنی موجودہ ۴۰ سیر) گیہوں کی قیمت ۱۲ (بارہ آنہ ۳ رو پیہ سکہ انگریزی) تھی۔

طلباء کی آسانی کے لیے ضوابط و قواعد مجملاً بیان کر دیئے جاتے ہیں، تا کہ وہ ذہن نشین ہو جائیں۔

(۱) اہل بازار کو نرخ مہیا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے صرف بادشاہ نرخ مقرر کرے گا۔

(۲) ملک قبول الغ خان (جو انتظامی معاملات میں نہایت فراست رکھتا تھا، منڈی کا داروغہ یا شحنہ مقرر کیا گیا جس کا کام صرف یہ تھا، مقررہ نرخ میں کوئی تفاوت نہ ہونے دے۔

(۳) دو آب کے تمام خالصہ دیہات کی مالگذاری غلہ کی صورت میں وصول کی جائے۔ اور سلطنت کی طرف سے غلہ کے انبار محفوظ رہیں۔ اگر بازار کا غلہ کم ہو جائے تو شاہی غلہ کو بازار کے نرخ سے فروخت کریں۔

(۴) سلطنت کے تمام سفری غلہ فروشوں (بنجاروں) کو طلب کر کے ساحل جمن آباد پر آباد

Marfat.com

جائے اور ان سے معاہدہ لیا جائے کہ باہر سے غلہ منگوا کر شہر میں مقررہ نرخ سے فروخت کریں گے۔

(۵) غلہ جمع کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ اگر کوئی شخص غلہ جمع کرتا تو بحق سلطنت قرق کر لیا جاتا اور سخت تنبیہ کی جاتی ولایت دوآبہ کے افسران مال سے اقرار نامہ لیا جاتا۔ کہ کوئی شخص اس کے علاقہ میں غلہ جمع کرے۔

(۶) افسران مال (ریونیو) سے اقرار نامہ لیا گیا کہ وہ کھیتوں ہی پر بنجاروں سے قیمت ادا کر کے غلہ دیدیں۔ اور سوائے اپنے ضروری خرچ کے غلہ کا ایک دانہ بھی کوئی کاشت کار گھر نہ لے جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بنجاروں کو غلہ آسانی سے ملنے لگا اور بازار میں افراط ہو گئی۔

(۷) منڈی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے تین عہدہ دار مقرر کئے ایک شحنۂ منڈی دوسرے برید منڈی تیسرے جاسوس منڈی ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ بازار کے حال اور منڈی نرخ سے بادشاہ کو اطلاع دیتا۔ اگر ان اطلاعوں میں ذرا بھی تفاوت ہوتا شحنہ سے باز پرس کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی شخص مقررہ قواعد سے انحراف کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور تمام بازار کا بازار ایک مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اور حیرت یہ ہے کہ امساک باراں کے زمانہ میں کبھی غلہ کے نرخ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار قحط کے زمانہ میں شحنہ نے صرف نصف جتیل (ایک پیسہ) فی نرخ بڑھا دینے کی درخواست کی تو سلطان نے اکیس چوب اس کے ماریں۔

کوئی شخص ایک وقت میں روزانہ خرچ کے علاوہ نصف من سے زیادہ نہیں خرید سکتا۔ اگر قحط کی وجہ سے مساکین کا ہجوم زیادہ ہو جاتا اور ان کا کوئی معقول انتظام نہ ہوتا تو شحنہ کو سخت سزا دی جاتی۔ شہر کا ہر محلہ ایک بنجارے کے سپرد تھا۔ اور اس کا فرض تھا کہ وہ اس محلہ کے لوگوں کو روزانہ غلہ مہیا کرے۔

۸۔ سوداگران شہر و اطراف کے نام دفتر میں درج کئے گئے اور ان سے اقرار نامہ لیا گیا کہ اس قدر کپڑا اور اس قسم کا ہر مال لا کر سرائے عدل میں مقررہ نرخ پر فروخت کیا کریں گے۔

۹۔ اسی طرح کپڑے کا نرخ مقرر کیا گیا۔ اعلیٰ درجہ کا سوتی کپڑا ۲۰ گز فی تنکہ (نقرہ) اوسط درجہ کا سوتی کپڑا تیس گز فی تنکہ (نقرہ) فروخت کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی مناسبت سے اور تمام کپڑوں کی قیمت متعین کی گئی اس کے لئے اس نے ایک مکان سرائے عدل کے نام سے تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ یہاں صبح سے لے کر نماز عشاء تک دکانیں کھلی رہیں۔

۱۰۔ ملتانیوں (ملتان کے رہنے والے سوداگروں کو) بیس لاکھ تنکہ (نقرہ) خزانہ شاہی سے

Marfat.com

دیا گیا کہ اطراف ممالک سے کپڑا خرید کر کے لائیں اور نرخ مقررہ سے بازار میں فروخت کریں۔

۱۱۔ امراء وغیرہ میں سے جس کو نفیس اور قیمتی کپڑوں کی ضرورت ہو پہلے رئیس بازار کا پروانہ حاصل کرے یہ قید اس لئے لگائی تھی کہ سوداگر یہاں سے نرخ سلطانی ہزار زان کپڑا خرید کر کے باہر گراں قیمت پر فروخت نہ کر سکیں۔

۱۲۔ گھوڑوں کی قیمت ۲۰ تنکہ (نقرہ) سے بارہ تنکہ (نقرہ) تک مقرر کی گئی اور حکم دیا گیا کہ صرف بازار ہی میں نرخ مقررہ کے مطابق گھوڑوں کی خرید و فروخت ہو۔

۱۳۔ لونڈی غلاموں کی قیمت ۲۰۰ تنکہ (نقرہ) سے ۵ تنکہ (نقرہ) تک مقرر کی گئی۔

۱۴۔ الغرض اس نے گائے بھینس بکری اور بازار کی تمام چیزوں یعنی ٹوپی سے موزہ تک شانہ سے سوزن تک نیشکر سے سبزی تک ہریسہ سے شوربہ تک حلوائے صابونی سے ریوڑی تک ہر یانی سے روٹی تک پان پھول سے ساگ پات تک الغرض تمام ضروری اشیاء حتیٰ کہ ایک ندیم خاص کے کہنے پر شاید ان بازاروں تک کا نرخ مقرر کر دیا چنانچہ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ,, عہد طلائی میں مصری بحساب فی سیر دو جنیل شکر تری فی سیر ایک جتیل شکر سرخ فی سیر نصف جتیل نمک ۵ سیر فی جتیل فروخت ہوتا تھا،،

۱۴۔ بادشاہ صرف شحنہ وغیرہ کی اطلاع پر کفایت نہ کرنا بلکہ کمسن لڑکوں کو جن کا کوئی واقف نہ ہوتا دام دے کر بازار بھیجتا اور پھر ان چیزوں کا وزن کراتا اگر وزن یا قیمت میں خلاف وعدہ کوئی فرق ہوتا تو سخت سزا دی جاتی اور کمترین سزا یہ تھی کہ ناک کان کاٹ لیے جاتے یا جس قدر کم اس نے دیا ہے اتنا ہی گوشت اس کی ران یا کولہے سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا جاتا۔

الغرض علاؤالدین خلجی نے مستحکم اور عجیب و غریب انتظام بازار کا کیا کہ اس کی حالت میں پھر کوئی تغیر نہیں رہی ہو کبھی کسی نے قانون مقررہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۱۶۔ جب علاؤالدین بازار کا سارا انتظام کر چکا تو اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں حسب ذیل کر دی تھیں۔ سپاہی اول درجہ دو سو چونتیس تنکہ (تقریباً ۲۴ پونڈ طلائی چودہ انگریزی سکہ کے مطابق ماہوار کیا درجہ سوم ۷۶ تنکہ ماہوار، سپاہی درجہ سوم ۷۸ تنکہ ماہوار جس کے پاس دو گھوڑے ہوتے اس کو ۷۸ تنکہ اور زیادہ ملتا۔

سوال: اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد پر مفصل بحث کیجیئے۔

جواب: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں کسی صحابی کے باقاعدہ دعوت

Marfat.com

لے کر ہندوستان آنے کی صحیح اور مستند روایت نہیں ملتی ۔ البتہ آپ کی وفات کے چار پانچ سال بعد عہد فاروقی میں اس کی روایت موجود ہے ۔

عہد رسالت میں بحری اسفار

مگر اس بحث سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کرام کے بحری اسفار پر مختصر سی بحث کی جائے ، اور بتایا جائے کہ اس منکر ہیں اس حقیقت کا انکار کرنے میں ظاہر ہے کہ عرب کا ملک تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہوا ہے ، اور قدیم زمانہ سے عربوں میں غیر ممالک کا سلسلہ بحری راستوں سے جاری تھا ، اور ان کے تجارتی اور بحری اسفار مشرق میں چین تک اور مغرب میں روم تک جاری تھے ، اسی طرح عہد رسالت میں صحابہ کرام کے بحری اسفار کا تجارتی سلسلہ قائم رہا ، امام حسن بصری نے حضرت سمرہؓ سے روایت کی ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بحری تجارت کیا کرتے تھے"[1] ایک مرتبہ شکاریوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا "ہم لوگ سمندری سفر کرتے ہیں اور تھوڑا سا پانی اپنے ساتھ لے لیتے ہیں" اسے صحیح مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب ، مردار ، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت حرام قرار دے دی ہے ، تو اس وقت لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مردار کی چربی کے بارے میں کیا ارشاد ہے ، کیوں کہ اس کو کشتیوں چمڑوں اور چراغ میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ آپ نے فرمایا نہیں وہ بھی حرام ہے ۔

خطیب بغدادی نے موضح اوھام الجمع والتفریق میں مسلم بن ابی عمران اسلامی کے تذکرہ میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے "ایک عورت نے سمندری سفر کیا اور ایک مہینہ روزہ رکھنے کی نیت مانی لیکن اس کو پورا کرنے سے پہلے ہی وہ مرگئی اس کی بہن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے

---

[1] رحلۃ الصدیق نواب صدیق حسن خان ص ۷ ، طبع بمبئی ۔

Marfat.com

رو رہا کھو[۱]" ان چند احادیث اور عہد رسالت کے واقعات سے اس دور کے بحری سفر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نیز احادیث و سیر کی کتابوں میں عہد رسالت کے بحری اسفار کے تذکرے موجود ہیں چنانچہ نبوت کے پانچویں سال صحابہ کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلعم کے حکم و مشورہ سے بحری راستہ سے حبشہ ہجرت کی ۶ھ تا ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمری کو نامہ مبارک دے کر حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجا یمن کے قبیلہ اشعر کے تقریباً باون مسلمان مدینہ کے ارادہ سے بحری راستہ روانہ ہوئے اس زمانے میں مدینہ کی بندرگاہ جار تھی مگر ہوا کا رخ بدل جانے سے یہ لوگ حبشہ پہنچ گئے یہاں کے مسلمان مہاجرین نے ان کا استقبال کیا، اور غزوہ خیبر کے موقع پر ۷ھ میں ساتھ لیکر مدینہ پہنچے اور ان حضرات کو اہل السفینہ کا لقب دیا[۲]۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ یہ لوگ مرد عورت سمیت پچاس آدمی تھے اور یمن سے سوار ہو کر جدہ اترے " سمندری راہ سے کشتیوں میں چلے اور جدہ میں اترے[۳]" اس طرح لخم اور جذام کے تیس آدمیوں کے ہمراہ حضرت تمیم داری بحر روم کے سفر پر روانہ ہوئے مگر باد مخالف کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر ایک جزیرہ میں پہنچ گئے[۴]۔ اسلامی تاریخ میں صحابہ کرام کے بحری اسفار کے اور بھی تذکرے موجود ہیں نیز قرآن حکیم نے جگہ جگہ سمندروں میں جہازرانی کے پُرہول مناظر بیان کر کے عربوں کی مشرکانہ عقائد کو جھنجھوڑا ہے اور دعوت توحید دی ہے عہد رسالت کے اسفار میں بھی بحری اسفار اور جہازرانی کا ذکر موجود ہے ان شواہد و دلائل کے بعد ہندوستان میں صحابہ کرام کا آنا اس لیے مستبعد قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ بحری سفر نہیں کرتے تھے اور وہ جزیرۃ العرب کے ریگستانوں اور پہاڑوں کی حدود سے باہر نکلے تھے۔

عہد رسالت میں دعوت اسلام کی دو روایات

۶ھ کے آخر یا ۷ھ کے شروع میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب اور دوسرے علاقوں کے حکمرانوں کے نام تبلیغ اسلام کے دعوت نامے صحابہ کرام کے ذریعہ بھیجے تو عرب کے مشرقی علاقوں کے حکمرانوں کے نام بھی دعوت اسلام کے خطوط روانہ کئے عمرو بن العاص سہمی کو عمان میں جیفر اور عیاذ کے پاس سلیط بن عمروؓ کو یمامہ بن اثال کے پاس اور سلیط بن عمرو کو ہوذہ کے پاس۔ اور علاء بن حضرمی کو بحرین میں منذر بن ساوی عبدی کے پاس روانہ

---

[۱] ج ۲ ص ۲۹۶ [۲] صحیح مسلم باب فضائل اشعر [۳] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۴۸ [۴] صحیح مسلم ذکر دجال

Marfat.com

فرمایا۔ یہ سب مقامات ہندوستان کے سامنے واقع ہیں اور قدیم زمانے سے ہندوستان اور چین تک عرب تاجروں کی گذرگاہ رہے ہیں۔ لیکن ان کے آگے سمندر پار عہد رسالت میں کسی صحابی کے آنے کی مستند روایت نہیں ہے اور جو دو ایک روایتیں ہیں وہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ رہی ہیں حالانکہ ان ہی دنوں میں عمرو بن امیہ ضمریؓ کا حبشہ نامۂ مبارک لے کر جانے کی روایت احادیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہے پھر بھی ان غیر معتبر روایات کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا اس سلسلہ میں ہمیں اب تک صرف دو روائتیں مل سکتی ہیں پہلی روائت قنوج کے راجہ سرباتک کے پاس صحابہ دعوت اسلام لے کر گئے اور راجہ کے مسلمان ہونے کی ہے جسے حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں غیر مستند قرار دیا ہے۔

"سرباتک نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس حذیفہ اسامہ اور صہیب کو دعوت اسلام دے کر بھیجا۔ چنانچہ اس نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلعم کے نامہ مبارک کو بوسہ دیا[1] اس روایت کو نقل کر کے حافظ ابن حجر کہتے کہ ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں کہا ہے یہ کذب واضح اور کھلا ہوا جھوٹ ہے"

دوسری روایت سندھ میں پانچ صحابہ کرام کے آنے اور ان میں سے دو حضرات کے واپس جانے اور تین کے سندھ ہی میں انتقال فرمانے کی ہے۔ یہ روایت ایک قلمی مجموعہ میں جمع الجوامع کے حوالے سے نقل کی گئی ہے "روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سندھ کے باشندوں کے یہاں اپنے پانچ صحابہ کے ذریعہ اپنا نامہ مبارک بھیجا۔ جب یہ لوگ سندھ کے مقام نیرن کوٹ میں آئے تو وہاں کے بعض لوگوں نے اسلام قبول کیا اور پھر ان پانچ میں سے دو واپس چلے گئے اور باقی تین سندھ میں رہ گئے۔ سندھ کے لوگوں نے ان کی وجہ سے اسلام قبول کیا اور ...... ان کو اسلامی احکام سکھانے کے بعد میں یہ لوگ سندھ میں انتقال کر گئے اور ان کی قبریں ابھی تک وہاں موجود ہیں[2]"

جس قلمی مجموعہ یادداشت سے یہ روایت نقل کی گئی نہ تو وہ معتبر ہے اور نہ یہ معلوم کہ جمع الجوامع کون سی کتاب ہے۔ علامہ سیوطی کی جمع الجوامع میں اس قسم کی روایت مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ الغرض ۶ھ یا ۸ھ میں یا اس سے پہلے ہندوستان میں کسی صحابی کے دعوت اسلام لے کر آنے کی کوئی صحیح روایت نہیں ہے البتہ اس کے آٹھ نو سال بعد خلافت فاروقی کے ابتدائی دور میں عرب سے مسلمانوں کے ہندوستان آنے کی مستند روایت موجود ہیں اور اسی زمانہ میں باب الہند بحرین سے مسلمانوں کی رضاکارانہ فوج تھانہ (بمبئی) و بمبئی، بھڑواچ (گجرات) اور دیبل (سندھ) آئی اور جنوبی ہند کے بعض ساحلی مقامات پر کسی صحابی کے آنے کی جو روایت مشہور ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے غیر مستند ہے۔

---

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۔ [2] مجموعہ مہمات و رسائل مولوی بخاری قلمی ورق ص ۱۹

وصال نبوی کے چوتھے سال ہندوستان میں صحابہ کرام کی تشریف آوری

عرب کا مشرقی ساحل ساحلی علاقہ بحرین ہمیشہ سے چین اور ہندوستان کی تجارت کا مرکز تھا اس کے تمام علاقوں میں ہندوستان کے لوگ پھیلے ہوئے تھے اس کی مرکزیت اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ صلعم نے یہاں اپنے دو حکام مقرر فرمائے ایک حضرمی اور دوسرے حضرت ابان بن سعد بن عاصؓ ایک روایت میں ہے کہ علامہ حضرمی علاقہ ثقیف کے حاکم تھے اور ابانؓ علاقہ خط میں تھے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دور خلافت میں علامہ حضرمی کو دوبارہ وہاں کا حاکم مقرر کیا مگر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ان کی جگہ حضرت ابوہریرہؓ کو بحرین کی حکومت دی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علامہ کے زمانہ ہی میں حضرت ابوہریرہؓ کو یہ عہدہ دے کر ان کے ذمہ قضا اور نماز کی امامت کے ساتھ زکواۃ و خراج کی وصولی بھی کر دی گئی تھی ۔

بحرین کی مرکزیت یہاں ہندوستان کی کثرت اور ہندوستان سے تجارتی جہازوں کی آمد و رفت دیکھ کر حضرت ابوہریرہؓ کو تعجب نہیں کہ یہیں پر رسول اللہ صلعم کی بشارت یاد آگئی ہو اور ان ہی ایام میں آپ نے ہندوستان میں جہاد کرنے کی تمنا فرمائی ہو" حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہم سے رسول اللہ صلعم نے غزوہ ہند کا وعدہ فرمایا ہے اگر میں اس میں شریک ہو سکا تو اپنا جان و مال قربان کر دوں اگر اس میں کام آگیا تو بہترین شہیدوں میں ہونگا اور اگر واپس لوٹا تو نار جہنم سے آزاد ابوہریرہؓ رہوں گا۔ؔ

۱۵ھ میں تھانہ بھڑوچ اور دیبل پر حملہ

عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ ۹ھ میں طائف کے وفد ثقیف کے ساتھ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف براسلام ہوئے آپ نے ان کی صلاحیت کے پیش نظر ان کو طائف کا حاکم مقرر فرمایا اس وقت سے خلافت صدیقی اور خلافت فاروقی کی ابتدا تک آپ طائف کے حاکم رہے مگر حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ میں ان کو طائف کے بجائے بحرین اور عمان کا حاکم مقرر کیا یہ کئی بھائی تھے (۱) عثمان بن ابی العاصؓ (۲) حاکم بن ابی العاصؓ (۳) مغیرہ بن ابی العاصؓ (۴) اور حفص بن ابی العاصؓ ۔ عثمان نے بحرین اور عمان کی تولیت کے ابتدائی دور ہی میں اپنے بھائی حاکم کو طائف سے بلا کر بحرین بھیج دیا اور خود عمان پہنچ کر متطوعین اور فدائیان اسلام کی فوج تیار کی اور اس کی قیادت اپنے بھائی حکم کو دے کر ہندوستان روانہ کیا ۔ اس

لہ مسند محمد و حسن نسائی باب غزوہ الہند ۔

Marfat.com

مہم یہ تھانہ (بمبئی) اور بھڑوچ (گجرات) دونوں ساحلی مقامات پر حکم بن ابی العاصؓ نے اپنی فوج لے کر حملہ کیا۔ اور فتح پائی نیز عثمان نے اپنے دوسرے بھائی مغیرہ بن العاص کی زیر قیادت ایک رضا کارانہ بحری فوج دیبل (ٹھٹھہ سندھ) کی طرف روانہ کی جہاں سے اسلامی لشکر مظفر و منصور واپس ہوا۔

جب اسلامی لشکر ہندوستان سے واپس گیا تو حضرت عثمان ثقفیؓ نے امیرالمومنین حضرت عمرؓ کو اس کی پوری تفصیل دی، چونکہ حضرت عمرؓ اس فوج کشی سے بے خبر تھے اور اس سے پہلے بحری راستہ سے اسلامی فوج ادھر نہیں آئی تھی۔ اس لئے آپ نے عثمانؓ کے اس اقدام کو ناپسند فرمایا۔ اور تہدید آمیز خط لکھا تھا کہ اگر اس خطرناک اور غیر منظم مہم میں مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا۔ تو تمہارے قبیلہ ثقیف سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا۔ الغرض وصال نبوی کے چار سال بعد صحابہ کرام اسلام کی دولت لے کر ہندوستان تشریف لائے۔ اور اس سرزمین نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا ان مہمات کا تذکرہ مشہور مورخ بلاذری نے فتوح البلدان کے باب فتوح السند میں یوں کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا حاکم بنایا عثمان نے اپنے بھائی حکم کو بحرین روانہ کیا اور خود عمان پہنچ کر تھانہ کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کی اور لشکر واپس آیا تو حضرت عمرؓ کو لکھ کر اس کی اطلاع دی حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ اے ثقفی! تو نے گویا کیڑے کو لکڑی پر سوار کیا اور سمندر کے حوالہ کر دیا خدا کی قسم اگر مسلمانوں پر کوئی آفت آئی تو تمہاری قوم سے اس کا بدلہ لوں گا۔ نیز عثمانؓ نے اپنے بھائی حکم بھڑوچ روانہ کیا۔ اور ایک اور بھائی مغیرہ کو دیبل کی کھاڑی کی طرف روانہ کیا۔ جہاں انہوں نے دشمن سے مقابلہ کر کے فتح پائی۔[1]

عام تاریخوں میں ان حملوں کے بیان کرنے کی وجہ

تعجب ہے کہ عام مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی اس ابتدائی آمد اور یہاں کے تین مقامات پر ان کے حملہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں دیبل پر حضرت حکم ثقفی کا حملہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "دیبل سندھ کا ایک شہر بحر ہند کے ساحل پر ہے اور عثمان بن ابی العاص نے اپنے بھائی کو یہاں بھیجا جنہوں نے اسے فتح کیا[2] اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ علامہ بلاذری اپنے بیان میں تنہا نہیں ہیں بلکہ یاقوت حموی بھی ان کے ساتھ ہیں البتہ حموی نے اس سلسلہ میں صرف دیبل کا نام لیا ہے اور تھانہ اور بھڑوچ کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔

بہت سے مورخوں نے بلاذری ہی کے حوالے سے عثمان ثقفی کی پانچ چھ سال بعد کی مجاہدانہ سرگرمیوں

---

[1] فتوح البلدان ص۔ ۴۲۰ طبع مصر [2] معجم البلدان ج ۲ ص ۴۸۱ ذکر تو الدیبل

Marfat.com

اور فتوحات کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ خود بلاذری نے اسی فتوح البلدان میں کور فارس و کورہ مان کی فتوحات کے بارے میں عثمان کی بحرین و عمان کی تقرری کا بیان کرتے ہوئے تھانہ بھڑوچ اور دیبل پر حکم کے فوج کشی کرنے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ بحری راستہ سے فارس کی مہم کا تذکرہ کیا ہے، حضرت عمرؓ نے عثمان بن ابی العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا حاکم بنایا تو انہوں نے ان دونوں مقامات کو زیر کر کے مقامی باشندوں کو مطیع کر لیا اور اپنے بھائی حکم کو براہ سمندر فارس کی مہم پر روانہ کیا۔[1]

حموی اور دوسرے مورخوں کے ان حملوں کے تذکرے نہ کرنے کی وجہ یہی ہے کہ بالکل متطوعانہ اور غیر منظم جھڑپ تھی کوئی مستقل فوج کشی اور جنگ نہیں تھی جسے حضرت عمرؓ نے بھی ناپسند فرمایا اور کوئی اہمیت نہ دی، بلکہ شدت سے منع فرمایا اسی طرح امام ابن عبدالبر نے بھی استیعاب میں عثمان بن ابی العاص کے ۱۵ھ بحرین اور عمان کے حاکم بنائے جانے کا تذکرہ کر کے لکھا ہے کہ عثمان خود تو عمان چلے گئے اور اپنے بھائی حکم کو بحرین بھیجا اس کے بعد حکم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا، بلکہ عثمان کے ۲۱ھ میں فارس کے شہر توج پر حملہ کرنے کا ذکر ہے" اور خود تو عثمان توج گئے اور اسے فتح کر کے آباد کیا اور وہاں کے ایرانی حاکم شہرک کو قتل کیا یہ واقعہ ۲۱ھ ہے[2]

معلوم ہوتا ہے ۱۵ھ سے ۲۰ھ تک خود عثمان نے کوئی جنگی سرگرمی نہیں دکھائی بلکہ ۲۱ھ میں پہلا حملہ اس نے توج پر کیا۔ اور اس میں اپنے بھائی حکم سے بھی مدد لی، چنانچہ حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عثمان نے اپنے بھائی حکم کو عمان سے بحری مہم پر روانہ کیا اور انہوں نے فارس کے شہر برکان کو فتح کر کے توج کا رخ کیا[3]

عثمان ثقفیؓ کی طرف سے ان کے بھائی حکم اور مغیرہ کی زیر قیادت ہندوستان کے تین ساحلی مقامات پر جو ہنگامی حملہ ۱۵ھ میں ہوا اس کی مثال ایسی ہے جیسے خلافت صدیقی کے ابتدائی دور میں حضرت مثنی بن حارثہ شیبانیؓ حدود فارس پر جیرہ کی طرف سے اور حضرت سوید بن قطبہ عجلی ابلہ کی راہ سے حملہ آور ہوتے تھے اور پھر صحراؤں پر چھا جاتے تھے[4] اور جس طرح ان دونوں حضرات کی ان ہنگامی یلغاروں اور وقتی حملوں کا مفصل حال اسلامی تاریخوں میں نہیں ملتا اسی طرح حکم اور مغیرہ کے ہندوستان پر ان بحری حملوں کا ذکر بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان طائف اور اس کے قبیلہ بنو ثقیف کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا کہ اس نے ہندوستان

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۵۲ [2] الاستیعاب برحاشیہ اصابہ ج ۲ ص ۴۰ [3] معجم البلدان ج ۲ ص ۴۷۷

[4] الاخبار الطوال دینوری ص ۱۱۰ طبع مصر۔

Marfat.com

کو اپنی دینی اور روحانی توجہ کا مرکز بنا کر جب بھی اسے اقتدار ملا اس طرف رخ کیا۔ عہد فاروقی میں حضرت عثمان ثقفی نے بحرین و عمان کی گورنری پاتے ہی اپنے دو بھائیوں حکم اور مغیرہ کو یہاں اسلام کی برکت لے کر روانہ کیا اور اموی دورِ حکومت میں حجاج بن یوسف ثقفی نے عراق کی گورنری پا کر اپنے جوان سال بھتیجے محمد بن قاسم کو خلافت کے زیر اہتمام باقاعدہ اسلامی فوج کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا۔

حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادۂ ثقیف کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے جس کا ہندوستان کا ہر فرد تقریباً محسن ہے۔ حضرت ابو عبداللہ عثمان بن ابی العاص بن بشر بن عبد وھمان بن عبداللہ طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے ہیں ۹ھ میں طائف کے وفد کے ساتھ رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ارکان وفد میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس لئے لوگوں نے انہیں ڈیرے پر سامان کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا۔ جب وہ لوگ دوپہر میں آ کر سوئے تو آپ چپکے سے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر مشرف با اسلام ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے رہے اگر رسول کریم صلعم کو آرام فرماتے دیکھتے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابی بن کعب سے قرآن پڑھتے رسول اللہ صلعم ان کی اس بات سے بہت خوش ہوئے اور جب تمام ارکان وفد کھل کر اسلام لائے تو عثمان نے بھی اپنا اسلام ظاہر کر دیا۔ رسول اللہ صلعم نے ان کو اپنی طرف سے طائف کا حاکم بنایا خلافت صدیقی میں اپنے منصب پر رہے پھر حضرت عمرؓ نے ان کو بحرین اور عمان کی گورنری کے لئے طلب کیا پہلے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے حاکم بنایا ہے میں اسے ہٹا نہیں سکتا۔ مگر جب لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ اپنی طرف سے کسی کو طائف کا حاکم مقرر کر لیں چنانچہ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ان کو بلایا کہ انہوں نے اپنے بھائی حکم کو اپنا نائب مقرر کیا اور بحرین و عمان کی گورنری سنبھالی پھر جلدی حکم کو اپنے پاس بلا کر ہندوستان اور ایران کی مہمات پر روانہ کیا اور خود ایران میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر بہت سے مقامات فتح کئے۔ آخر میں بحرین و عمان سے معزول ہونے کے بعد بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بصرہ میں جس جگہ آپ رہتے تھے اسے شط عثمان کہا جاتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی دینی خدمات پر بارہ ہزار جریب کا ایک ٹکڑا جاگیر میں دیا صحاح اور سنن میں آپ کی احادیث و روایات موجود ہیں۔ حضرت معاویہ کے زمانے میں بصرہ میں انتقال ہوا۔

Marfat.com

حضرت حکم بن ابی العاص ثقفی

حضرت حکم بن ابی العاص بن بشرؓ کی کنیت ابوعثمان یا عبدالملک ہے صحابی رسول ہیں بڑے بہادر اور شان دار آدمی تھے اپنے بھائی عثمان ثقفی کی طرف سے بحرین کی گورنری سنبھالی اور ایران و عراق میں اسلامی فتوحات کیں۔ اپنی قیادت میں فدائیان اسلام کی ایک جماعت لے کر ۱۵ھ میں تھانہ اور بھڑوچ گئے تھے آپ اپنے بھائی عثمان کے ساتھ بصرہ میں آباد ہو گئے تھے۔

حضرت مغیرہ بن العاص

حضرت عثمان ثقفی کا حقیقی بھائی اور ان کی دینی اور ان کی اسلامی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔ آپ نے اپنے بھائی عثمان کی طرف سے دیبل (کراچی) پر فدائیان اسلام کو لے کر کامیاب فوج کشی کی ایک روایت ہے کہ آپ سندھ میں فوت ہوئے اور یہیں دفن ہوئے مگر یہ روایت معتبر نہیں ہے۔

حضرت حفص بن ابی العاص

آپ بھی حضرت عثمان ثقفیؓ کے حقیقی بھائی ہیں۔

خلافت راشدہ میں ہندوستان سے تعلقات

۱۵ھ میں ہندوستان پر غیر منظم بحری حملہ کے بعد عہد فاروقی میں کسی مہم کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ حضرت عمرؓ اس مہم کے سخت خلاف تھے اور بغیر مکمل تیاری کے اور پوری معلومات کے ہندوستان کے طول طویل بحری سفر کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے حضرت عثمان ثقفیؓ نے پہلے کے بعد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ پانچ چھ سال بعد ایران کے علاقوں میں مجاہدانہ سرگرمی کی اور اپنے بھائی کو بھی اس طرف لگایا گیا۔

عہد فاروقی میں سندھ اور مکران کی حدود تک براہ خشکی مجاہدین اسلام کے قدم آگے نہ بڑھے جب حضرت عثمانؓ کا دور خلافت آیا تو آپ نے ہندوستان کی طرف توجہ فرمائی اور حضرت عمرؓ کی محتاط روش کی روشنی میں عراق کے حاکم عبداللہ بن عامر کریز کے ذریعے حضرت حکیم بن جبلہ عبدی کو ہندوستان کے سرحدی مقامات کے سیاسی اور ملکی حالات اور جہاد کے امکانات

Marfat.com

معلوم کرنے کے لئے یہاں بھیجا۔ مگر یہاں کے حالات جہاد کے لئے مناسب نہ تھے اس لئے مزید کوئی کاروائی نہیں کی۔ حضرت علیؓ کا دور خلافت آیا تو آپ نے ۳۸ھ کے ابتدا میں حارث بن مرہ عبدی کو اجازت دی کہ وہ متطوعین کی ایک جماعت لے کر ہندوستان کا رخ کریں چنانچہ حارث بن مرہ عبدی نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر حملہ کیا اور مال غنیمت پایا۔ مگر بعد میں قیقان (کیکان، قلات) کے ایک معرکہ میں حارث بن مرہ اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ یہ ۴۲ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ خلافت میں ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور بنوں پر فوج کشی کی اس کے بعد عبداللہ بن سوار عبدی نے قیقان پر حملہ کر کے گزشتہ شکست کا بدلہ لیا۔ اور فتح پائی۔ نیز حضرت معاویہ کا زمانہ میں زیاد بن ابی سفیان نے سنان بن سلمہ بن محبق ہزلی کو مکران کی طرف روانہ کیا جہاں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اس دوران میں زیاد نے راشد بن عمر ازدی کو مکران بھیجا اور راشد نے قیقان کو فتح کر کے کرچ ڈاکوؤں کا قلع قمع کیا ہے[1]

الغرض عہد فاروقی کی ابتدا سے حضرت امیر معاویہ کے زمانے تک ہندوستان اور عرب کے تعلقات کی نوعیت وقتی معرکہ آرائی اور غالب ومغلوب کی رہی جن میں خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام اور تابعین عظام نے حصّہ لیا۔ ظاہر ہے کہ ان مہمات میں بزم نبوت کے حلقہ نشینوں کے مبارک قدم اس ملک میں آئے ہوں گے۔

حضرت عثمانی میں سندھ پر مہم

حضرت عثمان بن عفانؓ خلیفہ ہوئے اور عبداللہ بن عامر کو انہوں نے عراق کا گورنر بنایا اور کے پاس یہ حکم تھا کہ وہ سرحد کی جانب کسی ایسے شخص کو بھیجے جو وہاں کے صحیح حالات معلوم کرے اور واپس آکر خلیفہ کو خبر دے۔ تو عبداللہ نے حکیم بن جبلہ عبدی کو روانہ کیا۔ جب حکیم ہند سے واپس گیا تو اسے حضرت عثمانؓ کے پاس عبداللہ نے بھیج دیا حضرت عثمانؓ نے اس سے ہندوستان کے شہروں کا حال دریافت کیا تو حکیم نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین میں نے وہاں کے حالات سے بہت اچھی طرح واقفیت حاصل کی ہے اور خوب تحقیقات کی اور وہاں کے لوگوں کو فرمایا آپ نے فرمایا۔ تفصیلی حالات بیان کر حکیم نے کہا ہندوستان میں پانی تھوڑا ہے۔ اور

---

[1] تفصیلات کے لیے فتوح البلدان فتوح سندھ ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

کھجوریں ردی ہیں۔ اور وہاں بیٹھے دلیر ہیں۔ اگر لشکر کم ہو تو تباہ ہو جائے گا اور اگر آپ ہو تو بھوکا مر جائے گا۔ حضرت عثمانؓ نے اس سے فرمایا تو حالات بیان کرتا ہے یا تنگ بندی کرتا ہے۔ کہا نہیں حضور صحیح حالات بیان کرتا ہوں۔ آپ نے سکوت اختیار فرمایا اور وہاں کسی کو لڑنے کے واسطے نہیں بھیجا۔

عہد علی مرتضیٰ میں سندھ پر مہم

جب ۳۸ھ کا آخر اور ۳۹ھ کا آغاز ہوا تو حضرت علی کے عہد خلافت میں حارث بن مرہ عبدی بہ نیت ثواب رضاکارانہ طور پر حضرت علیؓ کی اجازت سے سرحد کی جانب روانہ ہوئے چنانچہ اس نے فتح نصرت حاصل کی۔ اور بہت کچھ مال غنیمت اور قیدی اسکے ہاتھ آئے۔ چنانچہ اس نے ایک دن میں ایک ہزار قیدی تقسیم کئے پھر علاقہ قیقان (قلات) کی طرف بڑھا وہاں مقابلہ سخت ہوا اس میں حارث اور اس کے تمام ساتھی بجز چند آدمیوں کے قتل ہو گئے۔ ۴۲ھ میں یہ واقعہ ہوا۔

عہد امیر معاویہ میں سندھ پر مہم

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت ۴۴ھ اس سرحد پر مہلب بن ابی صفرہ نے حملہ کیا اور بنہ اور الاہوار تک آیا۔ یہ دونوں شہر ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں دشمن اس کے مقابل ہر۔ اور مہلب بن صفرہ اور اس کے ساتھیوں سے جنگ کی۔ مگر وہ ناکام رہے بلا و قیقان میں اٹھارہ دم تراشیدہ گھوڑوں پر سوار مہلب سے ملے انہوں نے مہلب سے جنگ کی۔ اور سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔ عبداللہ بن عامر گورنر عراق نے حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں عبداللہ بن سوار کو سندھ کا گورنر بنایا اور کہا جاتا ہے کہ خود معاویہ نے اپنی طرف سے عبداللہ و سرحد ہند کا گورنر بنایا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن سوار نے قیقان پر حملہ کیا اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔ پھر عبداللہ امیر معاویہ کے پاس شام حاضر ہوا۔ اور قیقانی گھوڑے تحفہ میں پیش کئے اور کچھ عرصہ ان کے پاس قیام کیا پھر قیقان کی جانب واپس چلا آیا۔ تو اس مرتبہ قیقانیوں نے ترکوں سے فوجی کمک طلب کی اور ترکوں نے اس کو قتل کر دیا۔

زیاد بن ابی سفیان نے امیر معاویہ کے زمانے میں سنان بن سلمہ محبق ہذلی کو سندھ کا والی بنایا۔ سنان بڑا فاضل اور خدا پرست آدمی تھا وہ پہلا شخص ہے جس نے لشکر کو طلاق کی قسم دلائی یعنی

Marfat.com

ہر سپاہی سے قسم لی۔ کہ اگر وہ جنگ میدان سے بھاگے تو اس کی بیوی پر طلاق۔ چنانچہ سنان سرحد ہند پر آیا اور مکران کو بزور شمشیر فتح کیا اور اس کی آبادی میں توسیع کر کے اسے شہر بنا دیا۔ اور وہیں قیام اختیار کیا اور تمام بلادِ سندھ کا نظم و نسق قائم کیا۔

ابن کلبی کہتا ہے کہ جس شخص نے مکران فتح کیا وہ حکیم بن جبلہ عبدی تھا۔ پھر زیاد نے سرحد ہند میں پھر قوم سید سندھ کے بحری قزاقوں پر حملہ کیا اور اسی حملہ میں قتل ہو گیا اور سنان بن سلمہ نے فوج کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر زیاد نے اس کو سرحد ہند کا گورنر بنا دیا دو سال تک یہاں قیام کیا۔ عباد بن زیاد نے سندھ پر جستان کی جانب سے حملہ کیا چنانچہ سنارود آیا پھر وہاں حوی کھر پر رود بار تک اور علاقہ سیستان میں ہندمند تک قبضہ کر لیا۔ پھر کش میں اترا اور وہاں سے ریگستان کو طے کر کے قندھار آیا۔ اہل قندھار سے لڑا اور ان کو شکست دی اور میدان جنگ سے بھگا دیا۔ تھوڑے سے مسلمانوں کی شہادت کے بعد قندھار فتح کر لیا۔ پھر زیاد نے منذر بن جارود عبدی کو سرحد ہند کا گورنر بنایا اس نے بوقان اور قیقان پر حملہ کیا۔ اور مسلمانوں نے فتح پائی۔ مال غنیمت حاصل کیا اور فوجی دستے ان کے شہروں میں پھیلا دیئے۔ اور قصدار کو فتح کر لیا تھا۔ مگر قصدار نے عہد شکنی کی تھی۔ اس لیے دوبارہ فتح کیا قصدار ہی میں منذر نے وفات پائی۔

پھر عبیداللہ بن زیاد نے ابن قری باہلی کو والی بنایا اور سرحد ہند پر روانہ کیا۔ اس نے سندھ میں فتوحات حاصل کیں اور مال غنیمت حاصل کیا۔ مورخین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ عبداللہ بن زیاد نے سنان بن سلمہ کو گورنر بنایا تھا اور ابن حری اس کے فوجی دستوں پر سردار تھا۔

عہد عبدالملک

جب حجاج بن الحکم ابن ابی عقیل ثقفی عبدالملک کی جانب سے عراق کا والی ہوا تو اس نے سعید بن اسلم بن زرعہ کلابی کو مکران اور اس کی سرحد ہند کا گورنر بنایا جب سعید مکران پہنچا تو معاویہ بن حارث علافی اور محمد بن حارث علافی اس کے مقابلہ پر نکلے لڑائی ہوئی سعید قتل ہو گیا اور علافی تمام سرحدی علاقہ پر قابض ہو گئے پھر حجاج نے مجاعہ بن سعر تمیمی کو اس سرحد کا گورنر بنایا۔ مجاعہ نے یہاں آ کر جنگ کی اور مال غنیمت حاصل کیا۔ اور قندابیل کے بہت سے حصوں کو بھی فتح کیا پھر محمد بن قاسم نے اس فتح کی تکمیل کی۔ مجاعہ ایک سال بعد مکران میں وفات پا گیا۔

پھر حجاج نے مجاعہ کی وفات کے بعد محمد بن ہارون نمری کو مکران پر حاکم بنایا اس کی حکومت کے

Marfat.com

زمانہ میں جزیرہ یاقوت سرندیپ کے بادشاہ نے حجاج کے پاس چند مسلمان عورتیں بطور تحفہ بھیجیں جو اس کے ملک میں مسلمان پیدا ہوئیں تھیں اور ان کے باپ دادا سوداگری کرتے تھے۔ اور ان کا وہیں انتقال ہو گیا تھا اور اس نے ان کے ذریعہ حجاج سے تقرب حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کشتی میں یہ عورتیں سفر کر رہی تھیں اس کو دیبل کے بحری قزاقوں کے ایک گروہ نے چھوٹی چھوٹی جنگی کشتیوں میں سوار ہو کر گھیر لیا اور کشتی کو معہ سامان اور عورتیں پکڑ لیا ان میں قبیلہ یربوع کی ایک عورت نے یا حجاج کہہ کر آواز دی۔ حجاج کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے بے ساختہ یا لبیک ہاں میں آیا اور فوراً سندھ کے راجہ داہر کے پاس قاصد بھیجا اور عورتوں کے چھوڑنے کا مطالبہ کیا راجہ داہر نے جواب دیا کہ ان عورتوں کو تو دریائی ڈاکوؤں نے پکڑا ہے جن پر میرا قابو نہیں آپ ہی ان کی خبر لیں حجاج یہ سن کر برافروختہ ہو گیا اور اس نے عبیداللہ بن نبہان کو معہ مختصر سپاہ کے دیبل پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا عبیداللہ اس مہم میں قتل ہو گیا پھر حجاج نے بدیل بن طہفہ کو جو حاکم عمان تھا حکم لکھا کہ وہ دیبل روانہ ہو جائے لیکن جب وہ جزیرہ یاقوت پہنچا اور دشمن سے مقابلہ ہوا تو اس کا گھوڑا بدکا اور اس کو گرا دیا۔ دشمن نے اس کو گھیر لیا اور مار ڈالا۔ بعض مورخین نے لکھا کہ اسے بدھ مذہب کے جاٹوں نے قتل کیا ادھر عبدالملک ۸۶ھ میں فوت ہوا اور ولید تخت نشین ہوا۔

عہد ولید بن عبدالملک

حجاج نے ولید بن عبدالملک سے اجازت لے کر اپنے چچا زاد بھائی اور داماد محمد بن قاسمؒ بن عقیل ثقفی جو اس وقت شیراز میں تھا اس کو حکم دیا کہ وہ جلد جائے اور فوج لیکر سندھ پر حملہ آور ہو، محمد بن قاسم کے مقدمۃ الجیش (ہراول) پر ابوالاسود جہم بن زحر ثقفی کو قائد مقرر کیا۔ چھ ہزار سپاہی شام کے لشکر سے اور ان کے علاوہ بہت سے کار آزمودہ لوگ اس کے لشکر کے ساتھ شریک کر دیئے اور تمام ضروری سامان مہیا کیا گیا۔

محمد بن قاسم شیراز سے چل کر مکران پہنچا چند روز یہاں قیام کیا پھر قنزپور آیا اس کو فتح کیا پھر ارمائیل پہنچا اسے بھی فتح کیا (محمد بن ہارون بن ذراع، محمد بن قاسم سے آملا۔ اور لشکر میں شامل ہو گیا اور اس کے ہمراہ روانہ ہوا۔ لیکن ارمائیل کے قریب ہی اس کا انتقال ہو گیا اور قنبیل میں دفن کر دیا گیا۔ پھر محمد بن قاسم ارمائیل سے روانہ ہوا۔ جہم بن زحر جعفی اس کے ہمراہ تھا جمعہ کے روز دیبل پہنچے اور

ؔ ہندوستان پر محمد بن قاسم کے حملے کے بارے میں پہلے ذکر گذر چکا ہے یہاں سابقہ مضمون کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے اجمالی طور پر محمد بن قاسم کے حملے کا ذکر کیا جا رہا ہے گو مضمون کا اعادہ ہے مگر سود مند۔

Marfat.com

وہ کشتیاں بھی پہنچ گئیں جن پر براہ سمندر توپیں، سامان اور ہتھیار بھیجے گئے تھے محمد بن قاسم نے دیبل پر اترتے ہی لشکر گاہ کے چاروں طرف خندق کھدوائی جن کے کناروں پر نیزے گاڑ دیئے اور ان پر پھریرے اڑا دیئے اور لوگوں کو ان کے جھنڈے کے نیچے ٹھہرایا گیا۔ عروس نامی منجنیق نصب کی گئی۔ اس منجنیق میں پانچسو آدمی کام کرتے تھے دیبل میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ اس بدھ کے مندر کے برج پر ایک لمبی بلی لگی ہوئی تھی۔ اس بلی پر ایک سرخ جھنڈا تھا۔ یہ جھنڈا اتنا لمبا چوڑا تھا کہ جب ہوا چلتی تو تمام شہر کو گھیر لیتا اور گھومنے لگتا۔

انتظام بریلہ

ہر تیسرے روز حجاج کے خطوط محمد بن قاسم کے پاس آتے تھے اور محمد بن قاسم کے خطوط اس جانب کے حالات اور طریق کار کے بارے میں حجاج کی رائے معلوم کرنے کے لئے اس کے پاس جاتے تھے۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا خط آیا اس میں لکھا تھا کہ جہاں اترو وہاں گرد خندق کھود لیا کرو۔ اور اکثر شب بیدار رہو۔ ہمیشہ تلاوت قرآن میں مصروف رہو دعا کرو۔ اور ذکر حق کرتے رہو۔ عروس نامی منجنیق کو مندر کی سید صد میں نصب کرو۔ اور اس کا ایک پایہ جو مشرق کی جانب ہو چھوٹا کرو تاکہ دوسری جانب بڑا ہو جائے اور پتھر بہت اونچا پھینکا جا سکے اور عروس کے چلانے والے کو بلاؤ اور حکم دو کہ اس تاک کر نشانہ بنائے جس کا تم نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ منجنیق کے چلانے والے نے بھی بلی پر نشانہ مارا۔ اور اس کو توڑ دیا کفار اس سے بھڑک اٹھے پھر محمد بن قاسم نے ان پر چڑھائی کی۔ وہ بھی جوش میں آکر حلقہ سے باہر نکل آئے مقابلہ ہوا۔ محمد بن قاسم نے دیبل والوں کو شکست فاش دی حتی کہ میدان سے بھگا دیا۔ اور انہوں نے قلعہ میں جا کر دم لیا۔ محمد بن قاسم نے سیڑھیوں کے لگا دینے کا حکم دیا چنانچہ قلعہ کی دیواروں پر سیڑھیاں لگا دی گئیں اور بہادر سپاہی سیڑھیوں پر چڑھ گئے سب سے پہلے چڑھنے والا اہل کوفہ میں قبیلہ مراد کا ایک شخص تھا۔

سنہ ۹۳ھ میں قلعہ دیبل بزور شمشیر فتح ہو گیا تین روز تک برابر محمد بن قاسم مسلح اور جنگجو اہل قلعہ کو قتل کرتا رہا۔ داہر کا حاکم دیبل سے بھاگ گیا۔

Marfat.com

محمد بن قاسم نے فتح کے بعد مسلمانوں کو دیبل میں زمینیں تقسیم کیں۔ ایک مسجد تعمیر کی چار ہزار مسلمانوں کو وہاں آباد کیا اور دیبل کو عساکر اسلامیہ کے لئے ایک فوجی مرکز بنا دیا۔ اور اس کے بعد ہارون ابن ابو خالد مروزی سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا، مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ قتل کر دیا گیا۔

مورخین نے بیان کیا ہے کہ محمد بن قاسم دیبل سے نیرون آیا اور اہل نیرون نے اس سے قبل اپنے دو سادھو حجاج کے پاس بھیجے تھے اور صلح کر لی تھی۔ لہذا انہوں نے محمد بن قاسم کے لئے رسد مہیا کی اور اس کو شہر میں لے گئے سالانہ زر صلح بھی ادا کیا محمد بن قاسم جس شہر سے گزرتا تھا اس کو فتح کر لیتا۔ حتی کہ دریائے سندھ کے ساتھ جو نہر تھی اسے عبور کیا یہاں پہنچ کر سربیدس کے سادھو آئے اور باشندگان سربیدس کی جانب سے صلح کر لی تھی اور ان پر خراج مقرر کیا۔ اور وہاں سہبان کی جانب روانہ ہوا اور اس کو فتح کیا پھر دریائے سندھ کی جانب رخ کیا اور اس کے درمیانی حصہ پر اترا۔ داہر کو اس کی خبر پہنچی اور اس نے محمد بن قاسم کے مقابلہ کی زبردست تیاریاں شروع کیں۔

محمد بن قاسم نے محمد بن مصعب ثقفی کو سوار فوجی دستوں کے ساتھ ہندوستان (سیوستان) بھیجا۔ اہل سدوستان نے امن اور صلح طلب کی سادھوؤں کی ایک جماعت نے فریقین کے درمیان سفارت کی خدمت سر انجام دی۔ چنانچہ محمد بن مصعب نے ان کو امن و امان دی اور ان پر خراج مقرر کیا۔ اور بغرض اطمینان ان سے کچھ معزز آدمی بطور ضمانت طلب کئے اور چار ہزار جاٹوں کو ساتھ لے کر محمد بن قاسم کی فوج میں شامل ہو گئے اور ہندوستان پر ایک شخص کو حاکم مقرر کر دیا پھر محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی تدبیر کی۔ کیونکہ داہر نے سارے پل اٹھا لئے تھے چنانچہ اس کے علاقہ کے پاس خود پل باندھ کر دریائے سندھ کو عبور کیا۔ راسل ہندوستان کے علاقہ کچھ کا بادشاہ تھا۔ داہر محمد بن قاسم کو حقیر سمجھتا تھا اور اس کی جانب سے بالکل بے پرواہ تھا آخر کار محمد بن قاسم اور عساکر اسلامیہ کا داہر سے مقابلہ ہوا داہر ہاتھی پر سوار تھا ہاتھیوں کا ایک دستہ اس کے چاروں طرف تھا ٹھاکر راجپوت بھی بڑی تعداد میں اس کے ہمراہ تھے دونوں فریق ایسی سخت لڑائی لڑے کہ اس سے پہلے ایسی لڑائی کبھی نہیں سنی گئی تھی یہاں تک کہ داہر پیادہ پا ہو گیا اور خوب جان توڑ کر لڑتے لڑتے شام کے وقت ۱۰ رمضان ۹۳ھ کو قتل ہو گیا۔ روایتی کی روایت کے بموجب جس شخص نے داہر کو قتل کیا وہ قبیلہ بنو کلاب کا ایک شخص تھا۔

داہر اور اس کے قاتل کا مجسمہ بروص (بھڑوچ) میں بنا ہوا تھا۔ اور بدیل بن طہفہ کا مجسمہ قند میں ہے اور اس کی قبر دیبل میں ہے علی بن محمد مدائنی ابو محمد ہندی سے نقل کرتے ہیں کہ

Marfat.com

ابوالفرح نے بیان کیا کہ جب داہر قتل کر دیا گیا تو محمد بن قاسم تمام بلاد سندھ پر غالب آ گیا۔ ابن کلبی نے بیان کیا ہے کہ جس نے داہر کو قتل کیا ہے وہ قاسم بن عبداللہ بن حصن طائی ہے۔

مورخین کہتے ہیں محمد بن قاسم نے راور کو بزور شمشیر فتح کیا۔ قلعہ راور میں داہر کی بیوی پناہ گزین تھی۔ اس کو خوف ہوا کہ وہ پکڑی نہ جائے۔ لہٰذا اس نے خود کو مع اپنی لونڈیوں اور تمام مال و متاع کے جلا دیا۔

پھر محمد بن قاسم پرانے برہمن آباد آیا۔ یہ منصورہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ان دنوں میں منصورہ نہ تھا بلکہ اس کی جگہ جھاڑیاں تھیں۔ داہر کی شکست خوردہ فوج اس برہمن آباد میں تھی لہٰذا انہوں نے محمد بن قاسم سے سخت جنگ کی بالآخر محمد بن قاسم نے برہمن آباد کو بزور شمشیر فتح کیا اور آٹھ ہزار فوجی سپاہیوں کو قتل کیا اور کہا جاتا ہے کہ چھبیس ہزار اور اپنا عامل وہاں قائم مقام چھوڑ دیا۔ محمد بن قاسم برہمن آباد سے راور اور بعزور کے قصبے سے روانہ ہوا۔ راستہ میں اہل ساوندری آ کر ملے اور انہوں نے امان کی درخواست کی مہمانی اور رہبری کی ان سے شرط کی یعنی جس وقت عساکر اسلامیہ اس طرف سے گزریں توان کی رسد کا انتظام کرنا اور دشمن کے علاقہ میں ان کی رہبری کرنا ان کے ذمہ ہے۔ اہل ساوندری آج کل مسلمان ہیں پھر بسمد کی طرف بڑھا۔ اہل بسمد نے بھی اہل ساوندری کی طرح ان ہی شرائط پر صلح کی محمد بن قاسم بڑھتے بڑھتے راور تک پہنچ گیا یہ سندھ کے بڑے شہروں میں سے ہے اور ایک پہاڑی پر واقع ہے چند ماہ تک اہل راور کا محاصرہ جاری رکھا آخر کار اس شرط پر بطور صلح فتح کیا کہ محمد بن قاسم نہ توان کو قتل کرے گا۔ اور نہ ان کے مندر سے تعرض کرے گا مصنف یہ بدھ مت کا عبادت خانہ ہے بالکل اسی طرح جیسے عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے کنیسے اور آتش پرستوں کے آتش کدے۔ اہل راور پر خراج مقرر کیا اور ایک مسجد تعمیر کی اور وہاں سے سکھر کی جانب سوار ہوا یہ دریائے بیاس کے ورے ایک شہر ہے محمد بن قاسم نے اس کو بھی فتح کیا پھر دریائے بیاس کو عبور کر کے ملتان پہنچا اہل ملتان نے اس سے مقابلہ کیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ زائدہ بن عمیر طائی نے خوب اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے مشرکین کو میدان جنگ میں شکست ہوئی تو بھاگ کر شہر میں گھس گئے اور قلعہ کے دروازے بند کر لیئے محمد بن قاسم نے اہل ملتان کا محاصرہ کیا محاصرہ بہت طویل ہو گیا مسلمانوں کے توشے سامان خورد و نوش ختم ہو گیا جب کچھ نہ رہا تو گدھے ذبح کر کے کھا گئے آخر کار ایک شخص امان لے کر مسلمانوں کے پاس آیا اور اہل ملتان جو پانی پیتے تھے اس کے داخل ہونے کی جگہ راستہ سے آگاہ کیا یہ پانی بسمد سے آتا تھا اور شہر کے اندر بڑے حوض میں جمع ہوتا تھا محمد بن قاسم نے اس پانی کے راستے

Marfat.com

کو کاٹ کر بند کرایا جب وہ پیاسے رہنے لگے تو انہوں نے مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے چنانچہ محمد بن قاسم نے لڑنے والوں کو قتل کیا اور ان کے بیوی بچوں کو قید کرلیا اور بدھ مندر کے پجاری جو چھ ہزار تھے گرفتار کرلئے اور بہت سا سونا مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ تمام اموال غنیمت ایک کوٹھری میں جمع کیے گئے جو دس گز آٹھ گز تھی۔ اس کی چھت میں ایک روشن دان کھلا ہوا تھا تمام اموال جو اس میں امانت رکھے جاتے سب اسی روشن دان سے ڈالے جاتے تھے اس لئے ملتان کا نام "سونے کی کوٹھری" پڑگیا۔ ملتان کا بدھ مندر اتنا بڑا مندر تھا کہ اس کیلئے اموال کے تحفے لائے جاتے تھے منتیں مانی جاتی تھیں اہل سندھ اس کے حج کے لئے آتے تھے طواف کرتے تھے سر اور داڑھیاں اس کے پاس منڈواتے تھے اور کہتے تھے کہ جو بت اس کے اندر ہے وہ حضرت ایوب علیہ السلام ہیں۔

۹۵ھ میں حجاج کا انتقال ہوگیا تو محمد بن قاسم کے پاس اس کی وفات کی خبر آئی لہٰذا ملتان ہی سے راور اور بغرور کی جانب واپس چلا ان دونوں قلعوں کو پہلے فتح کرلیا تھا۔ یہاں آکر لوگوں کو تنخواہیں دیں پھر محمد بن قاسم کیرج آیا تو راس دولسر داہر مقابلہ کے لیے نکلے لڑائی ہوئی دشمن کی فوج نے شکست کھائی داہر بھاگ گیا کہا جاتا ہے کہ قتل کردیا گیا اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے محمد بن قاسم نے حسب دستور قاتلین کو قتل کیا اور بچوں عورتوں کو گرفتار کیا

۹۶ھ میں خالد بن ولید بن عبدالملک نے وفات پائی اور سلیمان بن عبدالملک اس کی جگہ خلیفہ ہوا تو اس نے صالح بن عبدالرحمان کو عراق کے خراج پر گورنر بنایا اور یزید بن ابی کبشہ سکسکی تو سندھ پر تو یزید نے محمد بن قاسم کو معاویہ بن مہلب کے ساتھ گرفتار کرکے بھیجا[۱]

اہل ہند محمد بن قاسم کی گرفتاری پر بہت روئے اور کیرج میں اس کا مجسمہ بنایا صالح نے محمد بن قاسم کو واسط میں قید کرایا صالح بن عبدالرحمن کے خاندان ابوعقیل کے اور لوگوں کے ساتھ محمد بن قاسم کو سخت تکالیف پہنچائیں۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کرایا حجاج نے صالح کے بھائی آدم کو قتل کیا تھا اس کے انتقام میں محمد بن قاسم کو صالح نے قتل کیا۔

عہد بنی عباس

جب بنو عباس کا دور شروع ہوا تو اس وقت منصور بن جمہور مغربی سندھ کا علاقہ قندابیل اور دیبل وغیرہ کا حاکم تھا۔ اس زمانہ میں خلافت عباسیہ کی طرف سے ابو مسلم خراسانی مشرقی ممالک کا نگران تھا

---

[۱] ابن خلدون جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۶۶

Marfat.com

اس نے سندھ کی ولایت کے لئے ابومسلم عبدالرحمٰن بن مسلم مغلس عبدی کو مامور کیا وہ فوج لے کر دیبل پہنچا یہاں منظور کلبی نے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ یہ سن کر منصور فوراً آگے بڑھا منصورہ کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا مغلس عبدی کو شکست ہوئی وہ گرفتار ہو کر ۱۳۳ھ میں قتل کیا گیا۔ ابومسلم خراسانی نے یہ روداد سن کر موسیٰ بن کعب تمیمی کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ سندھ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اس نے منصور کو شکست دی وہ فرار ہوا اور صحرا میں پیاس کی شدت سے جان دی اس طرح ۱۳۴ھ میں سندھ کی حکومت خلافت عباسیہ کے زیر اقتدار آئی۔

موسیٰ پہلا عباسی امیر سندھ تھا۔ کچھ دنوں یہاں مقیم رہا۔ فاتحانہ سرگرمیاں دکھائیں اور اپنے بیٹے عیینہ کو اپنا قائم مقام بنا کر عراق واپس گیا عیینہ کامیاب حکمران ثابت نہیں ہوا۔ ملک کے مقیم عرب باشندوں میں قبائلی جنگ شروع ہو گئی قحطانی اور نزاری قبیلے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اس نے سب کو قتل کرایا پھر اس کے خلاف بعض سازشیں بھی رہیں بالآخر خلیفہ منصور عباسی نے ۱۴۲ھ میں میں عمر حفص کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا عیینہ بغاوت پر آمادہ ہوا۔ عمر بن حفص نے کامیاب پیش قدمی کی اور امان دے کر منصورہ پر قبضہ کیا عیینہ کو گرفتار کر کے دارالخلافہ بھیج دیا لیکن وہاں پہنچنے سے قبل راہ میں قتل کر دیا گیا۔

عمر بن حفص کا دور حکومت کئی حیثیتوں سے اہم ہے اسی کے عہد حکومت میں شیعی اور خارجی دونوں فرقوں کے مبلغین سندھ میں وارد ہوئے۔ شیعہ فرقہ کی طرف سے عبداللہ بن محمد معروف عبداللہ الاشتر ابن النفس الذکیہ مدعی خلافت میں وارد ہوا۔ عمر بن حفص نے چشم پوشی کی۔ اس طرح وہ خود سندھ میں شیعیت کی تحریک کے فروغ پانے میں معاون بنا ۱۵۱ھ میں خلیفہ المنصور عباسی کو حضرت عبداللہ الاشترہ کے حالات معلوم ہو گئے اس نے ان کی گرفتاری کا حکم بھیجا اس حکم کی تعمیل میں ایک دوسرے فدائی کو الاشتر کا نام دے کر یہاں سے دارالخلافت بھیجا گیا۔ جو وہاں قتل کیا گیا۔

منصور کو اس واقعہ کی بھی آگاہی ہوئی اس لئے اس نے اس کو سندھ کی ولایت سے ہٹا کر افریقہ کے بڑے صوبہ کی ولایت پر مامور کر دیا اور سندھ کی ولایت کا پروانہ ہشام بن عمرو تغلبی کو دیا جس نے ۱۵۱ھ میں یہاں آ کر زمام حکومت سنبھال لی۔

منصور عباسی نے ہشام کو بھی عبدالاشتر کی گرفتاری کا حکم بھیجا مگر درپردہ یہ بھی سادات کا ہم نوا تھا اس نے بھی ان کی گرفتاری سے اغماض کیا مگر اس کے بھائی شفیع بن عمرو تغلبی نے اچانک

Marfat.com

ان کے رستہ کو دیکھ لیا اور حملہ اور ہو کر قتل کر ڈالا۔ ہشام نے ان کے اہل و عیال اور محمد بن عبداللہ معروف بہ ابن الاشتر کو منصور عباس کے پاس بھیج دیا جس نے اس کو مدینہ منورہ کے عامل کے سپرد کر دیا اگرچہ حضرت عبداللہ الاشتر نے سندھ ہی میں جام شہادت نوش کیا مگر تشیعیت کے اثرات فنا نہ ہو سکے اس کے بعد ہشام تغلبی نے توسیع مملکت کی فکر کی اور بھروچ ملتان اور گندھار کو قبضہ میں لایا۔

پھر وہ ۱۵۸ھ میں رخصت لیکر وطن گیا اور وہیں فوت ہوا سندھ کی ولایت پر معبد بن خلیل تمیمی کو مامور کیا گیا اس نے ۱۵۹ھ میں وفات پائی روح بن حاتم مقرر کیا گیا اسی سال واپس بلالیا گیا اس کی جگہ بسطام بن عمر کو دی گئی مگر ۱۶۰ھ یا ۱۶۱ھ میں وہ بھی طلب کر لیا گیا۔ اور روح بن حاتم کو دوبارہ بھیجا گیا مگر چند ہی مہینوں میں اس کی ناکامی ظاہر ہوئی تو نصر بن محمد بن اشعث خزاعی والی سندھ ہو کر آیا مگر وہ بھی اسی سال واپس بلالیا گیا اور سندھ کی زمام سلطنت ایک ہاشمی محمد بن سلیمان بن علی کے ہاتھ دی گئی جس نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو اپنا نائب بنا کر بھیجا جو اس سے پہلے بھی بحری حملہ میں آچکا تھا مگر اس کی نیابت بھی قائم نہ رہ سکی اور نصر دوبارہ مقرر ہو کر آیا۔ پھر زبیر بن عباس اس عہدہ پر بھیجا گیا اس کے بعد صحیح بن عمر تغلبی کے ہاتھوں میں سندھ کی ولایت سپرد کی گئی۔ اس دور میں یہاں تمیمی وحجازی نزاع شباب پر پہنچ گیا تو نصر بن محمد بن اشعث تیسری مرتبہ یہاں والی ہو کر آیا اور ۱۶۱ھ سے ۱۶۴ھ تک کامیاب حکمرانی کر کے فوت ہوا۔

خلیفہ مہدی نے اپنی غلام لیث بن طریف کو اس عہدہ پر مامور کیا مگر سندھ میں داخلی بدامنی کا دور دورہ ہو گیا تھا اس کو فرو کیا تو جاٹوں نے منظم بغاوت کی خلیفہ مہدی لشکر بھیج کر لیث کی مدد کی ۱۶۵ھ میں یہ بغاوت فرو ہوئی اس کے بعد ہارون الرشید کی خلافت کا دور آیا اس نے ۱۷۰ھ میں سالم یونسی کو والی بنا کر بھیجا اس نے چار سال حکمرانی کی اسکے بعد ۱۷۴ھ میں اسحاق بن سلیمان ہاشمی آیا وہ اسی سال وفات پا گیا تو اس کا لڑکا یوسف بن اسحاق اس کا قائم مقام بنا۔

اس کے بعد خلیفہ ہارون الرشید نے طیفور بن عبداللہ بن منصور کو والی بنا کر بھیج دیا اور ملک میں قبائلی لڑائی پھر شروع ہو گئی تو جابر بن اشعث طائی آیا اس کی ناکامی پر سعید بن سلیم بن قتیبہ مقرر کیا گیا اس نے اپنے بھائی کثیر بن مسلم کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا تو مزید بدامنی پیدا ہوئی اس لیے عیسیٰ بن جعفر بن منصور عباسی کو اس ولایت کی مہم سپرد ہوئی اس نے محمد بن عدی تغلبی کو اپنا قائم مقام بنایا اس نے سندھ میں ناکامی کے بعد ملتان کا رُخ کیا۔ وہاں بھی ناکام رہا تو عبدالرحمن یہاں کا والی بنا کر بھیجا۔ پھر ایوب بن جعفر بن سلیمان آیا ان پے درپے ناکامیوں کے بعد ہارون الرشید

Marfat.com

کی نگاہ انتخاب آل مہلب پر اٹھی اور اس نے ۱۸۴ھ میں داود بن یزید بن صالح مہلبی کو سندھ کی عنان حکومت دی۔ داؤد مہلبی نے پہلے مغیرہ کو اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ سندھ میں ان دنوں عربوں کی قبائلی خانہ جنگی برپا تھی۔ مغیرہ نزاریوں کو مطیع کرنے میں ناکام رہا۔ اور ان واقعات کی اطلاع داؤد کے پاس بھیجی تو وہ خود سندھ آیا اور اپنی سخت گیریوں سے سندھ سے نزاریوں کی طاقت کا خاتمہ کیا وہ تقریباً ۲۰ سال تک امن وامان سے حکومت کرتا رہا۔ ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں اس کی وفات کے بعد مامون نے اس کے بیٹے بشیر کو یہاں کی سند ولایت بھیجی اور دس لاکھ درہم و ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ خراج مقرر کیا۔ بشیر چند سال حکمرانی کرتا رہا۔ مگر پھر خراج کا بھیجنا بند کردیا اور اطاعت سے انحراف کیا۔ تو مامون نے پہلے ۲۱۱ھ/۸۲۶ء میں حاجب بن صالح کو بھیجا۔ بشیر نے اس کو شکست دی تو ۲۱۳ھ/۸۲۸ء میں عثمان بن عباد مہلبی اور اس کے بھائی محمد بن عباد کو سندھ کے معاملات درست کرنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے آکر ۲۱۳ھ/۸۲۸ء میں سندھ کو اپنے اقتدار میں لے لیا۔ یہاں کے معاملات کو یکسو کر کے وہ بشیر کو ساتھ لیکر بغداد چلا گیا پھر موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمک کو والی بنا کر بھیجا۔ جو ۲۲۱ھ تک رہا۔ اس کے بعد عمران بن موسیٰ معتصم کے عہد میں آیا واثق باللہ نے ۲۲۷ھ میں ایتاخ ترکی کو والی مقرر کیا۔ متوکل کے عہد میں ہارون بن ابی خالد مروزی کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا۔ مگر حجازیوں کے ایک گروہ عمر بن عبدالعزیز ہباری نے سندھ پر اقتدار حاصل کر لیا[1]۔ اور خالد کو قتل کرا دیا اور متوکل کو درخواست اپنی ولایت کے لیے دی۔ خلیفہ نے منظور کر لی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ مگر حالات بگڑتے گئے جو عرب قبائل یہاں آباد ہوئے تھے۔ وہ باہم دست وگریباں ہوگئے حکومت کمزور ہوگئی۔ ہندو راجاؤں نے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اب طرف دو حکومتیں قائم ہوگئیں ایک کا دارالسلطنت منصورہ تھا دوسری کا ملتان تھا۔ عرب خاندان سندھ میں آباد ہوگئے جیسے بنو بنہ (ملتان میں) ہباری قریشی منصورہ میں بنو ثقف بھکر الور میں ان کا علاقہ بنی تمیم آل مغیرہ۔ عباسی صدیقی فاروقی عثمانی اسفرنی۔ بنو اسد۔ بنو عتبہ سادات وغیرہ ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہوگئے۔ صدیوں یہ سندھ میں رہنے سہنے شادی بیاہ کرنے سے ان کی اصل عربی معاشرت میں فرق آگیا۔ اور آہستہ آہستہ وہ مخلوط معاشرت کے خوگر ہوگئے اور پھر خاندان کے نام سندھی تلفظ میں ایسے ہوگئے کہ شناخت مشکل ہوتی۔ ابتدائے عہد میں ولاۃ سندھ کی طرف سے کے بڑے بڑے قطعات مثلاً صوبہ تحصیل وغیرہ ان خاندانوں کو ٹیکس وصول کرنے اور انتظامی

۱؎ تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۴۹۴ و عہد اسلامی کا ہندوستان ص ۱۷

Marfat.com

امور کے انجام دہی کے لئے سپرد کیے گئے جس پر وہ نسل بعد نسل بطور وراثت قابض رہے۔ سندھ کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان میں سے قریش کا ایک خاندان نے اپنی حکومت قائم کر لی اس خاندان کا پہلا حاکم عمر بن عبدالعزیز ہباری موکوز الذکر ہو کر جو سنہ ۲۷۰ھ میں سندھ کا خود مختار حاکم بنا اور تئیس برس حکومت کرکے وفات پائی سنہ ۳۰۰ھ میں فاطمی حکومت قائم ہوئی تو عبداللہ المہدی کی طرف سے داعی ابوالقاسم بن خرج کا بھائی ہیثم نامی سندھ میں ان کا پہلا داعی بن کر آیا اور فاطمی حکومت کی دعوت میں مصروف ہو گیا۔ سندھ کے سومرہ نام قبیلہ نے سنہ ۳۷۰ھ میں اسماعیلی دعوت قبول کر لی۔ سنہ ۴۰۱ھ میں محمود غزنوی نے اسماعیلی حکومت کا خاتمہ کیا۔

سوال۔ عرب اور ہند کے مابین آمد و رفت کی قدیم بری اور بحری راہوں کی نشان دہی کیجیے

جواب:-

سندھ اور ہندوستان عربوں کی نظر میں

سندھ اور ہند عربوں کے نزدیک دو الگ الگ ملک تھے جو ان کے مشرق میں سمندر پار پڑتے تھے۔ سندھ کا ملک ہندوستان کرمان اور سجستان وغیرہ کی حدود نے گھیرا ہوا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کا ملک پڑتا تھے۔ جو مشرق میں چین کی حدود سے ملتا تھا۔ اور عرب دونوں ملکوں کو ملا کر ہند بھی بولتے تھے جس طرح تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور اب پھر ایک ملک ہندوستان کے تقریباً یہی دونوں علاقے بھارت اور پاکستان کے دو نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اور پرانی تاریخ کے مطابق دو الگ الگ ملک ہو گئے ہیں قدیم ترین عرب جغرافیہ نویس ابن خردادبہ نے بلاد سندھ میں ان شہروں کو شمار کیا ہے

قیقان (کیکان قلات) بنہ (غالباً بنوں) مکران۔ میدہ۔ قندھار۔ گندھارا قصدار۔ بوقان قندابیل قیزبور۔ ار ل۔ دیبل (قریب کراچی) قنبلی۔ کنبایا (کھا ت) سہبان۔ سدوستان۔ راسک۔ رود الور (ساوندری)، مولتان، سندان (سنجان بمبئی) مندل سیلمان (بھیلان گجرات) سرست کیرج۔ مد۔ مانی (پالی۔ جوناگڈھ) دیہج (گجرات) بروص (بھڑوچ)

واضح رہے کہ ان شہروں کے ناموں میں ترتیب میں التزام نہیں ہے بلکہ صرف ملک سندھ

---

۵۷ المسالک والممالک ص ۵۷

کے تمام شہروں کے دیئے گئے ہیں عام طور سے ان حدود کے باشندوں کو عرب سندھی سمجھتے اور کہتے تھے۔ سندھ شاہان فارس کے اثر و اقتدار کے باعث رہا کرتا تھا کہ یہاں کے راجے مہاراجے ان کے باج گزار اور فرماں بردار ہوتے تھے اور ضرورت کے وقت وہ یہاں سے فوج کے لئے آدمی بھی لیتے تھے ایران کے بادشاہ اردشیر نے سندھ کے مہاراجوں کو اپنی طرف سے خاص خاص القاب سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ اس نے قفص شاہ۔ مکران شاہ۔ قیقان شاہ قسیران شاہ سے سندھ کے ان مہاراجوں کو نوازا تھا جو یہاں حکمران تھے اور اس کے ماتحت تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے حلقہ میں ذاتی نام کے بجائے اپنے لقب سے مشہور تھا[1]

عربوں کی تقسیم کی رو سے سندھ کے بعد ہندوستان کا ملک آتا تھا جو حدود چین تک چلا گیا تھا اور سندھ و ہند کے درمیان ساحل کی جانب قامہل نامی شہر تھا۔ یہ مقام غالباً بیکانیر جیسلمیر یا جونا گڑھ کی اطراف میں کہیں تھا جہاں سندھ اور ہندوستان کی سرحدیں ملتی تھیں۔ یاقوت حموی لکھتا ہے "قامہل سندھ کے بعد ہندوستان کی شروع سرحدیں واقع ہے اور چیمور سے قامہل تک ہندوستان ہے اور قامہل سے مکران بدھ اور ملتان کی حد کے نیچے تک پورا علاقہ سندھ میں شامل ہے اور سندھ کے شہر منصورہ اور قامہل کے درمیان آٹھ مرحلہ کا فاصلہ ہے اور قامہل سے کھمبایت تک تقریباً چار مرحلے ہیں[2]۔

قامہل اور چیمور (بمبئی) کے درمیانی علاقہ سے مراد گجرات ہے جسے یاقوت حموی نے ہندوستان کا علاقہ بتایا ہے اس نے اسکے کے ساحلی علاقہ کو جس میں کوکن ملیبار۔ معبر۔ اور اس کے آگے کلہ شلاہٹ (سلہٹ) قمار اور مملکت مہراج وغیرہ شامل ہیں ان کو مراد نہیں ہے

ابن خرداذبہ نے ہندوستان کے سواحل اور ان کے اطراف وجوانب کے راجوں مہاراجوں کے یہ القاب بتائے ہیں۔ بلھرا۔ جابہ۔ طافن۔ ملک جزر۔ غابہ۔ رہمی۔ ملک قامرون۔ ملک زانج (فتحب) اور مہراج۔ فارس کے بادشاہ اردشیر نے ہندوستان کے مہاراجوں کو بھی اپنے لقب سے نوازا تھا۔ چنانچہ یہاں کے ایک راجہ کو ریحان شاہ کا لقب دیا[3]۔

دورِ رسالت میں عربوں کا تعلق سندھ اور ہند کے ان ساحلی علاقوں سے تھا اور وہ عام طور سے ان مقامات پر آتے جاتے تھے اور یہاں کی اشیاء و اشخاص اور اقوام سے اچھی

---

[1] المسالک والممالک ص ۱۸ [2] معجم البلدان ج ۷ ص ۸ [3] المسالک والممالک ص ۱۶ و ۱۷

Marfat.com

طرح واقف تھے اور ان مقامات کے رہنے والے بھی ذاتی طور سے یا ان سنا کر عربوں سے واقف تھے۔

ہندوستان اور عرب کے درمیان بحری اور ساحلی راستے

عرب کا ملک جنوبی ایشیا میں واقع ہے شام میں ملک شام مشرق میں فرات اور بحر ہند کا ایک حصّہ اور مغرب میں بحر احمر ہے جبل سراۃ کا سلسلہ کوہ یمن سے بادیہ شام تک پورے ملک کو مغربی اور مشرقی حصتوں پر تقسیم کرتا ہے۔ مغربی حصّہ میں جبل سراۃ سے بحر احمر کے ساحلی علاقہ کو غور کہتے ہیں۔ اور تہامہ ،عبرہ ، مشرقی عراق اور سماوہ کے علاقہ کو نجد کہتے ہیں۔ غور اور نجد کے درمیان جو علاقہ حد فاصل کے طور پر واقع ہے اسے حجاز کہتے ہیں پھر نجد۔ مشرقی خلیج عربی یمامہ ، البحرین ، اور عمان کے علاقہ کو عروض کہتے ہیں اور حجاز کے بعد جنوب تک کے علاقہ کو یمن کہتے ہیں۔

ملک عرب کے تمام باشندے دو طبقوں میں منقسم تھے ایک اہل مدر اور دوسرے اہل وبر۔ اہل مدر وہ لوگ ہیں جو آبادیوں میں رہتے تھے ان کے پاس کھیتی باڑی نخلستان ہوتے، بھیڑ بکری، اونٹ تجارت غرضکہ کسب ومعیشت معقول ذرائع تھے۔ اور وہ اپنے دور کے تمدن کی زندگی بسر کرتے تھے اور اہل وبر وہ لوگ تھے جو صحراؤں اور ریگستانوں میں بے گھر بار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان خانہ بدوش لوگوں کا سہارا اونٹ تھا۔ یہ لوگ پورے سال پانی کے چشموں اور چارہ گھاس کی تلاش میں رہا کرتے تھے گرمی کے ایام صحراؤں اور ریگستانوں میں اچھی طرح بسر کرتے تھے۔ مگر جاڑے میں عراق اور شام کی حدود میں رہ جاتے تھے یا دیگر بستیوں کے آس پاس جاکر بڑی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے[لہ]

ہندوستان کے جو لوگ اس زمانے میں عرب میں رہتے تھے۔ وہ عام طور سے بلاد وقریات میں رہنے والوں کے ساتھ تو رہتے تھے اور ان کے ساتھ تجارت ملازمت یا دوسرے کام کرتے تھے البتہ خلیج عربی کے سواحل پر ہندوستانیوں کا ایک گروہ قدیم زمانے سے خانہ بدوش عربوں کی طرح گھاس اور چارہ کی تلاش میں گھوم پھر کر زندگی بسر کرتا تھا عام طور سے ہندوستان کے باشندے عرب میں شمال مشرق سے لے کر جنوب تک کے سواحل اور ان کے اوپر کے شہروں میں رہتے تھے ان علاقوں پر کئی عرب حکمران بھی تھے۔ جو امیر انہوں کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے جس طرح ہمارے زمانے میں بھی ان علاقوں میں عرب شیوخ انگریزوں کی نگرانی میں حکومت کرتے تھے اور معمولی

لہ طبقات الامم ابن صاعد اندلسی ص ۵۶

Marfat.com

معمولی عمارتیں اور ریاستیں موجود ہیں

اب ہم عرب سے ہندوستان آنے جانے کے ساحلی مقامات کی تفصیل بیان کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ پہلے زمانہ میں عرب و ہند کے درمیان بحری سفر کن راہوں سے ہوتا تھا؟ اس سلسلہ میں قدیم ترین عرب جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک کی تفصیلات زیادہ کارآمد ہیں کیونکہ اس نے اپنا جغرافیہ قدیم معلومات کی بنیاد پر لکھا ہے اور زیادہ اعتماد بطلیموس کے بیان پر کیا ہے جو یونان کا مشہور جغرافیہ نویس گزرا ہے جیسا کہ ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اس کی تصریح کی ہے بصرہ (قدیم ابلہ) سے مشرق کی طرف فارس، ہندوستان اور چین تک بحری راستوں کی تفصیل یوں ہے بصرہ سے جزیرہ خارک پچاس فرسخ۔ یہ جزیرہ ایک فرسخ لمبا چوڑا ہے یہاں پر انگور اور کھجور کے باغات ہیں اور کھیتی باڑی ہوتی ہے یہاں سے جزیرہ لاوان اسّی فرسخ ہے یہ دو فرسخ کی لمبائی چوڑائی میں آباد ہے یہاں کھجور کے باغات اور کھیت ہیں یہاں سے جزیرہ ابرون سات فرسخ ہے یہ ایک فرسخ ہے یہاں کھیت اور نخلستان ہیں۔ جزیرہ خین سات فرسخ ہے۔ یہ جزیرہ صرف نصف کا ہے اور غیر آباد ہے یہاں سے جزیرہ کیس بھی سات فرسخ ہے۔ یہ چار فرسخ میں آباد ہے یہاں کھیتی باڑی نخلستان اور مویشی کے علاوہ موتی بھی نکلتے ہیں۔ یہاں سے جزیرہ کاوان اٹھارہ فرسخ ہے یہ تین فرسخ میں آباد ہے یہاں سے ارموز (ہرموز) سات فرسخ ہے اور پھر تاراسات دن کی راہ پر ہے

بصرہ سے یہاں تک فارس اور سندھ کی درمیانی حد ہے اور یہاں سے شہر دیبل (موجودہ کراچی کے آس پاس) آٹھ دن کی راہ پر ہے جہاں سے مہران (دریائے سندھ) دو فرسخ پر سمندر میں گرتا ہے اور مہران سے اوتکین چار دن کی مسافت پر ہے یہ ہندوستان کا پہلا علاقہ ہے یہاں سے میدو فرسخ پر ہے مید سے کولی بھی دو فرسخ ہے پھر سندان (سنجان نواحی بمبئی) اٹھارہ فرسخ پر ہے۔ پھر ملی (ملیبار) پندرہ دن کی مسافت پر ہے اس کے بعد بلّین دو دن کی مسافت پر ہے یہاں سے بحر عظمی بھی دو دن کی مسافت پر ہے۔

بلّین سے سمندر میں کئی راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ جو شخص ساحل سے چلے تو اس کے لئے بلّین سے بابتن دو دن کی مسافت ہے۔ وہاں سے سجلی اور کبشکان ایک دن کی مسافت ہے اور وہاں سے گودا فرید گوداوری کا سنگم تین فرسخ ہے پھر اور نشین اٹھارہ فرسخ ہے اور سے ایلینہ چار دن کی مسافت ہے۔

Marfat.com

اور جو شخص بلین سے سرندیپ جائے تو اس کے لئے ایک دن کی مسافت ہے سرندیپ کے بعد جزیرہ رامی آتا ہے اور جو شخص بلین سے چین جانا چاہے وہ بلین سے گھوم کر سرندیپ کو اپنے بائیں جانب کر دے پھر سرندیپ سے جزیرہ النکبالوس دس سے پندرہ دن کی مسافت ہے اس کے بائیں جانب جزیرہ بالوس بھی چھ دن کی مسافت ہے اور وہاں سے جزیرہ جابہ شلاہط، دہر لنج دو دو فرسخ ہیں اس کے بعد پندرہ دن کی مسافت پر عطر کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔[1]

مغرب سے مشرق آنے کا یہ بحری راستہ بصرہ (ابلہ) سے نکل کر فارس کے ساحلی مقامات سے ہوتا ہوا ہندوستان آتا ہے ہندوستان کے لوگ قدیم زمانے میں اسی راستے سے عام طور پر بصرہ تک آتے جاتے تھے نیز عرب تاجران ہی راہوں سے گزر کر ہندوستان اور چین کا سفر کرتے تھے

عمان سے لیکر بصرہ تک ساحلی علاقہ خلیج عرب (خلیج فارس) پر واقع ہے اگر اس خلیج سے بصرہ سے مشرق کی طرف چلیں تو دایاں کنارہ کا ہے اور بایاں کنارہ فارس کا ہے جو مشرق میں عرب کے علاقہ عمان اور فارس کے علاقہ بندر عباس تک ہو جاتا ہے ابن خرداذبہ کا بیان کے مطابق اس خلیج کی چوڑائی ستر فرسخ ہے اور گہرائی ستر گز سے اسی گز تک ہے اور بصرہ سے عمان تک بحری راستہ یوں ہے بصرہ سے عبادان تک دریائے دجلہ سے گذر کر بارہ فرسخ ہے یہاں خشبات دو فرسخ ہے۔ پھر خشبات سے بحرین ستر فرسخ ہے یہ شط العرب کا علاقہ ہے۔ پھر دُر دو ایک سو پچاس فرسخ ہے اور پھر یہاں سے عمان پچاس فرسخ ہے عمان سے شحر دو سو فرسخ ہے اور شحر سے عدن ایک سو فرسخ ہے عدن بڑی عظیم الشان بندرگاہ ہے یہاں پر نہ کھیتی باڑی ہے اور نہ مویشی ہیں مگر عنبر، عود، مشک اور سندھ، ہندوستان چین۔ زنج جستہ۔ فارس بصرہ۔ جدہ اور قلزم کے تجارتی سامان بہت زیادہ رہتے ہیں[2]

یہ تو بصرہ سے عمان اور اس کے آگے ساحلی مقامات کے سمندری راستہ کی تفصیل ہے ابن خرداذبہ نے بصرہ سے عمان تک کے ساحل اور خشکی کے راستے کی بھی یوں تفصیل بیان کی ہے بصرہ۔ عبادان۔ حدوثہ۔ سرفجار۔ زالوقہ۔ المقرعطی۔ معرس۔ خلیجہ۔ حسان۔ القری۔ مسلیحہ حمض۔ ساحل۔ ہجر۔ عقیر۔ قطر السبخہ۔ عمان عمان ہی میں صحار۔ اور دبا شہر واقع ہیں۔[3]

---

[1] المسالک والممالک از صفحہ ۶۲ تا ۶۶ ملخص [2] المسالک والممالک ص ۶۰، ۶۱ [3] المسالک الممالک ص ۶۰

Marfat.com

سواحل عرب کے قدیم بحری اور بری راستے

عرب اور ہندوستان کے قدیم تعلقات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود عرب کے بھی قدیم ساحلی حدود اور ان کی مسافتیں سمجھ لیں تاکہ ذہن میں ان کا اجمالی نقشہ آجائے۔ ہم اسے قدیم عرب جغرافیہ نویس ابواسحق ابراہیم بن محمد فارسی اصطخری کی کتاب مسالک الممالک سے خلاصے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ملک عرب بحر فارس (بحر عرب) سے یوں گھرا ہوا ہے کہ عبادان سے بحرین ہوتا ہوا عمان تک چلا گیا ہے پھر سواحل مہرہ حضرت موت۔ اور عدن پر مڑتا ہوا سواحل یمن سے جدہ تک گیا ہے پھر جار پر مڑ کر ایلہ پہنچا ہے یہاں سے بحر فارس (بحر عرب) کی دیار عرب کی حد ختم ہوجاتی ہے۔ اور یہاں سے سمندر کی جو پٹی شروع ہوتی ہے اُسے بحر قلزم (بحر احمر) کہتے ہیں، جو تاران اور جبیلات تک چلی جاتی ہے، یہ پورا علاقہ دیار عرب کا مشرقی جنوبی اور کچھ مغربی حصہ ہے یہاں سے بحر قلزم ایلہ سے ہوتا ہوا قوم لوط کی بستی میں اور بحر منتنہ (بدبودار سمندر) سے گذر کر شرات اور بلقاء تک گیا ہے۔ یہ فلسطین کی بستیاں ہیں پھر یہاں سے اذرعات، حوران، شبنیہ۔ غوطہ اور بعلبک سے گذرا ہے۔ یہ دمشق کا علاقہ ہے۔ یہاں سے تدمر، سلیمہ سے گذرا ہے جو حمص کی بستیاں ہیں اور یہاں سے فناجرہ، بالس سے گزرا ہے۔ یہ سب قنسرین کے علاقے ہیں یہاں آکر ہم دریائے فرات کے پاس آجاتے ہیں۔ یہ دریا دیار عرب کے علاقہ جات رقہ۔ قرقیسیا۔ رحبہ۔ والیہ۔ حدثیہ۔ ہیت اور انبار ہوتا ہوا کوفہ اور اس کے آگے اپنے سنگم تک چلا گیا ہے۔ پھر وہاں سے کوفہ اور حیرہ کے اطراف سے خورنق اور سواد کوفہ ہو کر واسط کے حدود تک گیا ہے جہاں سے دریائے دجلہ کا فاصلہ ایک مرحلہ رہ جاتا ہے اس کے بعد سواد بصرہ اور اس کے سنگلاخوں (بطائح) سے ہوتا ہوا۔ عبادان تک چلا گیا ہے یہ ہیں دیار عرب کے پورے حدود جس سے یہ ملک گھرا ہوا ہے عبادان سے ایلہ تک بحر فارس (بحر عرب) دیار عرب کے تقریباً تین چوتھائی علاقہ کو شامل ہے جو عرب کا مشرق جنوبی اور کچھ مغربی حصہ ہے اور ایلہ سے بالس کی حد ملک شام سے ہے بالس سے عبادان تک عرب کی شمالی حد ہے جس میں بالس سے انبارہ کے آگے تک ارض جزیرہ اور انبار سے عبادان تک عراق کا علاقہ ہے۔ ایلہ کے پاس دیار عرب سے ایک ریگستان ملا ہوا ہے جسے تیہ بنی اسرائیل کہتے ہیں مگر یہ ریگستان دیار عرب میں شامل نہیں ہے بلکہ عمالقہ یونانیوں اور قبطیوں کی سرزمین ہے نہ اس میں نہ بانی ہے۔ نہ چراگاہ ہے البتہ چونکہ جزیرہ میں ربیعہ اور مضر کے عرب قبائل آباد ہیں اور

Marfat.com

لئے یہ دیار عرب میں سے ہے ویسے یہ علاقہ فارس اور روم کا ہے ان کی آبادیاں اور شہر اس علاقہ میں ہیں ان کے اثر اور تعلق کی وجہ سے ان اطراف کے عرب قبائل نے رومیوں کا نصرانی دین قبول کر لیا جیسے قبیلہ ربیعہ کے بنو تغلب ارض جزیرہ میں یمنی قبائل غسان، بہراء اور تنوخ ارض شام میں عیسائی بن گئے۔

ملک عرب کے اندرونی علاقے میں کوئی سمندر یا دریا نہیں جس میں جہاز یا کشتی چل سکے۔ بحر منتنہ (بدبودار سمندر) جسے زغر کہتے ہیں اگرچہ بادیۃ العرب سے متصل ہے۔ لیکن عرب میں شامل نہیں ہے اور یمن کے دیار سبا کا بند کوئی دریا یا سمندر نہیں تھا۔ بلکہ پانی کو بند باندھ کر ایک نشیبی علاقہ میں روک لیا گیا ہے جسے وہاں کے لوگ اپنے باغات اور کھیتوں وغیرہ میں استعمال کرتے تھے مگر ان کے عدوان اور طغیان کی وجہ سے اللہ نے اسے تباہ کر دیا[لے]۔

بحری راستوں سے عرب کے ساحلی حدود کی مسافت اس زمانے میں کشتیوں اور جہازوں کی رفتار سے یہ تھی۔ عبادان سے بحرین تقریباً ۱۵ مرحلہ بحرین سے عمان ایک مہینہ کی مسافت عمان سے ارض مہرہ ایک مہینہ کی مسافت، مہرہ سے حضرت موت ایک مہینہ کی مسافت پھر حضرت موت کے انتہائی علاقہ سے عدن ایک مہینہ کی مسافت، عدن سے جدہ ایک مہینہ کی مسافت جدہ سے ساحل جحفہ پانچ مرحلہ جحفہ سے جار تین مرحلہ جار سے ایلہ بیس مرحلہ۔ ایلہ سے بالس بیس مرحلہ۔ بالس سے کوفہ بیس مرحلہ، کوفہ سے بصرہ چودہ مرحلہ بصرہ سے عبادان دو مرحلہ یہی ساحلی مسافتیں دیار عرب کو گھیرے ہوتے ہیں[۵ے]۔

بحرین عبادان کے درمیان ایک دن کا ریگستانی راستہ دشوار گذار اور بے آب و گیاہ ہے اس لئے بحری راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے بصرہ سے بحرین تک اٹھارہ مرحلہ کا راستہ عرب قبائل سے آباد ہے ان کی آبادیوں میں پانی کے چشمے بھی ہیں اس راستے میں اگرچہ قافلے چلتے ہیں لیکن یہ خطرناک ہے۔ بحرین اور عمان کے درمیان کا بہت دشوار گذار ہے اس میں چلنا مشکل ہے کیونکہ اس ریگستان میں آباد عرب قبائل آپس میں جنگ جدول کرتے رہتے ہیں اس طرح عمان کے آگے خشکی کا راستہ چلنا مشکل ہے۔ کیونکہ پورا علاقہ ریگستانی ہے اور آبادی بہت قلیل ہے اس لئے جدہ جانے کے لیے بحری راستہ اختیار کرتے ہیں اگر ساحل سے چلیں تو مہرہ اور حضرت موت سے عدن تک کا راستہ بہت طویل ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ یہاں پر لوگ خشکی کا راستہ بہت کم ہی اختیار کرتے ہیں[سے]۔

لے مسالک الممالک اصطخری از ص ۱۲ تا ۱۵ ؎ے مسالک الممالک اصطخری ص ۲۶ ؎ے مسالک الممالک ص ۲۸

Marfat.com

یہ عرب کے ساحل اور ان کے اطراف و جوانب کے مقامات کی مختصر سی فہرست اور ان مسافتوں اور راستوں کی حالت ہے ان ہی علاقوں میں ہندوستان کی قومیں قدیم زمانہ سے آتی جاتی تھیں اور پورے علاقے میں ان کی آمدورفت ہوا کرتی تھی۔

دستاویزات

Marfat.com

سوال۔ قاضی منہاج الدین سراج جزجانی کے حالات زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔

نام : عثمان، اور لقب منہاج الدین بن سراج دہلوی سن ولادت ۵۸۹ھ / ۱۱۹۲ء

تیرھویں صدی عیسوی منگولوں کے حملوں نے اسلامی دنیا میں جو تباہی مچائی اس کے نتیجہ میں بہت سے بڑے بڑے شہر غارت ہو گئے ان علاقوں سے بہت سے لوگ بھاگ کر یہاں آتے رہے۔ ان میں شاہی خاندان کے افراد امراء سپاہی، علماء فضلاء مشائخ، غرضیکہ ہر طبقہ کے لوگ تھے۔ لوگ اپنے ساتھ اپنے قدیم وطنوں کی روایات اور اپنے کمالات بھی لائے۔ چنانچہ یہاں زندگی کے ہر شعبہ میں ان لوگوں کی آمد کے اثرات محسوس ہونے لگے اور یہاں کے تہذیب و تمدن کی ترقی میں ان سے بہت مدد ملی۔ ابتدائی دور کے آنے والوں میں ایک نمایاں شخصیت طبقات ناصری کے مصنف منہاج الدین سراج جوزجانی کی ہے اس کے آباؤ اجداد جوزجان کے رہنے والے تھے اور انھیں سلاطین غور کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ جب لاہور پر سلطان محمد غوری کا قبضہ ہوا تو منہاج کا والد قاضی سراج الدین وہاں کی غوری افواج کا قاضی مقرر ہوا۔ لیکن منہاج خود تیس برس کی عمر میں ہندوستان آیا۔ وہ ۱۲۲۷ء میں اُچہ میں پہنچا۔ اور ناصرالدین قباچہ نے اسے درس گاہ فیروزی کا صدر معلم مقرر کیا لیکن ایک سال بعد التمش نے قباچہ کو شکست دی۔ اور اُچہ اور ملتان پر قبضہ کر لیا۔ واپسی پر منہاج التمش کے ساتھ دہلی آ گیا۔ چار سال بعد وہ گوالیار کے محاصرہ پر موجود تھا۔ گوالیار کی فتح کے بعد وہاں قاضی مقرر ہوا۔ لیکن ۱۲۳۸ء میں وہ یہاں سے چلا گیا۔ ۱۲۴۲ء میں بہرام شاہ نے اسے شہر دہلی کا قاضی اور صدر الصدور مقرر کیا، لیکن بہرام شاہ کو تخت سے اتار دیا گیا اور منہاج الدین نے بھی اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اس کے بعد وہ دو تین سال لکھنوتی میں مقیم رہا اور جب ۱۲۴۴ء میں واپس دہلی آیا تو اسے مدرسہ ناصریہ کا مہتمم اور جامع مسجد کا خطیب مقرر کیا گیا۔ ۱۲۴۶ء میں شروع میں سلطان ناصرالدین محمود تخت نشین ہوا اور اب منہاج کا ستارہ پوری درخشانی سے چمکنا شروع ہوا۔ حضر و سفر میں برابر ساتھ رہتے تھے ۱۲۴۷ء میں سلطان ملتان لاہور۔ جود اور نندانہ کی مہم پر گیا تو مولانا منہاج الدین اس کے شاہی جلو میں تھے۔ جب فوج واپس آنے لگی تو عید الاضحیٰ کی نماز جالندھر میں پڑھی گئی۔ یہ نماز مولانا منہاج الدین ہی نے پڑھائی اور اس روز سلطان نے ان کو جبہ دستار اور ایک گھوڑا بھی

Marfat.com

کے علاوہ دوسرے شاہانہ انعامات سے بھی نوازا[۱]۔ سنہ ۶۴۶ھ میں سلطان الغ خاں کے ساتھ قنوج کے پاس تلندہ کے قلعہ کی تسخیر کے لئے گیا تو مولانا بھی اس مہم میں شریک تھے اس جنگ کو مولانا نے منظوم بھی کیا اور اپنے مربی کے نام پر ناصری نامہ رکھا۔ سلطان نے اس کے صلہ میں ان کے لئے سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ اس جنگ کا سہرا الغ خاں کے سر رہا تھا۔ اس لئے نظم میں اس کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ الغ خاں نے از راہ قدردانی مولانا کو ہانسی میں ایک گاؤں بطور انعام دیا[۲]۔ سنہ ۶۴۷ھ میں سلطان محمود نے ان کو شاہی خلعت اور سو غلام انعام میں دیئے ان غلاموں کو انھوں نے اپنی ہمشیرہ کے پاس خراسان بھیجا[۳]۔ بسنہ ۶۵۰ھ میں بھی کیتھل سے رخصت ہوتے وقت سلطان نے ان کو گھوڑے اور خلعت خاص وغیرہ انعام میں عطا کئے۔ لیکن سنہ ۶۵۱ھ میں جب خواجہ سرا امام الدین ریحان کی سازشوں سے الغ خان کو پایۂ تخت دہلی سے دور کر دیا گیا۔ تو مولانا منہاج کے بھی برے دن آ گئے۔ الغ خان کی عدم موجودگی میں زیادہ تر گھر کے اندر کواڑ بند کئے پڑے رہتے اور ذاتی دشمنوں کی وجہ سے جامع مسجد میں بھی جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے نہیں جاتے۔ لیکن سنہ ۶۵۳ھ میں وزارت صدر الملک نجم الدین ابو بکر کو دی گئی تو مولانا منہاج کے اچھے دن پھر پلٹے اور سلطان نے ان کو صدر جہاں کے لقب سے سرفراز کیا[۴]۔ اور سنہ ۶۵۳ھ میں دہلی اور تمام سلطنت کے پھر قاضی بنائے گئے۔ اسی سال الغ خان کو اقتدار از سرِ نو قائم ہوا۔ تو پھر آخر عمر تک مولانا منہاج الدین سلطان اور نائب سلطان کی نوازشوں سے سیراب ہوتے رہے۔ سلطان ناصر الدین محمود اور الغ خان دونوں مولانا منہاج الدین کو اس وجہ سے بھی عزیز رکھتے تھے کہ وہ بڑے اچھے واعظ اور صاحب دل بزرگ بھی تھے۔ فوائد الفواد میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ دہلی میں قاضی منہاج کا وعظ ہر دوشنبہ کو ہوتا تو وہ بھی اس میں شریک ہوتے۔ منہاج کے مشائخ زمانہ سے ذاتی تعلقات تھے لیکن اس نے (برنی۔ فرشتہ اور دوسرے مؤرخین کی طرح) ان کا ذکر نہیں کیا گلزار ابرار میں اس بات کی شکایت کی گئی کہ "اس نے مشائخ زمانہ کو قطعی یاد نہ کیا اور مشائخ کو یہ بات کھٹک گئی"

منہاج سراج شاعر بھی تھا۔ اس کے بعض قطعات اور قصائد محفوظ ہیں۔ منہاج ایک با اثر

۱؎ طبقات ناصری ص ۲۰۱ ؛ ۲؎ طبقات ناصری ص ۲۱۰، ۲۱۱ ؛

۳؎ ایضاً ص ۲۱۴ ؛ ۴؎ ایضاً ص ۲۱۸، ۲۱۹ ؛

Marfat.com

خطیب اور واعظ بھی تھا۔ جب سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں گوالیار کا محاصرہ ہوا تو مسلمانوں کو بڑی مشکلیں پیش آئیں گوالیار کا راجہ ایک بہادر اور تجربہ کار جرنیل تھا۔ قلعہ بڑا مضبوط اور اندر بڑا ساز و سامان جمع تھا۔ گیارہ ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران میں علمائے اسلام (بحکم سلطانی) وعظ و تذکیر سے مجاہدین اسلام کا دل بڑھاتے۔ چنانچہ منہاج سراج نے اس موقع پر ۹۵ مرتبہ وعظ کیا۔ بالآخر مسلمانوں کی ہمت اور استقلال کے سامنے راجہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ اسی طرح جب التمش کے بیٹے بہرام شاہ کے عہدِ حکومت میں ۱۲۴۱ء میں منگولوں نے لاہور پر حملہ کیا۔ اور شہر فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تو اس خبر سے دارالخلافہ میں بڑی تشویش پیدا ہوئی چنانچہ قصر ابیض میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا اس میں منہاج نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس سے بڑا جوش پیدا ہوا۔ اور جو لوگ بادشاہ سے بددل تھے انہوں نے بھی قومی خطرہ کے مقابلہ کے لئے از سرِ نو بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اس زمانے میں وعظ و تذکیر کا عام رواج تھا اور منہاج بڑے بااثر خطیبوں میں سے تھا۔

منہاج فقط قاضی مورخ شاعر اور خطیب نہ تھا۔ بلکہ اس کے خاندانی تعلقات وسیع علمیت اور مذہبی رنگ نے اسے ملکی اور سیاسی مدبر کا درجہ دے دیا تھا اور بعض موقعوں پر سلاطین و امراء نے اس سے سیاسی گتھیاں سلجھانے میں بھی مدد لی۔ مثلاً جب سلطان بہرام شاہ ابن التمش نے ایوب نامی ایک درویش کے کہنے پر ایک نامور فقیہہ (قاضی شمس الدین) کو قتل کرا دیا اور وزیر سلطنت اور امراء اس کے مخالف ہو گئے تو اس نے منہاج کو جسے اس نے قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا۔ باغیوں کو سمجھانے کے لئے بھیجا (گو منہاج اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا) اسی طرح جب بہرام کے بعد علاؤالدین مسعود بن رکن الدین فیروز شاہ بادشاہ ہوا اور والئی بنگالہ کے لڑکے مانکپور پر حملہ کیا تو منہاج کے سمجھانے بجھانے پر طغرل اور اس کے ساتھی بنگال واپس چلے گئے۔ اس طرح اس نے ۱۲۴۵ء میں طغرل حاکم بنگالہ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ بنگالہ کی حکومت نئے بادشاہ کے نامزد گورنر کے حوالے کر دے۔

Marfat.com

سوال : طبقاتِ ناصری مصنفہ قاضی منہاج الدین سراج پر بحیثیت تاریخی ماخذ، بحث کیجئے۔

طبقاتِ ناصری :-

۶۵۸ھ میں قاضی منہاج الدین نے ستر برس کی عمر میں اپنی مشہور ومعروف تاریخ طبقاتِ ناصری ختم کر کے سلطان ناصر الدین محمود کی خدمت میں پیش کی۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اسی کے نام پر اس کتاب کو موسوم کیا اور موسوم کرتے وقت یہ اشعار لکھے۔ جس میں اپنے علمی عیوب کے معافی کے خواستگار ہوئے۔

۱۔ ہر چہ کہ دم سماع بنوشتم ⁂ اصل نقل وسماع گوش بود ؛

۲۔ درگذارد خطا چو دید کریم ⁂ زانکہ با عز وعقل دہوش بود ؛

۳۔ ہر کہ او ذوق مہتری دریافت ⁂ نزد صبرش صبر چو نوش بود ؛

۴۔ دامنِ عفو بر درویش مدام ⁂ در رہ علم عیب پوش بود ؛

۵۔ بدعا یاد دارد ش منہاج ⁂ گرچہ اندر قفس خموش بود [۱]

(ترجمہ) ۱۔ جو سنا میں نے لکھدیا۔ جو سچ یا جھوٹ تھا لکھدیا۔

۲۔ جب میری اس تحریر کو۔ کریم النفس انسان نے دیکھا ۔ تو ۔

۳۔ میری کوتاہیوں کو درگذر کیا ۔ کیونکہ وہ صاحب وقار و دانش تھا۔

۴۔ اس کے عفو پر دامن ــــ ہمیشہ عالموں کا عیب پوش تھا۔

۵۔ منہاج اسے دعاؤں میں یاد رکھتا ہے۔ اگرچہ پنجرے میں خاموش تھا۔

● سلطان ناصر الدین محمود نے مولانا کی علمی کاوشوں کو بڑا سراہا اور غایت قدردانی میں اپنے کندھے کی چادر اُتار کر ان کو دے دی اور پھر خلعت کے علاوہ دس ہزار جیتل کا سالانہ وظیفہ ایک گاؤں اور دوسرے انعامات بھی دیے مولانا خود فرماتے ہیں۔

" چوں ایں تاریخ بخدمت سلطان ناصر الدین خلد اللہ سلطانہٗ عرض افتاد خلعت بادشاہی فرمود و وثیقہ ممزوج باستجاب خاص کہ بر کشف مبارک بود بداعی داد دستر دی

(۱ طبقاتِ ناصری ص ۴)

Marfat.com

دہر سالے دہ ہزار جیتل وکیبارہ دیبہ انعام فرمود[1]۔

جب یہ تاریخ ناصر الدین کی خدمت میں پیش کی گئی۔ تو مصنف کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔ مولانا نے اپنی تاریخ کا ایک نسخہ الغ خان کی خدمت میں بھی گذرا جو اس نے انعام میں حسب ذیل چیزیں دیں:

"بیست ہزار جیتل معدود و ماہی صباحی دیک دستہ منجانب دیک دستہ ردباہ[2]۔"

مولانا نے ان انعامات کا شکریہ حسب ذیل قطعہ میں ادا کیا۔ جو انھوں نے اس نسخہ کی پشت پر لکھ دیا تھا۔ شہر یار

شہر یار جہاں الغ خاں آنکہ — خان ابر زلیست وشاہ سمک
ہر کہ از حضرتش قبولی یافت — پیش ہر گز نگشت رو بفلک
کرد از لوح خاطر منہاج — غصہ دہر را باحسان ملک
پیش اوکیست حاتم طائی — نزد او چیست یحیی برمک
بشنود ایں سخن زمن ہمہ خلق — از طریق یقیں نہ از رہ شک
تو دونہ مراست قسم کرم — دیگر نزاہمہ از اں صدیک
ہر دعائے کہ گو یمش از جان — کہنہ آمین ان بہ صدق ملک

ترجمہ: الغ خاں دنیا کا بادشاہ جس نے اس کی بارگاہ میں مقبولیت پائی۔ پھر کبھی اس کو کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس کے سامنے حاتم طائی کون ہے۔ اس کی سخاوت کے سامنے برمک کیا حیثیت رکھتا ہے۔ تمام مخلوق مجھ سے یہ بات سن رہی ہے۔ شک کے ساتھ نہیں بلکہ یقین کے ساتھ۔ جو دعائیں اس کے لئے کرتا ہوں فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔

طبقات ناصری ہر زمانہ میں ایک اہم اور کار آمد تاریخ سمجھی گئی ہے۔ یہ کتاب ۲۳ طبقات میں منقسم ہے جن میں آفرنیش عالم سے ۶۵۸ھ (مطابق ۱۲۶۰ء) تک کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مفید ابواب (یعنی طبقات ۱۱، ۱۲، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳) سلاطین غزنی وغور۔ ملوک معزی اور قطب الدین ایبک سے ناصر الدین محمود تک کے سلاطین دہلی اور ان کے امراء کے حالات میں ہیں۔ آخری باب فتنہ ... پر ہے جو مؤلف کی زندگی میں برپا ہوا۔

• [1] طبقات ناصری ص۲۸۴ • [2] طبقات ناصری ص ۲۸۵ •

Marfat.com

ان ہی ابواب کو کپتان لیس، مولوی خادم حسین اور مولوی عبدالحی نے مشترکہ طور پر ایڈٹ کر کے طبقات ناصری کے نام سے ۱۸۶۴ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع کیا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں آغا عبدالحی حبیبی قندھاری نے کوئٹہ سے طبقات ناصری کا جو نسخہ شائع کیا ہے وہ بھی نامکمل ہے لیکن شروع سے لے کر اکیسویں طبقہ تک مشتمل ہے۔ انگریزی داں اہل علم ہی یہ کتاب میجر ایچ۔ جی راورٹی کے ذریعہ متعارف ہوگی جس نے اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۱ء میں بڑی محنت و لیاقت سے کیا۔ اور اس میں اتنے مفید حواشی لکھے کہ ترجمہ اصل سے زیادہ اہم ہوگیا ہے لیکن میجر راورٹی نے شروع کے چھ طبقات اپنے ترجمے میں حذف کر دیے ہیں۔ اس لیے یہ ترجمہ بھی پوری کتاب کو منظر عام پر نہ لاسکا۔ اور ابھی تک اس مشہور و معروف مورخ کی پوری کتاب ایک ساتھ نہ ہوسکی، حالانکہ ادب، انشا اور نگاری کے لحاظ سے یہ اب بھی لائق داد و ستائش ہے جیسا کہ آغا عبدالحی حبیبی رقمطراز ہے۔

مؤلف انشور این کتاب (طبقات ناصری) یکے از نویسندگان معروف و زبردست زبان پارسی است کہ کتابش از حیث سلاست و روانی انشا بے نظیر است و ہم در ضبط وقائع تاریخی و مشاہدات خود مؤلف یکے از آثار برجستہ بہ شمار می آید[۱]

ترجمہ: اس کتاب کے مصنف نے جو فارسی زبان کا مشہور ادیب ہے اس کی کتاب سلاست و روانی کے لحاظ سے بے مثل ہے مشاہدات اور تاریخی واقعات کے تحریر کرنے میں فارسی زبان میں بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

دہلی کے مملوک سلاطین پر دو ہی معاصر تاریخیں ہیں، ایک تاج الماثر اور دوسری یہ طبقات ناصری تاج الماثر اپنی مسجع اور مقفی عبارت کی وجہ سے زیادہ مقبول عام نہ ہوسکی اس کے برخلاف طبقات ناصری کچھ ایسی سادہ سلیس، اور عام فہم عبارت میں لکھی ہوئی ہے۔ نہ پڑھنے والوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ مؤلف نے تمام واقعات کو حاشیہ آرائی اور رنگ آمیزی کے بغیر سیدھے سادے طریقے پر لکھنے کی کوشش کی ہے اس لیے اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو صحیح اور مستند سمجھنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مؤلف نے جا بجا ایسے ماخذوں کا بھی حوالہ دیا ہے جن کے ذریعہ سے ان کو معلومات حاصل ہوئے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو واقعات کی تلاش اور جستجو رہی وہ خود ہی سلاطین و امرا سے ایسے قریب تر تھے، ان کو براہ راست سارے معلومات حاصل ہوتے رہے

---

[۱] طبقات ناصری مرتبہ عبدالحی حبیبی ص ا

Marfat.com

اگر وہ جزوی تفصیلات لکھنا چاہتے تو آسانی سے لکھ سکتے تھے لیکن ظاہر ہے۔ وہ پورے عالمِ اسلام کی ایک اجمالی تاریخ لکھنے بیٹھے تھے اس میں جزئیات قلمبند کرنے کی کہاں گنجائش ہوسکتی تھی البتہ اب جب کہ ان کی تاریخ ہی سلاطین دہلی کے ابتدائی دور کا ایک اہم بلکہ واحد ماخذ رہ گیا ہے۔ تو یہ فطری طور پر خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اختصار سے کام لینا نہ چاہیئے تھا۔ بعض جگہ تو انھوں نے اتنا اختصار برتا تھا کہ ضروری واقعات بھی رہ گئے ہیں۔ جو کسی اور ماخذ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اور پھر جب کہ مورخوں کا نقطۂ نظر ہی بدل رہا ہے اور وہ نہ صرف سیاسی واقعات اور فوجی محاربات ہی کی تفصیل پڑھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کو اس دور کی معاشرتی، عمرانی، علمی اور اقتصادی حالات کی بھی تلاش ہوتی ہے تو اس لحاظ سے طبقاتِ ناصری میں معلومات بہت ہی کم ہیں۔ فاضل مؤلف اپنے عہد کے ایک جید عالم صاحبِ دل صوفی۔ اور ممتاز شاعر بھی تھے ظاہر ہے کہ ان کو اپنے معاصر علما و مشائخ اور شعرائے سے گہرا تعلق رہا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے، ان کا بھی ذکر بہت ہی خال خال کرتے ہیں۔ اگر وہ ان کا ذکر اسی طرح کرتے جس طرح کہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں لکھا ہے تو اس دور کی علمی تاریخ میں بہت ہی روشن نظر آتی ہیں، ان خامیوں کے باوجود یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی اس کے لحاظ سے اس کے محاسن میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی اور ہندوستان کے ملوک سلاطین کے عہد کے لیے یہ تاریخ بہت ہی قیمتی اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر دور کے مورخ اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ تاریخ ۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء) یعنی ناصر الدین محمود کی وفات سے پہلے ہی ختم کر دی گئی تھی۔ اور فاضل مولف بلبن کی تخت نشینی کے وقت تک زندہ رہے لیکن انھوں نے ۶۵۸ھ کے بعد تاریخ نہیں لکھی۔ مولانا ضیاءالدین برنی نے عہد بلبنی سے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی ہے اس طرح ۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء) سے ۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) تک کوئی تاریخ نہیں لکھی اور یہ آٹھ برس کا زمانہ کسی معاصر تاریخ کے بغیر نظر آتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں عین الدین بیجاپوری کی ملحقات طبقاتِ ناصری کا ذکر جا بجا آتا ہے، اس سے فرشتہ نے کچھ ایسے معلومات حاصل کیے ہیں جو اور تاریخوں میں نہیں ہیں شاید یہ تاریخ طبقاتِ ناصری کا تتمہ ہو۔ لیکن اب ملحقات طبقاتِ ناصری کا ایک نسخہ بھی کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔

• طبقاتِ ناصری ۲۳ جلدوں میں ہے اور ہر ایک جزو کا عنوان علیحدہ ہے۔

جلد ۱ در تاریخ انبیائے کرام

جلد ۲ در تاریخ خلفائے اربعہ و عشرہ مبشرہ اور سیدنا علی کے بقیۃ السلف۔

Marfat.com

جلد ۳ — در تاریخ در تذکرہ خلفائے آمیہ۔

جلد ۴ — در تاریخ در تذکرہ خلفائے عباسیہ۔

جلد ۵ — شاہان فارس از پیش دادی تا بہ اکاسرہ در آخرش ذکر یزد و جرد آوردہ

جلد ۶ — تاریخ ملوک یمن

جلد ۷ — تاریخ ملوک طاہریہ تا بہ سنہ ۲۵۹ھ / ۸۷۲ء

جلد ۸ — تاریخ ملوک صفاریین تا بہ سنہ ۲۸۹ھ / ۹۰۱ء

جلد ۹ — تاریخ ملوک سامانیہ از سنہ ۲۸۹ھ / ۹۰۱ء تا بہ عبدالملک بن نوح

جلد ۱۰ — تاریخ ملوک آل بویہ از آغاز تا بہ ابوالفوارس شرف الدولہ

جلد ۱۱ — شاہان غزنہ از سبکتگین تا بہ خسرو ملک

جلد ۱۲ — شاہان سلجوقیہ

جلد ۱۳ — سنجریہ از اتابکۂ عراق و فارس و شاہان نیشاپور

جلد ۱۴ — تاریخ شاہان نیمروز سجستان

جلد ۱۵ — تاریخ شام داوبیہ مصر

جلد ۱۶ — تاریخ خوارزم

جلد ۱۷ — تاریخ شبنسانیہ از شاہان غور

جلد ۱۸ — تاریخ شاہان بامیان و طخارستان

جلد ۱۹ — تاریخ شبنسانیۂ غزنہ

جلد ۲۰ — تاریخ شبنسانیۂ معزیہ در ہند بشمول قطب الدین ایبک ناصرالدین قباچہ
وبہاؤالدین طغرل و بختیار خلجی و غیاث الدین۔

جلد ۲۱ — تاریخ شاہان التمش در ہند از شمس الدین تا بہ ناصرالدین محمود۔

جلد ۲۲ — تاریخ نوابین شاہان شمسیہ بحسب قطعہ ہائے مملوکہ در ہند

جلد ۲۳ — تاریخ غزوات سلطان سنجر و فتح ترکستان از یزدے خوارزم شاہ
تا بہ سنہ ۶۵۸ھ / ۱۲۵۹ء۔

Marfat.com

سوال : امیر خسرو کے حالاتِ زندگی بیان کیجیے۔

خاندان

امیر خسرو جن کا نام ابوالحسن یمین الدین اور تخلص خسرو تھا۔

خسرو ترکی النسل تھے ان کا خاندان لاچین کے قبیلہ ہزارہ سے تعلق رکھتا تھا۔ لاچین غالباً قبیلہ کے سردار کا نام تھا۔ جس سے یہ قبیلہ موسوم ہوا یہ قبیلہ کش میں آباد تھا جو ماوراءالنہر میں واقع ہے۔ یہ کش سے قرشی اور وہاں سے بلخ آیا۔ خسرو کے آباؤ اجداد تیرہویں صدی میں دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان داخل ہوئے اور کچھ عرصہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں رہے پھر اس کے بعض افراد شمس الدین التمش کے عہد میں دہلی آئے اور اس کے دربار میں ملازم ہوئے ان ہی میں خسرو کے والد بزرگوار سیف الدین محمود لاچین تھے۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ سیف الدین محمود شمس الدین التمش کے دربار میں کس عہدہ پر مامور تھے۔ لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دربار کے معزز امیر تھے۔ خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں اس کے نام کے ساتھ "امیر" اور "سیف شمسی" لکھا ہے۔ برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بارہ ہزار ٹنکے سالانہ وظیفہ ملتا تھا[1] وہ اپنی بہادری اور نبرد آزمائی کے لیے مشہور تھے۔ جیسا کہ دیباچہ غرۃ الکمال میں امیر خسرو لکھتے ہیں "پدرم سیف شمسی کہ از نور پیشانی تیغ آفتاب بود و صف شکنی اشتہار یافتہ" (میرے والد "سیف شمسی" جن کی پیشانی سورج کی مانند چمکتی تھی اور وہ صف شکنی کی وجہ سے مشہور تھے)۔ ان کی امارت کے ساتھ ان کی خدا رسی کی بھی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہم از طریق دنیا امیر بود و ہم از جانب عقبیٰ صاحب ولایت باطنی بود" دنیا اور آخرت دونوں میں وہ صاحب حیثیت تھے۔

غالباً ان کو مومن پور المعروف بہ پٹیالی میں کوئی جاگیر ملی تھی۔ اور یہیں وہ سکونت پذیر ہو گئے تھے ان کی شادی سے ان کے تین فرزند ہوئے عزالدین علی شاہ۔ ابوالحسن یمین الدین خسرو۔ اور حسام الدین قتلغ۔

وطن و تعلیم :

خسرو مومن پور یعنی پٹیالی ہی میں ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۹۷

Marfat.com

پیدا ہوئے۔ سیرالاولیا میں ہے کہ خسرو کی پیدائش کے وقت ان کے بزرگوار ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنے محلہ کے ایک مجذوب اور صاحب نعمت بزرگ کے پاس لے گئے انہوں نے بچہ کو دیکھتے ہی فرمایا۔ "او دوسے کسے را کہ دہ قدم از خاقانی در پیش خواہد بود" (وصف ۲۲) خاقانی سے بھی دس قدم آگے ہوگا۔

ہوش سنبھالا تو تعلیم کے لئے مکتب میں بٹھائے گئے۔ ان کے والد نے خود تو تعلیم نہیں پائی تھی کیونکہ ان کے خاندان میں سپہ گری کا پیشہ تھا لیکن انھوں نے اپنے لڑکوں کو شوق سے تعلیم دلانی شروع کی۔ خسرو اپنے دیوان تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ ان کے استاد خواجہ سعدالدین ان کو خوش نویسی سکھانے میں ان کی پیٹھ پر درے لگاتے لیکن ان کے سر میں زلف بیچاں کا سودا ایسا سمایا ہوا تھا کہ وہ لکھنے پڑھنے کی طرف کم مائل ہوئے اور شعر گوئی کا ایک واقعہ تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک روز میں اپنے استاد خواجہ سعدالدین کے ساتھ خواجہ اصیل نائب کوتوال کے یہاں گیا۔ وہاں ایک صاحب علم اور دریائے سخن کے شناور" خواجہ عزالدین نظر بند تھے۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو خواجہ موصوف کے ہاتھ میں ایک بیاض تھی۔ وہ اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے گفتگو شروع کی تو ان کے منہ سے موتی جھڑنے لگے۔ میرے استاد نے ان سے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ کمسن لڑکا میرا شاگرد ہے شعر و شاعری میں بھی بلند پروازی کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کو کچھ اشعار پڑھنے کے لئے دے کر دیکھیں کہ کس طرح پڑھتا ہے۔ انھوں نے بیاض مجھ کو دی اور میں نے اس میں سے اشعار پڑھنے شروع کئے میری خوش الحانی سے سب کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ اور سب متحیر ہوئے میرے استاد نے خواجہ موصوف سے پھر کہا کہ شعر پڑھنا تو آسان ہے لیکن اس کا امتحان لیجئے کہ وہ شعر بھی کہہ سکتا ہے کہ نہیں انھوں نے چار بے جوڑ چیزوں" مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خربوزہ کے نام لئے کہ ان کو ملا کر شعر کہو میں نے برجستہ یہ اشعار موزوں کیے۔ ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است ؎ صد بیضۂ عنبریں براں موئے ضم است

چوں تیر مدان راست دلش را زیرا کہ ؎ چوں خربزہ دندانش میان شکم است

جب میں نے یہ رباعی پڑھی تو خواجہ عزیزالدین کو بڑی حیرت ہوئی انھوں نے بہت داد دی، اور میرا نام پوچھا میں نے کہا خسرو۔ والد بزرگوار کا نام پوچھا میں نے اصل نام کی بجائے قبیلہ کا نام بتایا یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا۔ لاچین یعنی چلین نہیں پھر کہا ترک خطا است یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے۔ میں نے اسی کو الٹ کر کہا نہیں خطا ترک است یعنی قطعاً وہ ترک ہے۔ دریافت کیا کہ تم دام خریدہ ناصری ہو؟ عرض کیا سلطانی شمسی ہوں"۔

Marfat.com

خواجہ صاحب نے کہا کہ تمہاری نسبت سلطانی ہے اس لیے اپنا تخلص سلطانی رکھو۔

مشقِ سخن

خسرو نے اس نصیحت پر عمل کیا۔ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔ اس کم عمری میں خسرو نے شاعری شروع کی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ جب میرے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے تو میں نے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ لیکن جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو ان کے والد بزرگوار ایک معرکہ میں شہید ہو گئے۔

بظاہر خسرو پر بڑی مصیبت آگئی لیکن اس میں بھی مصلحتِ خداوندی پوشیدہ تھی۔ والد کی شہادت کے بعد اپنے نانا عماد الملک کی نگرانی اور سرپرستی میں آ گئے اور یہ سرپرستی ان کے لیے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔

عماد الملک کی سرپرستی

عماد الملک بڑے طنطنہ کے امرا میں سے تھے شمس الدین التمش کے عہد سے بلبنی عہد تک عرض ممالک کے عہدہ پر فائز رہے دبدبہ و حشمت کا یہ حال تھا کہ دو سو ترک غلام دو ہزار ہندو اور دو ہزار بربران کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے[1] اپنے دفتر کے کام کرنے والوں کو اپنے پاس بلاتے مہمان رکھتے خلعت دیتے اور ان کو بیس بیس ہزار تنکے اپنی تنخواہ میں سے دے دیتے دسترخوان بچھتا تو انواع و اقسام کے کھانوں کے پچاس ساٹھ خوان آتے امرا و ملوک کے علاوہ جو بھی موجود ہوتا کھانے میں شریک ہوتا اگر کھانا بچ جاتا تو عزبار میں تقسیم کر دیا جاتا کوئی دسترخوان پر شریک ہونے سے معذور رہتا تو اس کے گھر کھانا بھجوا یا جاتا۔ عماد الملک خاص قسم کا پان کھایا کرتے تھے جو اپنی لذت اور لطافت کے لیے بہت پسند کیا جاتا۔ ان کی مجلس میں بیس ساٹھ غلام یہی پان برابر تقسیم کرتے رہتے تھے۔ ان کے دربار کے تمام آداب بڑے بڑے خوانین و ملوک ہی کی مجلسوں کی طرح تھے مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ نیک کاموں میں انہوں نے اتنے گاؤں وقف کئے تھے کہ ان کے زمانے یعنی فیروز شاہی عہد تک لوگ ان کے اوقاف سے گذر اوقات کرتے ہیں اور عماد الملک کے ایصالِ ثواب کے لیے کلام پاک پڑھتے رہتے ہیں[2] عہد بلبنی میں عماد الملک کا شمار سلطنت کے چار ستونوں میں ہوتا تھا۔

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال [2] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۱۱۵ - ۱۱۷

Marfat.com

تحصیلِ علم اس امارت و ثروت بھرے ماحول میں خسرو نے پرورش پائی عماد الملک کی مجلس میں علما، شعرا اور اربابِ نشاط سب ہی شریک ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خسرو کو لپنے نانا کی مجلسوں میں علم و ادب اور موسیقی کے ذوق کی نشو و نما میں کس قدر مدد ملی ہوگی۔ ان کے درسی علوم و فنون کی تحصیل کی تو تفصیل معلوم نہ ہوسکی لیکن تحفۃ الصغر کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ سال کی عمر میں ان میں اتنی غیر معمولی قابلیت پیدا ہوگئی تھی کہ فارسی شاعری کے اساتذہ مثلاً انوری اور سنائی وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرسکتے تھے اور پھر اسی صغر سنی میں ان اساتذہ حق کے تتبع میں اشعار کہنے بھی شروع کردیے تھے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں تو انہوں نے غالباً مختلف علوم و فنون پڑھنے کی کوشش نہیں کی لیکن آگے چل کر ان میں جو علمی استعداد پیدا ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف زبانوں کے جاننے کے علاوہ مذہب فقہ نجوم ہیئت صرف نحو پر غیر معمولی درک رکھتے تھے۔ مختلف زبانوں سے واقف تھے ان زبانوں میں ترکی و فارسی تو گویا ان کی فطری مادری زبانیں تھیں۔

خسرو کے نام سے بہت سے ہندی گیت دوہے معمے مخمس۔ چوپائیاں مشہور ہیں ایک ہندی تصنیف خالق باری بھی ان ہی کی بتائی جاتی ہے آیا یہ سب واقعی ان ہی کی ہیں جو ان کے نام سے منسوب ہوگئی ہیں اس پر بحث اب تک جاری ہے ہم ان مباحث سے گریز کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ خسرو ہندی کے بھی بہت بڑے شاعر تھے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ خسرو عربی نہیں جانتے تھے لیکن مولانا شبلی رقمطراز ہیں کہ امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تعلیم تمام تھی۔ اعجازِ خسروی میں ان کے بعض خطوط عربی میں بھی ہیں عزۃ الکمال کے دیباچہ میں انہوں نے اپنے عربی اشعار کے کچھ نمونے بھی دیے ہیں کہ شاید اسی قسم کے نمونوں کو دیکھ کر مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ وہ عربی ادبائے عرب کے ہمسر تھے عزۃ الکمال کے دیباچہ میں فارسی اور عربی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عربی ادب پر ان کی نظر گہری تھی اسی سلسلہ میں انہوں نے فارسی عربی۔ ترکی اور ہندی زبانوں کے مختلف پہلوؤں پر جو بحث کی ہے اس کو پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ فن زباندانی کے حقائق و دقائق سے اچھی طرح واقف تھے اور صرف و نحو پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ کچھ دنوں عربی زبان کی طرح فارسی زبان کی صرف و نحو مرتب کرنے کی فکر میں رہے لیکن یہ

Marfat.com

فارسی زبان کی عام مقبولیت اور شہرت کا خیال کرتے ہوئے اس کام کو سعیِ لاحاصل سمجھا۔

اساتذۂ فن کی تقلید سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے خسرو نے سخن سنجی میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی اور اس زمانہ میں بھی ان کے اشعار کچھ ایسے مقبول ہوئے گویّے مجلسوں میں گانے لگے جن کو سن کر بڑے بوڑھے وجد کرتے تھے ذہن رسا نے اس کم سنی میں بھی کسی شاعر کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے پر آمادہ نہیں کیا بلکہ فطری ذوق ہی کو اپنا استاد تسلیم کرتے رہے اساتذۂ فن کے کلام پڑھنے اور ان ہی کے رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے شروع میں انوری سے متاثر ہوئے اسی زمانہ میں خاقانی کے رنگ کی بھی تقلید شروع کی۔ لیکن خسرو نے اپنے دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے کہ وہ اس عمر میں خاقانی کے تتبع میں ناکامیاب رہے لکھتے ہیں کہ اگرچہ خاقانی کے متعلق اشعار حل کر لیتا تھا لیکن کم عمری کے سبب ان کے کلام کے دقائق واضح نہ ہوتے تھے۔ میری ہمت بلند تھی۔ پھر بھی ان کا کلام اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔

امیر خسرو و سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کا ایک اصول یہ تھا کہ جس مرید کو خلافت دیتے تھے اسے دربار سے علیحدہ رہنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ درباداری کی زندگی اہم روحانی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے لیکن انہوں نے خسرو کی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو دربار سے نہیں روکا۔ کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے لیے وہ میدان ضروری تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ شیخ نے ان پر دوسروں کی روحانی تربیت کی ذمہ داری بھی نہیں ڈالی۔

خسرو کی شخصیت کی اصل تعمیر حضرت محبوب الٰہی ہی کے دامن تربیت میں ہوئی خود ان کو خسرو سے اتنا تعلق خاطر تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھ پر ایسے وقت آتے ہیں کہ میں سب سے گھبرا جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے تنگ آجاتا ہوں۔ لیکن خسرو سے ...تنگ نہیں آتا۔ خسرو جب دہلی میں ہوتے تو ہر روز بعد عشا شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے یہ وقت وہ ہوتا جب شیخ دن بھر ملاقاتیوں میں صرف کرنے کے بعد تنہائی میں چلے جاتے تھے اور سوائے خسرو کے کوئی ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا شیخ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے

Marfat.com

اور پوچھتے خسرو! آج کیا کیا ہوا؟ خسرو دہلی کی ساری خبریں ان کے سامنے بیان کرتے جب جماعت خانہ میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجاتا یا شیخ کسی کی جانب سے کبیدہ خاطر ہو جاتے تو خسرو کے سوا کسی کو شیخ سے عرض حال کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ایک دن شیخ کو اطلاع ملی کہ مولانا برہان الدین غریبؒ جن کے سپرد لنگر خانہ کا انتظام تھا تکیہ لگائے پاؤں پھیلائے وہاں بیٹھے ہیں۔ شیخ کو اس میں تکبر کی بو آئی۔ خادم کو حکم دیا کہ جاؤ برہان الدین سے کہہ دو کہ فوراً گھر چلے جائیں۔ شیخ کا یہ فرمان سن کر بوڑھے برہان الدین کے ہوش اڑ گئے روتے روتے بے دم ہو گئے کھانا پینا بند کر دیا اور جماعت خانہ سے اٹھ کر محلے کے ایک مکان میں چلے گئے جو بھی ان کی حالت دیکھتا تھا بے اختیار رونے لگتا تھا۔ شیخ کی ناراضگی کو دور کرنے کیلئے مختلف لوگوں نے کوشش کی۔ لیکن سودمند نہ ہوئی بالآخر امیر خسرو اس معاملہ میں پڑے اور مجرموں کی طرح دستار گردن میں ڈال کر شیخ کے سامنے جا کھڑے ہوئے شیخ نے گھبرا کر پوچھا ترک کیا چاہتے ہو۔ عرض کیا مولانا برہان الدین کی معافی شیخ کے پاس "ہاں" کر دینے کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا۔

خسرو کی رگ رگ میں حضرت محبوب الٰہی کی محبت اس طرح سما گئی تھی برگ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم جب ان کی خدمت میں پہنچتے تو سر سے پیر تک محبت کی تصویر معلوم ہوتے تھے جب ان کا ذکر کرتے تو از خود رفتگی کیفیت طاری ہو جاتی۔ خود رقص کرتے اور دوسروں کو رقص کرنے پر مجبور کر دیتے۔

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شیخ سے ان کا تعلق کس حد تک پہنچ گیا تھا لکھا ہے کہ ایک سیاح فقیر حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی ضرورت بیان کی اس وقت جماعت خانہ میں کوئی چیز موجود نہ تھی شیخ نے فرمایا ٹھہر جاؤ جو کچھ فتوح آئے گی تمہیں دے دی جائے گی اتفاق ایسا ہوا کہ کئی دن تک کوئی فتوح نہیں آئی فقیر بھی انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے مجبور ہو کر اپنی جوتیاں اس فقیر کو دے دیں فقیر نے قبول کر لیں۔ اور دہلی سے روانہ ہو گیا امیر خسرو اس زمانہ میں شہزادہ محمد کے ساتھ ملتان میں رہتے تھے اور ہر سال ایک بار شہزادہ محمد کے ہمراہ دہلی آیا کرتے تھے اتفاقاً راستے میں اس فقیر سے ملاقات ہو گئی اس سے اپنے شیخ کی خیریت پوچھی۔ فقیر نے اپنا واقعہ بیان کر دیا اور جوتیاں دکھا دیں۔

Marfat.com

خسرو نے پوچھا ان کو فروخت کرو گے؟ فقیر تیار ہو گیا خسرو کے پاس ۵ لاکھ تنکے موجود تھے سب تنکے فقیر کو دے دیئے اور پیر کی جوتیاں سر پہ رکھ کر دہلی پہنچے کہتے ہیں کہ شیخ نے دیکھ کر فرمایا اے خسرو ارزاں خریدی یعنی اے خسرو تو نے سستے داموں خرید کی ہیں عشق و محبت کی دنیا ہیں نے اس طرح سودے کیے ہوں اور جس کی تربیت اس انداز سے ہوئی ہو۔ کیا تعجب ہے کہ ایک منزل پر پہنچ کر بے اختیار پکار اٹھے

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ   اپنی قیمت تم نے دو عالم فرمائی ہے
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز   جانِ من! قیمت بڑھایئے کہ اب بھی سودا سستا ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلق خسرو نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ وہ دل کی بیماریوں کے طبیب تھے خود خسرو کی دل کی دنیا انہوں نے سنواری اور سجائی تھی۔ جو جذبات وقتی ہنگاموں کی نذر ہو سکتے تھے ان کو شیخ نے جلا دے کر ایک اعلیٰ مقصد کی چاکری میں لگا دیا تھا۔ جذبۂ عشق راہِ طریقت کی پہلی اور آخری منزل ہے یہ دنیا کی مادی اور ظاہری دلفریبیوں میں آلودگی کا نام نہیں یہ قلب انسانی کی وہ کیفیت ہے جو راز کائنات کو سمجھنے اور خالقِ کائنات سے اپنا رشتہ قائم کرنے میں مدد کرتی ہے یہ جبرئیل بھی ہے اور دل مصطفےٰ بھی شرع و دین کا سارا نظام اس کے بغیر بقول اقبال ایک بت کدۂ تصورات ہے چشتیہ سلسلہ کے مشائخ اپنے وابستگان میں اسی عشق کی چنگاری روشن کرتے تھے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جب کسی سے خوش ہوتے تو دعا دیتے کہ اللہ تجھے درد عطا فرمائے یعنی ایسا دل جو عشق الٰہی کی آگ میں ہمیشہ سلگتا رہے حضرت محبوب الٰہیؒ کی صحبت میں امیر خسروؒ نے عشق کی اس اہمیت کو سمجھا اور اسی پر اپنی شخصیت کا قصر بلند تعمیر کیا فطرت نے ان کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت عطا کی تھی۔ محبوب الٰہی کے زیر اثر ان کا یہ حال ہو گیا کہ عشق و محبت کی بجلی ان کی رگ رگ میں کوندنے لگی جگہ جگہ اپنے کلام میں انہوں نے انسانی زندگی میں عشق کی اہمیت اور نظام کائنات کے اس پر انحصار کے بارے میں گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اگر انسان کا دل عشق کی آماجگاہ نہیں تو وہ خاک کا ایک تودہ ہے اس کا وجود نباتات اور جمادات میں شمار کرنا چاہیئے۔

امیر خسرو کے دربار سے تعلق اور ان کی شاعرانہ مشغولیتوں کے پیش نظر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید وہ عبادت و ریاضت میں کوئی گہری دلچسپی نہ رکھتے ہوں لیکن یہ گمان

Marfat.com

صحیح نہیں ان کے معاصر میر خورد کا بیان ہے کہ شب کو وہ تہجد کے وقت قرآن مجید کے سات پارے نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے دریافت کیا ترک! تمہاری مشغولی کا کیا حال ہے؟ عرض کیا مخدوم! چند روز سے یہ ایک نیا اتفاق پیش آیا ہے کہ جب پچھلی رات ہوتی ہے تو خود بخود گریہ غالب آجاتا ہے اور آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا الحمد للہ اب کچھ ظاہر ہونا شروع ہوگیا ہے (سیر الاولیار) ان کی لکھی ہوئی مناجاتیں پڑھیئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آتش خانہ دل کے شرارے شعر بن کر نمودار ہوگئے ہیں ایک ایک لفظ سے اثر ٹپکتا ہے اور سوز دل کی بو آتی ہے۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ خسرو کے کلام میں لطافت حلاوت اور شوکت ان کے مرشد حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیار کی دعا اور کرامت کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔ ان کا پورا گھر حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں داخل تھا۔ ان کے نانا اور والد بزرگوار دونوں ان کے مرید تھے ظاہر ہے کہ خسرو کو بچپن ہی سے ان فیوض و برکات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ خود بھی اپنی شاعری کے سارے کمالات کو محض اپنے مرشد کے لعاب دہن کی برکت سمجھتے تھے وہ جو بھی نظم کہتے سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کرتے ایک روز سلطان المشائخ نے ان سے کہا کہ اصفہان کے شعرار کے طرز میں کہا کرو یعنی کلام عشق انگیز ہو خسرو نے اسی پر عمل کرنا شروع کیا اور اس کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا ایک بار انہوں نے سلطان المشائخ کی مدح کہی۔ اور جب اس کو آکر سنایا تو سلطان المشائخ نے پوچھا کیا صلہ چاہتے ہو۔ خسرو نے جواب دیا کلام میں شیرینی اس وقت چارپائی کے نیچے طشت میں شکر رکھی تھی سلطان المشائخ نے حکم دیا کہ لاؤ اور اپنے سر کے اوپر چھڑک لو۔ اور کچھ کھا بھی لو۔ اس کے بعد ان کے کلام میں بڑی شیرینی پیدا ہوگئی۔ امیر خسرو آخر عمر میں پچھتایا کرتے کہ کوئی اور صلہ مانگتے تو وہ بھی ملتا۔ امیر خسرو جب کوئی کتاب لکھتے تو پہلے سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کرتے وہ اس کو ہاتھ میں لے کر اس پر فاتحہ (یعنی فاتحۃ الکتاب) پڑھتے۔ سلطان المشائخ کی صحبت میں رہتے رہتے امیر خسرو نے جس عشق مجازی کا راگ اپنی شاعری میں الاپنا شروع کیا تھا وہ عشق الٰہی سے بدل گیا رفتہ رفتہ ان میں عشق الٰہی کی ایسی سوزش پیدا ہوگئی کہ سلطان المشائخ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے روز مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا لائے تو میں کہوں گا کہ یہ ترک اللہ کا سوز سینہ ہے[1]

[1] سفینۃ الاولیار ص ۱۶۰

Marfat.com

وہ ان کو محبت میں ترک بچہ کہا کرتے تھے آخر میں ترک اللہ کہنے لگے تھے - از راہ لطف وکرم یہ بھی فرماتے کہ بہشت میں امیر خسرو کے بغیر داخل ہوں گا[1]

امیر خسرو کے نظریات ، آدمیت کا مفہوم خسرو کی نظر میں

عبادت کا مفہوم جو ان کے شیخ نے ان کے ذہن نشین کیا تھا وہ خود شیخ کی زبانی سنئے فرماتے ہیں۔" عبادت یا طاعت دو طرح کی ہوتی ہے ایک لازمی اور دوسری متعدی۔ لازمی وہ ہے جس کا نفع صرف کرنے والے کی ذات کو پہنچے اور یہ نماز روزہ حج اوراد اور تسبیح ہے۔ متعدی وہ ہے جس سے اوروں کو فائدہ پہنچے انفاق شفقت غیر کے حق میں مہربانی کرنا یہ طاعت متعدی ہے اس کا ثواب بے شمار ہے" (سیر الاولیار)

خسرو نے دونوں طرح کی عبادتیں کی تھیں طاعت لازمی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے انسان کے کردار میں پختگی پیدا ہوتی ہے جب وہ ایک اللہ کے آگے سر جھکا دیتا ہے تو ہزاروں سجدوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے دنیاوی مشاغل میں الجھ کر اس عبادت لازمی کو بھول جانا انسان کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔

طاعت متعدی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ جو شخص دوسروں کی مدد نہ کرے اس کا شمار جمادات میں ہونا چاہیئے چاہے وہ کتنا ہی صاحب عزت وجاہ ہو۔ فرماتے ہیں

یک شاخ کہ میوہ زند تر ، بہتر ز ہزار باغ بے بر

(ایک میوہ دار شاخ ایسے ہزار باغوں سے بہتر ہے جن میں پھل نہ آئیں)

خود ان کا حال یہ تھا کہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ دوسروں پر صرف کر دیتے تھے ایک جگہ کہتے ہیں

شیرم و رنج از پئے یاراں برم ، نے چو سگ خانہ کہ تنہا خورم

میں شیر ہوں کہ دوستوں کے لیے شکار کی تکلیف اٹھاتا ہوں گھر کے کتے کی طرح نہیں کہ جو ملے وہ خود ہی کھا لیتا ہے۔

آدمیت کا مفہوم امیر خسرو کی نظر میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے تقریباً

---

[1] سیر الاولیار

Marfat.com

نصف صدی تک دہلی میں رہ کر یہ جد و جہد کی تھی کہ انسان میں انسانیت کا احترام پیدا ہو کہ اس کے بغیر انسانی سماج میں فوز و کامرانی کے الفاظ شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتے تھے۔ خسرو نے اپنے پیر کی اس تعلیم کو پوری طرح اپنا لیا تھا ان کا سارا فلسفۂ زندگی اس بنیاد پر تعمیر ہوا تھا ان کے نزدیک "آدمیت" عبارت تھی "احترام انسانیت" سے دیباچہ غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں۔

" اگرچہ آدمی بے حساب است ولیکن در دیوان آدمیت ہمہ را در حساب آدمیت نتواں شمرد" یعنی اگرچہ آدمی بے شمار ہیں لیکن آدمیت کی فہرست میں سب شامل نہیں، لکھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو "فی احسن تقویم" پیدا کیا ہے وہ اللہ کا خلیفہ ہے اس کو نیابت اور خلافت کا حق ادا کرنا ہے اس کو دنیا کے آب و گل میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہیئے اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو سمجھے اور اپنے مرتبہ کو پہنچانے تو اسرار الٰہی کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔

انسان کے احترام کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود اپنی عزت کرنا سیکھے، جو خود اپنی عزت نہیں کر سکتا اس سے انسانیت کے احترام کی توقع بیکار ہے "عزتِ نفس" اور "خودداری" ہی سے انسانیت کی آبرو قائم ہے مادی ضرورتوں اور عارضی مصلحتوں کی خاطر اپنے آپ کو ذلیل نہ کرنا چاہیئے۔

انسان کو حق و صداقت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے، جرأت ہمت و راست بازی کو اپنا ساتھی بنانا چاہیئے۔

خودی خسرو نے "خودی" کی تعلیم بڑے زور شور سے دی ہے وہ انسان کی حیات جاوید کا راز خودی میں سمجھتے تھے۔ جس انسان نے اپنا سر کسی مخلوق کے در پر جھکا دیا اس نے انسانیت کی توہین کی۔

سیرت و کردار کی تعمیر انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے سلسلہ میں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اپنے آباء و اجداد کے کمالات پر فخر کرنا اور خود تہی دامن ہونا خسرو کی نظر میں بزرگوں کے استخواں فروشی سے کم نہ تھا کہ انسان کو اپنے کمالات سے اپنے بزرگوں کا نام روشن کرنا چاہیئے۔ نہ کہ یہ کہ ان سے مستعار لی ہوئی بڑائی سے اپنی شہرت کا سامان مہیا کرے نسب کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بے معنی چیز ہے اصل قدر و قیمت انسان کے ذاتی کردار اور اوصاف

Marfat.com

کی ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ اچھے خاندان کا ہر فرد اچھا ہی ہو اچھائی کا تعلق انسان کی سیرت سے ہے نسب سے نہیں کہتے ہیں کہ علم و ہنر سے انسان میں سیرت اور کردار کی پختگی پیدا ہوتی ہے ۔ علم خود ایک مطلق قدر ہے اس کو کسی دوسری قدر کے تابع نہیں کیا جا سکتا ۔ جس کو علم کی دولت مل جاتی ہے وہ دنیا کی ہر دولت سے بے نیاز ہو سکتا ہے ۔ سطحی علم کی مذمت کرتے ہیں اور جس علم پر عمل نہ کیا جائے اسے بیکار بتاتے ہیں کہتے ہیں کہ عالم بے عمل کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی کا سوتے میں بڑبڑانا ۔

ان کا عقیدہ تھا کہ محنت اور جد و جہد ہی انسان کی کامیابی اور ترقی کی ضامن ہو سکتی ہے اسی اصول کے پیش نظر انہوں نے اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں بڑی سبق آموز باتیں کہی ہیں اور لکھا ہے کہ ناز و نعم کی پرورش اولاد کو بگاڑ دیتی ہے ۔

امیر خسرو کی شخصیت کا یہ پہلو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ انہوں نے کبھی اپنے ضمیر کی آواز کو دربار شاہی میں بھی خاموش نہیں کیا جب بادشاہوں کو ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں مبتلا پایا تو صاف تنبیہ کی ۔

سوال: امیر خسرو کے متعلق بحیثیت مورخ بحث کیجیے ۔

جواب ۔ علاء الدین کے عہد کے لیے برنی کی تاریخ کے علاوہ ہم کو سب سے زیادہ مواد امیر خسرو کی تصانیف میں ملتا ہے بحیثیت شاعر امیر خسرو برصغیر کی تاریخ میں بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں غزل قصیدہ مثنوی غرضکہ شاعری کی ہر صنف میں ان کا کلام قابل تعریف ہے انہوں نے بلبن سے لے کر سلطان محمد بن تغلق تک کئی بادشاہوں کا عہد دیکھا سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ اپنے اوج کمال پر پہنچ چکے تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی زیادہ شہرت کا باعث ان کی غزلیں ہی ہیں جن میں آج بھی وہی جاذبیت اور کشش ہے جو سات سو سال قبل تھی ۔ لیکن فن تاریخ کی نظر میں ان کی مثنویوں کو بہت اہمیت حاصل ہے ان کا سلسلہ بلبن کے جانشین کیقباد سے شروع ہوتا ہے قران السعدین میں اس ملاقات کا ذکر ہے جو کیقباد نے اپنے باپ بغرا خان سے دریائے گنگا کے کنارے پر کی ۔ بغرا خان بنگال کا گورنر تھا اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بھی وہیں رہا چنانچہ خود اس کا لڑکا اپنے دادا کے تخت پر بیٹھا ۔

قران السعدین کا جائزہ

۱۲۸۹ء میں قران السعدین تصنیف ہوئی ۔ یہ مثنوی بحر

Marfat.com

مربع میں لکھی گئی ہے یعنی اس کی بحر وہی ہے جس میں نظامی گنجوی نے اپنی مشہور و معروف مثنوی مخزن الاسرار لکھی ہے لیکن خسرو کی ایجاد پسند طبیعت نے اس میں اتنی مختلف قسم کی نئی باتیں پیدا کر دی ہیں کہ یہ اپنے رنگ کی ایک خاص مثنوی ہو گئی ہے۔ اور بقول جناب سید حسن برنی "یہ مثنوی فارسی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور اپنے رنگ میں بالکل انوکھی کتاب ہے اس مثنوی کے لیے خسرو کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور ہمارے علم میں خسرو کے بعد اس کا جواب نہیں لکھا گیا"۔[1]

پوری کتاب میں غزل اور مثنوی کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ نظم کے اصناف ثلاثہ کا پورا لطف حاصل ہوتا ہے خسرو قصیدہ نگاری اور غزل گوئی میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے مثنوی میں قصیدہ اور غزل کا پیوند لگانا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جہاں خشکی پیدا ہونے لگی۔ وہاں موقع سے اس طرح مختلف بحروں کی غزلیں آ جاتی ہیں کہ یہ خشکی رنگینی میں بدل جاتی ہے۔ پھر جناب سید حسن صاحب برنی رقمطراز ہیں کہ "اس مثنوی میں غزلیں موقع بموقع اس طرح لکھی گئی ہیں کہ گویا خارجی واقعات کو مجرد جذبات کا جامہ پہنایا گیا ہے اور ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ جس داستان کے بعد آتی ہیں داخلی حیثیت سے پچھلے واقعات کا اعادہ کرتی اور اگلی داستان کی طرف اشارہ کرتی ہیں"[2]

پروفیسر کوول نے لکھا ہے کہ اس مثنوی میں ان غزلوں کی وہی حیثیت ہے جو ٹینی سن "کی نظم پرنسس میں اس کے گیتوں اور یونانی ڈراموں میں "کورس" کی ہے" مثنوی میں قصیدہ اور غزل کے پیوند لگانے کے سلسلہ میں مولانا اسمٰعیل فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ جدت طرازی نہایت پر لطف و بامزہ ہے مگر اس کی تقلید یک فنے شاعر کا کام نہیں جو شاعر مثنوی قصیدہ اور غزل ان سہ اصناف میں ید طولیٰ رکھتا ہو وہی خسرو کی تقلید کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں حضرت خسرو کو اس مثنوی کا ممدوح بھی خوش قسمتی سے ایسا ہاتھ لگا ہے کہ ساقی و مغنی و شاہد و بادہ و ساغر کا ذکر محتاج تکلف نہیں بلکہ اس کی بزم کا ایک معمولی ہنگامہ ہے۔

مثنوی میں قصہ کے علاوہ بظاہر بہت سی غیر متعلق باتیں نظر آتی ہیں اور یہ غیر متعلق چیزیں وہی ہیں جو خسرو نے وصف نگاری کے سلسلہ میں لکھی ہیں۔ اور اس طرح ان کو ۱۵ چیزوں کا وصف

---

[1] تمہید قران السعدین ص ۷   [2] تمہید مثنوی قران السعدین ص ۲۸ - ۳۰

Marfat.com

بیان کرنا پڑا ہے جس سے قصہ کا تسلسل قائم نہیں رہتا۔ اور اس کے ساتھ ان اوصاف کا بیان اصل قصہ سے زیادہ بڑھ گیا ہے اس نقص کا احساس خسرو کو خود ہی تھا لیکن وہ کہتے ہیں کہ قصہ میں کوئی جان نہ تھی اسی لیے ایک پھیکے اور بدمزہ قصے کی بے مائگی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے مختلف اشیاء کا وصف بیان کرنا شروع کیا لیکن اپنی سحر کاری اور اسلوب بیان کی تازگی سے کچھ ایسا کام لیا کہ یہ نقص ان کی مثنوی کا وصف بن گیا اور یہ وصف نگاری اتنے متنوع اور گوناگوں مضامین پر مشتمل ہے کہ ہر شخص کو اپنے اپنے ذوق اور جذبات کی تسکین کے لیے اس میں پورا سامان مل جاتا ہے کہیں تاریخی عمارتوں کا ذکر ہے تو کہیں فصل خزاں میں نرگس و لالہ کی بے نوائی اور زاغ و زغن کی ہنگامہ خیزی کا بیان ہے کہیں موسم بہار میں شاخ گل کی شمیم انگیزی اور عندلیب و قمری کا نغمہ سرائی کی مصوری ہے تو کہیں نوروز کی نشاط انگیزی اور اس کے جشن کے کیف و انبساط کی نقاشی ہے کہیں تیغ اور تیر و کمان کی قلمی تصویریں کھینچی گئی ہیں تو کہیں ہاتھی گھوڑے کشتی قلم دوات کاغذ پر مسلسل نظمیں لکھی گئی ہیں۔ کہیں بادہ و ساغر کی گردش اور جام و مینا کے ذریعہ مدہوشی و سرمستی چنگ و رباب دف و نے اور مطرب و مغنیہ کے طرب و نشاط کی نقش آرائی ہے۔ قران السعدین کی یہی بوقلمونی اور رنگا رنگی اس کو فارسی زبان میں ایک امتیازی درجہ بخشتی ہے۔

ترتیب دیوان تحفۃ الصغر جب ابھی ۲۰ سال ہی کے تھے تو اپنا ایک دیوان تحفۃ الصغر کے نام سے مرتب کر لیا جس میں تقریباً ۳۵ قصیدے پانچ ترکیب بند کچھ متفرقات اور ایک مثنوی ہے قصیدے غیاث الدین بلبن شہزادہ سلطان محمد اور بلبنی دربار کے امراء امیر علی حاتم خان۔ اختیار الدین کشلی خان شمس الدین قوام الملک اور عزیز الدین وغیرہ کی شان میں ہیں ایک ترکیب بند میں اپنے نانا عماد الملک کی وفات پر مرثیہ کہا ہے۔ مثنوی میں قلعہ پٹیالی کے بد تہذیب اور وحشی افغانوں کی ہجو ہے۔

جلال الدین خلجی کے عہد میں مفتاح الفتوح لکھی گئی اور علاء الدین کے زمانہ میں اس کے ولی عہد خضر خان اور راجہ گجرات کی لڑکی دولرانی کے معاشقہ اور شادی کے واقعات کو نظم کیا ہے اس مثنوی میں اس دور کے بہت سے تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں اس کا سال تصنیف ۷۱۵ھ ہے نظامی کے جواب خمسہ یعنی پانچ مثنویاں بھی علاء الدین ہی کے عہد میں لکھیں اور اسی کے نام معنون کیں۔ علاء الدین کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کے

Marfat.com

زمانہ کا ذکر نُہ سپہر میں ہے یہ مثنوی ۱۳۱۸ء میں لکھی گئی۔ امیر کی آخری تاریخی مثنوی تغلق نامہ ہے۔ جس میں خسرو خان کی بغاوت اور تخت دہلی کے غصب کرنا اور ملک تغلق کا اس کے خلاف خروج کرنا بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان کے علاوہ سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحاتِ دکن پر ایک مفصل کتاب خزائن الفتوح کے نام سے لکھی۔ امیر خسرو کی تاریخی تصانیف میں واقعات کی بعض وہ تفصیلات مل جاتی ہیں جو کہیں اور موجود نہیں اس کے علاوہ انہوں نے ضروریات شعری کے باوجود تاریخی واقعات کی صحت کا اس قدر التزام کیا ہے۔ اکثر اوقات ان کے بیانات کو مؤرخوں نے دوسری ہمعصر شہادتوں پر ترجیح دی ہے۔

طلبار تاریخ کے لیے ان کو سب سے زیادہ مفید اور اہم تالیف فوائد الفواد (یعنی مجموعہ ملفوظات شیخ نظام الدین اولیار رح) ہے[1]

اس میں صرف شیخ کی تعلیمات اور بہت سے سماجی مسائل پر ان کے خیالات میں موجود نہیں بلکہ تاریخ سے متعلق کافی معلومات ہی درج ہیں

نوٹ: خزائن الفتوح۔ تغلق نامہ۔ نہ سپہر کی تفصیلی بحث اگلے سوال میں دیکھیے۔

سوال امیر خسرو کی مندرجہ ذیل کتب پر بحیثیت تاریخی ماخذ تبصرہ کیجیے

۱۔ خزائن الفتوح ۲۔ تغلق نامہ ۳۔ نُہ سپہر

۱۔ خزائن الفتوح

اس کتاب کا دوسرا مشہور نام "تاریخ علائی" ہے اس کے علاوہ اسے "سرور الروح" اور فتح نامہ بھی کہا گیا ہے۔ تاریخ کی یہ اہم کتاب ۷۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔ اس میں سلطان علاء الدین محمد خلجی کی گورنری کے زمانے یعنی فتح دیوگیر کے سال ۶۹۵ھ سے ۷۱۱ھ تک کے عہد حکومت کے حالات و واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ یہ واقعات زیادہ تر مصنف کے چشم دید ہیں۔ اس لیے کہ کتاب بے حد اہمیت کی حامل ہے۔

"خزائن الفتوح" کی نثر بھی لفظی صنائع بدائع سے بھری پڑی ہے۔ خسرو نے اپنے خاص اسلوب کو اس تصنیف میں بڑی مہارت اور فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تواریخ کے اندراج میں فن معمہ گوئی سے بھی کام لیا ہے۔ جگہ جگہ اپنے عربی اشعار بھی استعمال کیے ہیں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶

Marfat.com

اس کے باوجود یہ بات بلاتردید کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے تاریخی واقعات کی صحت کا بھی خاص خیال رکھا ہے اور کسی واقعہ کو فن اور اسلوب پر قربان نہیں ہونے دیا۔

اس کتاب میں شامل واقعات یہ ہیں۔

دیوگیر کی فتح۔ دہلی کی فتح اور تخت نشینی۔ مغلوں کے خلاف جنگ آزمائی اور ان کی شکست کا بیان۔ گجرات، رنتھنبور اور مالوے کی فتوحات۔ چتوڑ کی مہم۔ سیرانہ کی تسخیر۔ تلنگانہ اور معبر کا ملک کافور کے ہاتھوں فتح ہونا وغیرہ اس کے علاوہ جامع مسجد شہر دہلی کی فصیل۔ حوض شمسی اور مینار وغیرہ کی تعمیر کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ خزائن الفتوح ۱۹۲۷ء میں مطبع انسٹی ٹیوٹ علیگڑھ سے شائع ہوئی۔

۲۔ تغلق نامہ

اس مثنوی میں غیاث الدین تغلق کے عہد کے حالات نظم کیے گئے ہیں تغلق نامہ کا مخطوطہ چونکہ مکمل حالت میں اب تک نہیں ملا۔ اس لیے یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا سال تصنیف کیا تھا۔ البتہ یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ مثنوی خسرو کی عمر کے آخری دنوں کی تصنیف ہے۔

اس مثنوی سے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ خسرو کی یہ تصنیف کسی وجہ سے ضائع ہو چکی ہے اور اب اس کا نام ہی تاریخ و تذکرہ کی کتب میں محفوظ رہ گیا ہے۔ لیکن اتفاق سے حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے کتب خانہ سے اس کا ایک مخطوطہ " جہانگیر نامہ " کے نام سے مل گیا اس نسخے کو مولانا رشید احمد صاحب نے مرتب کرنا شروع کیا۔ لیکن ان کی وفات کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ بعد ازاں جناب سید ہاشمی فرید آبادی کو اسی نسخے کی ایک اور نقل مل گئی۔ انہوں نے ان دونوں نسخوں کے تقابل سے " تغلق نامہ " کو مرتب کر کے ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد (دکن) سے شائع کیا۔

مذکورہ مخطوطات کا نام " جہانگیر نامہ " رکھنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہانگیر بادشاہ نے مولانا حیاتی کاشی کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اس نامکمل نسخے میں اشعار کا اضافہ کر کے مکمل کر دیں۔ مولانا حیاتی نے اس میں ایک سو اناسی (۱۷۹) شعروں کا اضافہ کر کے " جہانگیر نامہ " کے نام سے دربار جہانگیر میں پیش کیا۔ " ہفت اقلیم " کے مؤلف امین احمد رازی کا بیان ہے کہ اس مثنوی میں تین ہزار (۳۰۰۰) شعر تھے۔ لیکن موجودہ مثنوی میں مولانا حیاتی کے ایک سو

Marfat.com

اناسی شعروں سمیت کُل تعداد دو ہزار سات سو سترہ (۲۷۱۷) ہے گویا چار سو باسٹھ (۴۶۲) اشعار اصل تصنیف کے گم ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر اس مثنوی کی تکمیل سے پہلے حضرت امیر خسرو کی وفات نہیں ہو چکی تھی۔ تو اس مثنوی میں بھی سال تصنیف وغیرہ کے اشعار ضرور شامل کیئے گئے ہوں گے جو حضرت امیر کا معمول رہا ہے۔

نہ سپہر یہ مثنوی جمادی الاول ۷۱۸ھ میں مکمل ہوئی۔ امیر خسرو اس وقت سرسٹھ برس کے تھے "نہ سپہر" قطب الدین مبارک شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی اس کی تکمیل پر آپ کو ہاتھی برابر سونا دیا گیا۔

خسرو نے اس مثنوی کو نو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کو "سپہر" کا نام دیا ہے اور ہر سپہر کو کسی نہ کسی ستارے سے متعلق کہا ہے۔ تمام حصے بحر کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں حمد و نعت ذکر معراج اور مدح مرشد کے بعد مبارک خلجی، شہزادہ خسرو خان کی فتوحات دہلی کی شان و شوکت ہندوستان کی تعریف اپنی خوش بختی اور مشتری سے عقیدت اور شہزادے محمد کی پیدائش وغیرہ اس مثنوی کے خاص موضوعات ہیں یہ مثنوی خسرو کی داستان سرائی کا بہترین نمونہ ہے۔ پہلی بار مثنوی "نہ سپہر" ڈاکٹر وحید مرزا نے مرتب کر کے ۱۹۴۸ء میں کلکتے سے شائع کی۔[1]

خزائن الفتوح میں خسرو نے علاء الدین کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے پیش کردہ کچھ واقعات اختلافی ہیں۔ مثلاً ۹۶-۱۲۹۵ میں دیوگیر کی مہم میں علاء الدین خلجی کے کردار اور اس کی کاروائیوں کی بھرپور تصویر کشی کی ہے اس سلسلہ میں وہ سابقہ سلطان کے قتل کا ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کے سلسلہ میں ضیاء الدین برنی اور عصامی نے سابقہ سلطان کے قتل کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] ان تینوں تاریخی کتب کا مواد "کلیات وغزلیات خسرو" مرتبہ اقبال صلاح الدین ایم۔اے پیکجز لمیٹڈ ۱۹۷۲ء سے ماخوذ ہے۔ طلباء کو امیر خسرو کے حالات زندگی اور ان کی کتب سے متعلق تفصیلی مطالعہ کے لیے مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

بقولِ خسرو ــــــ علاء الدین خلجی کے فنِ حکومت اور فنِ سپہ گری کے بارہ میں
الفاظ کا سہارا لینا عبث ہے۔ خسرو نے علاء الدین خلجی کے چند نمایاں کارہائے نمایاں
کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اُس نے اصلاحِ احوال کے لیے کیا کچھ کیا۔ علاء الدین خلجی نے
خزانہ کی حفاظت کی۔ بکری پر ٹیکس گھٹا دیا تاکہ اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھنے نہ پائیں۔ دکانداروں
کے رویہ کے جائزہ کے لیے نگران مقرر کیے۔ سلطان کا انصاف بھی انتہائی قابلِ قدر تھا۔ اس
نے شراب نوشی ممنوع قرار دے دی۔ طوائفوں کی آزادانہ نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی
اس نے حکومتی گوداموں میں غلہ جمع کر رکھا تھا تاکہ قحط یا گرانی کے دور میں اُسے منڈی میں لایا
جا سکے۔ اُس نے مناسب داموں پر کپڑا اور پھل خریدنے والوں کے لیے ایک مارکیٹ بھی
بنوائی۔

امیر خسرو نے ان عمارات کا ذکر بھی کیا ہے جو علاء الدین نے مذہبی جذبات کے
اظہار کے لیے بنوائی تھیں۔ اس سلسلہ میں خسرو نے حوضِ شمسی کی صفائی کا تذکرہ بھی کیا
ہے اور بتایا ہے کہ اس حوض کی صفائی کے بعد بارش نہ ہوئی تو علاء الدین نے حضرت موسیٰ
کی طرح دُعا مانگی جو قبول ہوئی۔

امیر خسرو نے علاء الدین کی فتوحات کی تفاصیل یعنی خزائن الفتوح کے صفحات کی
زینت بنائی ہیں۔ وہ علاء الدین کو "سکندرِ زماں" کے نام سے پکارتے ہوئے ان فتوحات
کا ذکر پہلے کرتا ہے جو منگولوں کے خلاف حاصل ہوئیں۔ منگولوں پر چار بار فتوحات پائی گئیں۔
علاء الدین کی ان فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد خسرو نے مدح سرائی کے رنگ میں الفاظ کی
پرکاری سے پورا پورا کام لیتے ہوئے، علاء الدین کی گجرات، راجستھان، مالوہ اور دیوگری
میں فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ سومنات پر حملہ، مانڈو پر یلغار وغیرہ کو خوب تلمیحی انداز میں
بیان کیا ہے۔ مالوہ کی فتح کا تذکرہ کرتے ہوئے خسرو نے آنکھوں کو عجیب استعاراتی
انداز بخشا ہے۔ زمینداروں کے خوف اور قبولیتِ اطاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔
"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کھلی آنکھیں یہ کہ دہلیز پر جھک جائیں اور اس
دہلیز کو آنکھوں کی سُرمئی پتلیاں مل مل کر سیاہ رنگ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اسی طرح چتوڑ کی
فتح کا حال لکھا ہے۔ ارنگل کی فتح کے حال کے سلسلہ میں جو کچھ اس نے بیان کیا ہے اُس کے بارہ
ناموزوں یوں رقمطراز ہے۔

Marfat.com

"اب میں تلنگ کی فتح کا حال بیان کروں گا اور اس طرح بیان کروں گا کہ پائے تخیل میرے قلم کی رفتار کا ساتھ دینے سے عاجز آجائیں گے ....." اس سلسلہ میں پیشقدمی اور ارنگل کی فتح سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کا حال بھی بیان کرتا ہے۔ الفاظ کی رنگا رنگی اور تلمیحی فسوں کاری جا بجا نمایاں ہے۔

خزائن الفتوح میں آخری قصیدہ کے طور پر ملک کافور کی مہمات کا ذکر کیا ہے جو معبّر کے سلسلہ میں سرانجام دی گئی تھیں۔ امیر خسرو کے بقول دین محمدیؐ کے فروغ کے لیے سلطان عزم وجا نے ہند کے اس دور دراز جنوبی علاقہ کی فتح کا ارادہ کیا۔ خسرو کے مطابق تیز رفتاری سے چلنے والا شخص معبّر تک بارہ ماہ میں پہنچ سکتا تھا۔ لکھتا ہے۔

"روئے ارضی گوں ناگوں اسپ سواروں کے سبب اوراق شاہنامہ معلوم دیتا تھا۔ یوں کہیے کہ آسمان سے بہمنوں کا مینہ برساتھا۔ یہ کہ سہرابوں اور کا سیلاب چارسو رواں دواں تھا۔ ہزارہا رستم کمانوں سمیت ہر طرف پھیلے نظر آتے تھے ....."

خسرو کے نزدیک معبّر سے جو کچھ ملا وہ ناقابل بیان ہے۔ کتاب کے آخر میں خسرو دعا کرتا ہے کہ کتاب دربار شاہی میں شرف قبولیت حاصل کر سکے۔

Marfat.com

سوال۔ ضیاء الدین برنی کے حالات زندگی تفصیل سے بیان کیجئے۔

جواب۔ ضیار الدین برنی کے اجداد اور خاندان کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ چونکہ وہ خود کو برنی کہتا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مولد اور وطن بلند شہر (برن) تھا۔ برن گنگا اور جمنا کے دوابہ کے قدیم ترین شہروں میں تھا۔ ۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے اس کو فتح کیا لیکن یہ اس علاقے میں شامل نہ تھا جس پر اس نے اپنی حکومت قائم کی تھی سلطان معزالدین محمد بن سام کے زمانہ میں یہ دوسری بار فتح ہوا۔ اور اب سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا۔ دہلی کا عظیم حکمران سلطان شمس الدین التمش (ف ۱۲۳۶ء) تخت نشینی سے پہلے برن کا عامل تھا۔ زمانے کا تعین تو مشکل ہے لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی فتح کے بعد علماء، مشائخ اور دیگر اشراف کے بعض خاندانوں نے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی اور سلطنتِ دہلی کے قیام کے وقت برن کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ برنی نے اپنے اجداد یہاں تک کہ اپنے دادا کا بھی ذکر نہیں کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے خاندان کا شرفار کے خاندانوں میں شمار تھا۔ امیر خورد نے اس کے باپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "از دودمان بزرگ بود" یعنی بہت بڑے خاندان میں سے تھا۔ اس کے علاوہ برنی نے اپنی تصانیف میں علو نسب پر اتنا زور دیا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کا خود بھی تعلق کسی اعلیٰ خاندان ہی سے تھا۔ عالی نسبی کے علاوہ اس کے اجداد بلند عہدوں پر بھی فائز ہوں گے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ایک موقع پر برن کے چچا علاء الملک کو وزیر زادہ کہا ہے[1]۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اجداد اہم عہدوں پر فائز تھے جو برنی نے بھی اپنے باپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "پدر ایں ضعیف شریف"[2] یعنی میرے والد صاحب اشراف میں سے تھے۔ برنی نے اپنے باپ اور چچا کا ذکر مؤید الملک اور علاء الملک کے ناموں سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام نہیں بلکہ حکومت کے عطا کئے ہوئے خطابات تھے اس طرح ان دونوں کے نانا کا ذکر سپہ سالار حسام الملک کہہ کر کیا ہے۔ یہ بھی یقیناً خطاب تھا۔ حسام الملک بلبن کے امراء میں شامل تھا۔ لکھنوتی کی مہم میں جب سلطان کو طغرل کی تلاش میں آگے جانا پڑا تو اس نے وہاں کی شحنگی پر اسی کو مقرر کیا تھا[3]۔ جس طرح سپہ سالار حسام الملک سلطان بلبن کے معتمد امراء میں شامل تھا۔ اس طرح اس کے نواسے علاء الملک نے سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد میں بہت عروج حاصل کیا اور اعتبار اور اعتماد کے لحاظ سے صفِ اول کے امراء میں شمار کیا جاتا تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد علاء الدین نے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵۰ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵۰ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۸۷ ۔

Marfat.com

اس کو دہلی کا کوتوال مقرر کیا تھا اس لیے کہ وہ بہت زیادہ موٹا تھا ورنہ اپنی خدمات اور قابلیت کے لحاظ سے وہ وزارت ہی کا مستحق تھا۔ بہرحال اس کے مشوروں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ حکومت کے ابتدائی دور میں جب علاء الدین کے دماغ میں یہ خبط سما گیا تھا کہ وہ ایک نئے دین کی بنیاد رکھ کر اس کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اور ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے تو اس وقت صرف علاء الملک نے ہی یہ جرأت دکھلائی کہ اس مسئلے پر سلطان کو مشورہ دیا اور یہ حماقت آمیز خیال اس کے دل سے نکالا یہ نازک اور خطرناک کام وہ امیر ہی انجام دے سکتا تھا جس کو سلطان کا اعتماد حاصل ہو۔ برنی کا باپ مؤیدالملک برن میں متعین تھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں وہ اس کے بیٹے شہزادہ ارکلی خان کا نائب تھا۔ اس کی والدہ سادات کیتھل کے ایک خاندان سے تھیں[1]۔ مؤیدالملک نے جلال الدین ہی کے عہد میں کیلوکھری یا شہر نو میں ایک شاندار مکان بنوالیا تھا چنانچہ برنی ایام طفولیت ہی میں دہلی آ گیا ہوگا اور اس کی تعلیم کا زمانہ یہیں گزرا۔ اس نے اپنی تعلیم کی تفصیلات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ صرف یہ بتلایا ہے کہ جلال الدین کے عہد میں اس نے قرآن ختم کر لیا تھا اور لکھنا سیکھ لیا تھا۔ آگے کی یعنی اعلیٰ تعلیم کہاں اور کس طرح حاصل کی۔ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ برنی نے جیسے امیر خورد "عالم دل پذیر" "مجمع اللطائف" اور "جوامع الحکایات" کہتا ہے۔ اپنے عہد کے بہترین اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہوگا۔ کیونکہ اس مصنف کے الفاظ میں اس کو صحبت علماء و مشائخ و شعراء سے "کامل حصہ" تھا۔[2]

بے محل نہ ہوگا کہ یہاں یہ ذکر کر دیا جائے کہ دہلی نے جسے دارالحکومت بنے ہوئے اسی سال کی مدت گزر چکی تھی۔ اسلامی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ انتہائی عروج پر سلطان علاء الدین اور محمد بن تغلق کے عہد میں پہنچی لیکن التتمش اور بلبن کی کامیاب حکومتوں کی وجہ سے خاص طور پر اس لیے کہ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے برصغیر کے علاقوں کو چنگیز خانی مغلوں کی یلغاروں سے محفوظ رکھا تھا۔ سلطنت دہلی بالخصوص اس کا دارالحکومت ان علماء و مشائخ امراء و خوانین اور اہل حرفہ و صنعت کاروں کا ملجا و ماویٰ بن گئی تھی جو تاتاریوں کے خون خوار حملوں اور ان کی غارت گری اور خوں ریزی کا شکار ہو جانے سے بچنے کے لیے اپنے قدیم وطنوں کو چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔ اور یہیں کی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان ہی حالات کا نتیجہ تھا کہ علاء الدین خلجی کے عہد میں برنی کے بیان کے مطابق ایسے اساتذہ اور علماء موجود تھے جن کی مثال بخارا، سمرقند، بغداد، مصر

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۶۱-۷۱ [2] ایضاً ص ۳۵۰

Marfat.com

خوارزم۔ دمشق۔ تبریز۔ اصفہان، روم اور رے کے لیے دنیا کے کسی حصے میں نہیں مل سکتی تھی۔ اور جن میں بعض اپنے علم و کمالات کی وجہ سے غزالی اور رازی کے ہمسر کہے جا سکتے تھے۔ ان ہی میں بعض برنی کے استاد تھے اور بعض کی صحبت کا اس کو شرف حاصل تھا[1]۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ برنی کی تعلیم بہترین ماحول اور بہترین اساتذہ کے زیر سایہ ہوئی۔ دینی علوم کے علاوہ جن کا اس زمانہ میں عام رواج تھا اس کی تصنیف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے اس نے جو محنت کی ہے اس کا اندازہ دوسرے لوگ آسانی سے نہیں لگا سکتے۔ اس نے فلسفہ تاریخ پر بھی کسی حد تک غور کیا ہے اور اس فن کی بعض خوبیاں اپنے مخصوص انداز میں بیان کی ہیں جن کی طرف آئندہ صفحات میں اشارہ کیا جائے گا۔ لیکن یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کی تبلیغی کوششوں اور ان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے فیوض و برکات کی وجہ سے اسلامی معاشرے پر تصوف کا گہرا اثر مرتب ہو چکا تھا اور ہر طبقے کے لوگ اس سے متاثر تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے خلیفہ بابا فرید شکر گنج کے زمانہ میں جنہوں نے اجودھن (یعنی پاک پٹن) میں قیام فرما کر دین اور اپنے سلسلے کی اشاعت کی۔ تصوف کو بہت فروغ ہوا۔ ان کے خلیفہ شیخ نظام الدین اولیاؒ بلبن کی تخت نشینی سے پہلے ۱۲۵۹ء میں دہلی آئے اور اپنی وفات تک جو ۱۳۲۵ء میں واقع ہوئی وہیں قیام کیا۔ دہلی اور دوسرے علاقوں کے ہزاروں آدمیوں کو ان سے عقیدت تھی اور ان میں سے بہت بڑی تعداد ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھی جن میں شہزادوں اور امراء و خوانین کے علاوہ علماء فضلاء شعراء اور مختلف طبقات کے اہل کمال موجود تھے برنی کا باپ مؤید الملک بھی شیخ کے عقیدت مندوں میں تھا۔ اس نے بچپن ہی میں اپنے بیٹے کو ان سے بیعت کرا دیا چنانچہ مرشد کے زیر سایہ رہنے کی غرض سے اس نے بھی غیاث پور ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی[2]۔ یہیں اس کا انتقال ہوا اور شیخ کے مزار کے قریب ہی اس کو دفن کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر برنی نے کیا شغل اختیار کیا۔ اور دربار سے اس کا تعلق کس وقت اور کس حیثیت سے شروع ہوا۔ یہ بہرحال یقینی ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں

---

[1] فیروز شاہی ص ۲۵۲۔ ۲۰۵۔ [2] سیر الاولیاء، ص ۲۱۲۔

Marfat.com

وہ اس کے دربار سے بحیثیت ندیم منسلک تھا اور سترہ سال سے زائد اس کا یہ تعلق قائم رہا۔ اس کے خود اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان اس پر بہت مہربان تھا اور انعام واکرام سے اس کو نوازتا رہتا تھا اور اس پر اعتبار بھی کرتا تھا اس نے خود لکھا ہے کہ اتنے انعام واکرام نہ میں نے کبھی اس کے عہد سے پہلے حاصل کیے تھے اور نہ بعد میں ایسے انعامات کا خواب دیکھ سکتا ہوں۔ سلطان محمد کو برنی پر کس قدر اعتماد تھا۔ اس کا اندازہ اس گفتگو سے لگایا جا سکتا تھا جو سلطان اور اس کے درمیان خود سلطان کی خواہش پر اس کی حکمتِ عملی کے متعلق ہوئی اور جس کا اس نے اپنی تاریخ میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

برنی کی حق پسندی۔ سلطان محمد بن تغلق اور ضیاء برنی: جب سلطان محمد بن تغلق کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ بہت زیادہ بڑھ گیا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرح ختم نہ ہوگا تو سلطان کو قدرے تشویش ہوئی اس نے رمضان کے مہینے میں رات کے پچھلے پہر بلا کر مشورہ کیا کہ مملکت میں بغاوتوں کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ان کے جرائم پر میں سزائیں دیتا ہوں۔ اور ان کو قتل کراتا ہوں۔ لیکن اس سے کچھ فائدہ ہونے کی بجائے فتنے کی آگ اور زیادہ بھڑکتی ہے سلطان کی خونریزی اور لوگوں کو قتل کرانے کا سلسلہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ خود اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس نے برنی سے سوال کیا کہ اس نے تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس کو یہ بتلائے کہ دوسرے حکمرانوں نے سزائے موت کون کون سے جرائم پر دی ہے[1] یہ گفتگو خاص طور پر برنی کے جوابات اتنے اہم ہیں کہ ہم ان کو قدرے تفصیل سے لکھ سکتے ہیں۔ برنی نے ان جوابات کو تاریخ خسروی کے حوالے سے جمشید کے اقوال بتلا کر پیش کیا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خود اس کے تصورات پر مبنی ہیں اور ہم ان کو برنی اور اس کے عہد کے فلسفۂ سیاست و تعزیرات کی تصویر کا ایک گوشہ کہہ سکتے ہیں۔ برنی نے کہا کہ بادشاہوں نے مندرجہ ذیل سات موقعوں پر سزائے موت کو جائز سمجھا ہے یعنی مندرجہ ذیل سات قسم کے مجرموں کو قتل کرا دینا درست ہے!

۱۔ اس شخص کو جو دینِ حق کو چھوڑ دے۔ اور اس پر اڑا رہے۔
۲۔ اس شخص کو جو عمداً کسی ایسے شخص کو قتل کر دے جو حکومت کا مطیع ہو۔
۳۔ اس شخص کو جس کی بیوی موجود ہو اور وہ دوسرے شخص کی بیوی سے زنا کرے۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۰۹

Marfat.com

۴ - اس شخص کو جو بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنے کا فیصلہ کرے اور اس کا قصد تحقیق سے ثابت ہو جائے۔

۵ - اس شخص کو جو باغیوں کا سرغنہ بنے اور بغاوت کا انتظام کرے۔

۶ - بادشاہ کی رعایا میں اس شخص کو جو بادشاہ کے دشمن کا ساتھ دے یا بادشاہ کی مخالفت اور ہمسری کرے اور اس کے دشمن کو اسلحہ فراہم کرنے میں یا کسی دوسرے سے مدد کرے اور اس کا یہ فعل ثابت ہو جائے

۷ - اس شخص کو جو بادشاہ کے حکم کی نافرمانی کرے اور اس نافرمانی سے ملک کو نقصان پہنچے لیکن ایسی نافرمانی کرنے والے کو نہیں جس کی نافرمانی سے ملک کو نقصان نہ پہنچے۔ اس جرم یعنی نافرمانی کے سلسلے میں ملک کے نقصان کی شرط ضروری ہے اس لیے کہ یوں تو لوگ خدا کی بھی نافرمانی کرتے ہیں لہٰذا بادشاہ کی نافرمانی پر جو خدا کا نائب ہے وہ کس طرح سزائے موت کے مستوجب ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر کسی شخص کی نافرمانی سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے اور پھر بادشاہ اس کو سزائے موت نہیں دیتا تو پھر اس کا ملک تباہ ہو جائے گا۔[1]

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ برنی کے خیالات میں ان میں پہلے تین جرم یعنی (۱) ارتداد (۲) قتل اور (۳) زنا وہ ہیں جن کی اسلامی قوانین کے مطابق سزائے موت ہے۔ باقی چار حکومت اور حکمران کے خلاف بغاوت یا سازش سے متعلق ہیں جن کی سزا بالعموم موت ہوتی ہے۔ برنی کی یہ جرأت قابلِ تحسین ہے کہ اس نے سلطان محمد جیسے سخت مزاج بادشاہ کے سامنے جو ذرا ذرا سی بات پر قتل کا حکم دے دیتا تھا۔ یہ صاف طور پر کہہ دیا کہ بادشاہ کی محض نافرمانی پر کسی کو موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے یہ لازمی شرط ہے کہ سلطان' برنی کے مشورے پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک مخصوص مزاجی کیفیت رکھتا تھا اور اس سے مجبور تھا چنانچہ اس نے برنی کے مشورے کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ جمشید کی سیاست قدیم زمانے کے لوگوں کے لیے مناسب تھی۔ میرے زمانہ میں لوگ بہت زیادہ شریر اور فتنہ پرور ہیں اور میں ان سزاؤں کا سلسلہ اس وقت تک بند نہیں کروں گا۔ جب تک یا تو وہ راہِ راست پر آئیں اور بغاوتیں بند کر دیں، یا میں ختم ہو جاؤں برنی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جمشید ہی کا قول ہے کہ بادشاہ کو

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۰

Marfat.com

ایسے وزرار مقرر کرنے چاہئیں جو قوانین نافذ کر کے ملک کے حالات میں استقامت پیدا کر سکیں تاکہ بادشاہ کو قتل و خون ریزی کرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ سلطان نے فوراً جواب دیا کہ میرے پاس ایسے وزیر موجود نہیں جو ایسے حالات پیدا کر دیں کہ مجھے خون ریزی کی ضرورت نہ پڑے۔[1]

ایک اور موقع پر جب کہ سلطان محمد دکن اور گجرات کی بغاوتیں فرو کرنے میں مصروف تھا۔ برنی اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے امیران صدہ اور طغی کی بغاوتوں کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ اگر میں تمام امیران صدہ کو پہلے ہی قتل کرا دیتا تو مجھے یہ پریشانیاں اٹھانا نہ پڑتیں۔ برنی جانتا تھا کہ بغاوتوں کا سلسلہ ان اقدامات سے ختم نہیں ہو سکتا جو سلطان کے ذہن میں ہیں وہ سمجھتا ہے کہ قتل و خون ریزی کے ذریعہ وہ بغاوتوں کا سلسلہ بند کر سکتا ہے۔ حالانکہ اس سے وہ آگ زیادہ پھیلتی جا رہی ہے یہ وہ تلخ حقیقت تھی جس کے اظہار کے لیے برنی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ اس پر افسوس کرتا ہے کہ خوف کی وجہ سے وہ سلطان کے سامنے صحیح بات نہیں کہہ سکتا۔[2]

آخر زمانے میں حسن کانگو کی بغاوت سے پریشان ہو کر ایک مرتبہ پھر سلطان نے برنی سے بغاوتوں کے مسئلے پر گفتگو کی۔ اور اس سے مشورہ طلب کیا کہ آخر اس بیماری کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ برنی جو حقیقت حال سے بخوبی واقف تھا۔ سلطان کو بتلایا کہ اکثر ایسے موقعوں پر بادشاہوں نے تخت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور حکومت و تخت اپنے بیٹے یا کسی اور سپرد کر دیا ہے کیونکہ حکومت کے لیے عوام و خواص کے دلوں میں تنفر کا پیدا ہو جانا ایک مہلک مرض ہے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا کہ میرے دل میں بھی یہی خواہش ہے کہ اگر مملکت کے معاملات، میرے حسب منشا ٹھیک ہو جائیں تو میں حکومت کا کام ان تین آدمیوں یعنی فیروز شاہ، ملک کبیر اور ملک احمد ایاز (پر مشتمل ایک کونسل) کے سپرد کر دوں گا اور خود خانہ کعبہ چلا جاؤں گا۔ لیکن اب تو لوگ مجھ سے بیزار ہیں اور میں لوگوں سے بیزار ہوں۔ اور باغیوں مخالفوں نافرمانوں اور بدخواہوں کا علاج میرے پاس صرف تلوار ہے۔ سلطان کی اس پالیسی کا نتیجہ ہم کو معلوم ہے بغاوت فرو کرنے کے لیے وہ تلوار استعمال کرتا تھا۔ لیکن اس خون ریزی کے نتیجہ میں مزید بغاوتیں ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۱۳۵۱ء میں سلطان نے ٹھٹھہ کے قریب اپنی لشکر گاہ میں وفات پائی۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۱ [2] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۶، ۵۱۷

Marfat.com

کی زندگی اور ان کا ذکر بہت کم ہوتا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ مسلمانوں نے علمی و ادبی تاریخ اور علماء اور فضلاء کے حالات پر متعدد اور مستند کتابیں لکھیں جو انتہائی مفید معلومات سے پُر ہیں لیکن جہاں تک سیاسی یا تاریخی تصانیف کا تعلق ہے وہ زیادہ تر حکمرانوں اور حکومتوں ہی سے متعلق ہیں۔ چودھویں صدی میں ابن خلدون عالم اسلام ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں پہلا شخص ہے جس نے تاریخ کے تصور کو وسعت دے کر انسان کی اجتماعی اور عمرانی زندگی کو اس کا موضوع قرار دیا۔ فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ کا جہاں تک تعلق ہے۔ یہ اس کا لاثانی کارنامہ ہے۔ برنی کی وفات کے وقت ابن خلدون کی عمر چھبیس سال تھی۔ اس نے اپنا مشہور مقدمہ اس کے بیس سال بعد یعنی ۱۳۷۸ء میں تحریر کیا۔ اس لیے برنی کا اس سے استفادہ کا سوال نہیں۔ لیکن برنی کی تاریخ میں ہمیں کہیں کہیں عوام کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اس کے علاوہ اس نے تاریخ فیروز شاہی کے دیباچہ میں فن تاریخ اور خود اپنی تاریخ کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔

برنی کو تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دینی علوم یعنی تفسیر حدیث فقہ اور طریقت کے بعد کوئی دوسرا علم تاریخ سے زیادہ نفع بخش نہیں۔ یہاں یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ برنی کی نظر میں تاریخ کا موضوع انبیاء، خلفاء سلاطین اور بزرگان دین و دولت کے اخبار و آثار ہیں۔ وہ بداخلاق، سفلوں اور بازاری لوگوں کے حالات کو تاریخ میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ تاریخ کے اس تصور کا برنی کے کردار اور اس کی تربیت سے گہرا تعلق ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان کے لوگوں کے بہ کثرت اسلام میں داخل ہونے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا تھا۔ کہ مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے خیالات ہندوؤں کی رسوم اور تصورات سے ایک حد تک متاثر ہو گئے تھے۔ اسلامی اصولوں کے لحاظ سے مسلم معاشرہ کی نمایاں خصوصیت انسانی برنی چاہیے برخلاف اس کے ہندو معاشرہ میں اعلیٰ و ادنیٰ ذاتوں کا فرق ضروری بلکہ لازمی ہے اس خصوصیت کا اثر ہمیں مسلم معاشرہ میں زیادہ تو نہیں مگر کسی حد تک ضرور ملتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ برنی کی کتاب میں اعلیٰ و ادنیٰ طبقات کا ذکر جن کو وہ اشراف و اراذل کہتا ہے بار بار آتا ہے تاریخ کو وہ ایک نفیس اور اعلیٰ شعبہ علم سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کے خیال میں اراذل کے لیے یہاں گنجائش نہیں[1]۔

لیکن بہت جلد اس کو خیال آجاتا ہے کہ تاریخ کا دائرہ تو بہت وسیع ہے چنانچہ دو تین صفحوں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۹۔

Marfat.com

کے بعد ہی وہ تاریخ کے حدود کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے -

"وہ تاریخ میں گزشتہ لوگوں (سلف) کی نیکیوں اور بُرائیوں ان کے عدل اور ظلم استحقاق و عزا استحقاق خوبیوں اور کمزوریوں (مقابح) عبادات اور گناہوں اور ان کے اوصاف اور رذائل کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ بعد کے زمانے میں پڑھنے والے اس سے عبرت حاصل کریں اور حکمرانی اور جہاں بانی کی خوبیوں اور نقصانات سے واقف ہو کر نیک کاموں کا اتباع کریں اور بدکرداری سے پرہیز کر سکیں" [۱]

اس میں شک نہیں کہ اس بیان میں وہ تاریخ کے دائرے کو بہت وسیع کر دیتا ہے لیکن یہاں بھی وہ تاریخ کے مطالعہ کا مقصد یہی بیان کرتا ہے کہ حکمرانوں اور ان کی حکمرانی کے نقائص اور ان کی کامیابیوں کا حال پڑھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے -

مختصراً برنی کے نظریہ تاریخ کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں تاریخ کا جو وسیع تصور ہے اس کے مقابلہ میں وہ تنگ اور محدود ہے لیکن اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے عام مؤرخوں سے بہت آگے نظر آتا ہے وہ بادشاہوں اور ان کے درباروں سے باہر آ کر ان کے نظم و نسق اور نیکو کاری و بدکاری کے اثرات کا بھی ذکر آتا ہے گاہ بہ گاہ ان پر تنقید بھی کرتا ہے اور عوام کے ردِ عمل کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس کا انداز بیان اس قسم کا ہے کہ اگر اس کی کتاب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہم کو اعلیٰ طبقات سے ہٹ کر دوسرے لوگوں کی زندگی اور مسائل کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر برنی برصغیر کے اکثر مؤرخوں پر فوقیت رکھتا ہے -

برنی کی نظر میں تاریخ کے فوائد برنی کے نظریہ تاریخ کی وسعت کا اندازہ لگانے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان فوائد اور خصوصیات کا بھی ذکر کریں۔ جن کی وجہ سے وہ اس علم کو اتنا مفید سمجھتا ہے اور اس سے گہری دلچسپی رکھتا ہے اس کے بیانات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اصحابِ بصیرت اس سے اسی طرح عبرت حاصل کر سکتے ہیں - جیسے کتاب سماوی سے - اس لیے کہ تاریخوں میں بھی انبیاء اور بعض سلاطین کے واقعات موجود ہیں۔ چنانچہ تاریخ کو بھی برنی سرمایۂ "اعتبار اولو الابصار" کہتا ہے - دوسری خوبی اس کی نظر میں تاریخ کی یہ ہے کہ اس کا حدیث سے بہت قریبی تعلق ہے۔ محدث کے لیے مؤرخ ہونا ضروری ہے مسلمانوں نے حدیث کے مطالعہ پر ہمیشہ بہت زور دیا ہے۔ اس کی ترویج و ترقی میں انہوں نے بے حد کوشش کی - اور آج بھی اسلامی علوم میں اس کا

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲ - ۱۳

Marfat.com

مقام بہت بلند ہے۔ حدیث کی تدوین و تنقید کے لیے تاریخ و تذکرہ کا مطالعہ ضروری ہے اس سلسلے میں محدثین نے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا اور کئی لاکھ راویوں کے حالات جمع کر لیے حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ حدیث کی جرح و تعدیل کے سلسلے میں انہوں نے تاریخی شواہد اور استناد کا معیار بہت بلند کر دیا۔ علم حدیث اور متعلقہ فنون کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ تاریخ کے مطالعے کا بھی رواج بڑھتا گیا اور چونکہ حدیث میں شہادت اور اسناد کا بلند معیار قائم ہو چکا تھا۔ تاریخ میں بھی ان لوگوں نے بڑی حد تک اسی اصول کا اتباع کیا۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائی دور کی تاریخوں مثلاً طبری کی مشہور تاریخ میں رواۃ کے سلسلے پر روایت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ فن تاریخ اور حدیث کے تعلق پر زور دینے سے برنی کا مطلب تاریخ کے مرتبے کو بلند کر کے دکھلانا ہے۔

تاریخ کے فوائد میں عام طور پر جس چیز کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے عقل و شعور کی تیزی و ترقی میں مدد ملتی ہے برنی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور تبلایا ہے کہ حکمرانوں کے لیے یہ خاص طور پر مفید ہے وہ اپنی مشکلات اور نازک حالات میں اس کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں دوسروں کی مشکلات اور مسائل اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا حال پڑھ کر ان میں ہمت اور ثابت قدمی پیدا ہو جاتی ہے اسی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ تاریخ ہزاروں سال کے تجربات انسانی مختصر وقت میں پیش کر دیتی ہے۔ ایک اور فائدہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ ہے کہ انبیاء اور صالحین کے حالات پڑھ کر انسان میں صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کی خو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح برے لوگوں کی مذموم حرکات اور ان کے برے نتائج کی تفصیلات پڑھ کر ماثم اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ میں جن لوگوں کے حالات درج ہوتے ہیں ان کا نام ہمیشہ کے لیے قائم رہ جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر تاریخ کا فن ایجاد نہ ہوتا تو انسان کے بڑے بڑے کارناموں اور ان کے انجام دینے والوں کا پتہ و نشان تک باقی نہ رہتا۔ ہر دور کے لوگ گذشتہ زمانے کے مشاہیر کے حالات سے رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ان ہی کی شہرت اور کامیابی سے لوگوں میں عظیم اور پر خطر کام انجام دینے کی خواہش اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح ایک دور کے کارنامے آئندہ دور کے کارناموں کی بنیاد اور پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور تہذیب و تمدن کی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ برنی نے تاریخ کے فوائد او منافع کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے

Marfat.com

کہ اس کے ذہن میں، فنِ تاریخ کی بنیادی خصوصیات اور اس کے فوائد کا صحیح خاکہ موجود تھا۔ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ دوسرے عظیم مؤرخوں کو ان فوائد کا اندازہ نہیں تھا۔ لیکن تاریخ فیروز شاہی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ اس میں ان کا ذکر ہے اور مصنف نے ان کے تجزیہ کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تاریخ نگاری کے شرائط تاریخ کے فوائد و منافع کا تجزیہ کرنے کے بعد برنی یہ بتلاتا ہے کہ مؤرخ میں کیا خوبیاں اور اوصاف ہونے چاہئیں۔ اس کے نزدیک ہر شخص مؤرخ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذہن میں معتبر اور کامیاب مؤرخ کی ایک خاص تصویر ہے جس کی بعض خصوصیات کا اس نے ذکر کیا ہے سب سے پہلی شرط وہ یہ بیان کرتا ہے کہ اس کو راست باز اور راست نگار ہونا چاہیئے یہ وہ خصوصیت ہے جس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بڑے بڑے راست نگار کے بعض بیانات غلط اور خلاف واقعہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی غلطیوں کا سبب ناقص معلومات یا غلط اندازہ ہو سکتا ہے۔ عمداً اس کو غلط واقعہ پیش کرنا نہیں چاہیے، راست نگاری پر زور دیتے ہوئے برنی ٹھیک کہتا ہے کہ یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ بغیر شہادت پیش کئے بھی جو بات وہ کہتا ہے اس پر لوگ اعتبار کرتے ہیں[1]

برنی کی نظر میں مؤرخ کا دیندار ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے اس کے کردار میں وہ خوبیاں پیدا ہو جائیں گی جو ایک دیانت دار اور مستند مؤرخ کے لیے لازمی ہیں۔ اس کا ذکر خود برنی نے قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مؤرخ کے لیے اس کی دینداری کی وجہ سے اور واجب ہو جاتا ہے کہ اگر وہ کسی حکمران یا کسی بڑے آدمی کے عدل و احسان اور اس کی خوبیوں اور کمالات کی تعریف کرتا ہے تو اس کی کمزوریوں اور عیبوں کو بھی ظاہر کرے اور تاریخ نگاری میں مصلحت اور خوشامد کا انداز نہ کرے۔ اگر وہ کسی مصلحت کی وجہ سے ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرنا نامناسب یا ناممکن سمجھتا ہے تو رمز و کنایہ میں ان کی طرف اس طرح اشارہ کرے کہ سمجھدار اور ذہین لوگ اس سے واقف ہو سکیں اگر وہ اپنے ہم عصروں کے نقائص اور ان کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور ان کو چھوڑ دیتا ہے تو ایک حد تک اس کو معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن گذشتہ عہد کے لوگوں کے واقعات اس کو بالکل ٹھیک ٹھاک لکھنا چاہیئے۔ برنی نے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴

Marfat.com

صاف الفاظ میں نہیں کہا لیکن اس کی عبارت سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے عہد اور اپنے ہم عصروں کے حالات و واقعات لکھتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں تاریخ نہیں ہو سکتی اس لیے کہ وہ ان واقعات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش نہیں کر سکتا۔ حقیقت پسندی پر زور دیتے ہوئے برنی آگے لکھتا ہے کہ اگر تاریخ لکھتے وقت مؤرخ کو کسی کی ذات سے کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا ہے تو اس کو بھول جانا چاہیئے یعنی ذاتی مفاد اور نقصان کو پیش نظر رکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر واقعات کو غلط رنگ نہ دینا چاہیئے اس کو ہم حقیقت پسندی کہتے ہیں جو صحیح تاریخ نگاری کی لازمی شرط ہے واقعہ یہ ہے کہ حقیقت پسندی کو ہاتھ سے نہ دینے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے لیے مؤرخ کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ذاتی تعلقات اور اثرات ہی نہیں اس کو حب الوطنی قومی عصبیت۔ نسلی، مذہبی اور معاشرتی تعصبات جیسے نازک جذبات اور احساسات کو بھی نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان ساری قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے حق اور حقیقت پسندی کی راہ پر قائم رہنا کس قدر دشوار ہے اور کتنے کم مؤرخ ہیں جو ان کمزوریوں سے مبرا ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خود ہمارے برصغیر کی تاریخ لکھنے والوں میں خاص طور پر مغربی مصنفین میں کتنے مشہور اور قابل مؤرخ ہیں جنھوں نے ان تعصبات سے مغلوب ہو کر ہماری تاریخ کے بعض ابواب کو بری طرح مسخ کر کے پیش کیا ہے قرون وسطیٰ کے عظیم مؤرخوں میں بھی ہیں۔ یہ کمزوریاں صاف نظر آتی ہیں مثلاً ابوالفضل کی قابلیت اور اس کی وسعت معلومات میں کون شک کر سکتا ہے اس کی دونوں کتابیں یعنی اکبرنامہ اور آئین اکبری تفصیلات اور معلومات کے لحاظ سے بے مثال ہیں مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک اس کے مربی، اکبر اور اس کے آباء و اجداد کا تعلق ہے اس نے مدح سرائی کی حد کر دی ہے اور قصیدہ گو شاعروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اس قسم کی طرز نگارش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برنی نے تنبیہ کی ہے کہ مؤرخ کے لیے لازمی ہے کہ خوشامد یوں اور جھوٹی تعریف کرنے والوں اور پہلے شعراء کے طور طریقوں سے جو دروغگوئی اور مبالغہ سے کام لیتے ہیں احتراز کرے کیونکہ حرص و طمع کی وجہ سے یہ لوگ خرمہرہ کو لعل و یاقوت اور سنگ ریزوں کو جواہر کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے ان کی عمدہ سے عمدہ تحریریں جھوٹ کے پلندے ہوتی ہیں قیامت کے دن ایسے مصنف سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے [1]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶،۱۵

Marfat.com

فنِ تاریخ اور تاریخ نگاری سے متعلق برنی نے جو خیالات مقدمہ تاریخ فیروز شاہی میں پیش کیے ہیں اور ان کا بہ غور مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی نظر میں تاریخ نگاری کا معیار خاصا بلند تھا۔ اس کے متعدد بیانات ایسے ہیں کہ اگر آج بھی ہم اس موضوع پر کچھ لکھیں تو ان کو بغیر کسی ترمیم کے دہرایا جا سکتا ہے ہم آج بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مؤرخ کو حقیقت پسند اور تعصبات سے پاک ہونا چاہیے جس طرح آج بہت سے مؤرخ نسلی اور قومی تعصب کے شکار نظر آتے ہیں اس طرح برنی کے عہد میں وہ عام طور پر مذہبی تعصبات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں بعض ایسے بھی تھے جو کسی خاص حکمران خاندان یا خاص خاص بادشاہوں کی ضرورت سے زیادہ تعریفیں اور ان کے مخالفین کی تنقیص کرتے تھے۔ برنی نے ان کمزوریوں کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے اس کو اصرار ہے کہ مؤرخ کو دین دار ہونا چاہیئے اس سے فوری طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ مذہبی تعصب کے حلیف نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو یقین ہے کہ دین داری کے ساتھ دیانت داری، راست بازی اور حق گوئی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک اچھے مؤرخ میں یہ ضروری ہیں۔ برنی نے مؤرخ کے صادق القول ہونے کو بہت اہمیت دی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ اس کی بنیادی اور پہلی خصوصیت ہے[1]

سوال: تاریخ فیروز شاہی پر بحیثیت تاریخی ماخذ کے تبصرہ کیجیے۔

جواب: تاریخ فیروز شاہی ہمارے تاریخی ادب میں کلاسیکی مقام رکھتی ہے اور اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اہم ترین معاصر ترین معاصر ماخذ میں شمار کی جاتی ہے۔ قاضی منہاج الدین سراج کی طبقاتِ ناصری، میں قیام سلطنت سے سلطان ناصر الدین ابن شمس الدین التمش کے عہد تک کی تاریخ ہے اس کے بعد کے زمانے کے لیے تاریخ فیروز شاہی سب سے زیادہ مستند اور ہم عصر ذریعہ معلومات ہے اس میں شک نہیں کہ بعض واقعات کے بیان کرنے میں برنی نے اختصار سے کام لیا ہے مثلاً غیاث الدین تغلق اور اس کے بیٹے محمد بن تغلق کی زرعی اصلاحات کا بیان وہ تفصیل کے ساتھ لکھتا تو اقتصادی تاریخ کے مطالعہ کے لیے بہت مفید مواد دستیاب ہو سکتا تھا۔ غیاث الدین تغلق کی وفات ایک حادثے کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ برنی نے اس کا ذکر نہایت مختصر الفاظ میں کیا ہے

---

[1] ماخوذ از دیباچہ تاریخ فیروز شاہی مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق۔

Marfat.com

چنانچہ بعد کے مورخوں میں اس کے ان الفاظ کے مفہوم پر سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور سلطان کی موت ایک اختلافی مسئلہ بن گیا ہے لیکن ان چند واقعات کو چھوڑ کر جن کے بیان میں اس نے اختصار سے کام لیا ہے بقیہ واقعات اور مسائل پر اس کے بیانات خاصے مفصل ہیں۔

طرزِ نگارش | برنی کا طرزِ تحریر سادہ اور سہل ہے۔ تاریخ کی اکثر کتابیں آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جن مورخوں نے مشکل اور بہت زیادہ ادیبانہ انداز اختیار کیا ہے یا ادق اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے ان کی کتابوں نے زیادہ شہرت حاصل نہیں کی۔ مثال کے طور پر صدرالدین نظامی کی تاج المآثر پیش کی جاسکتی ہے۔ مورخوں میں وہ ایسی مقبولیت حاصل نہ کر سکی جیسی طبقاتِ ناصری کو حاصل ہوئی۔ عام طور پر سادہ اور سہل عبارت لکھنے کے باوجود برنی کہیں کہیں رنگین بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لینے لگتا ہے۔ سلطان معزالدین کیقباد کا دورِ حکومت (۸۷-۱۲۸۷ - ۲۹۰) نہایت مختصر اور غیر اہم ہے۔ لیکن برنی نے اس کے عیش و طرب کا ذکر کم و بیش بیس صفحوں پر کیا ہے جو اس کی متعین تاریخی تصنیف کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا، وہ اس کو اپنی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتا ہے اور اس حصہ کتاب کو قبۃ التواریخ کہتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بہت زیادہ دلچسپ ہے کہ کیقباد کے عہد حکومت میں وہ شیر خوار بچہ تھا اور اس کے اخبار و آثار اس نے اپنے باپ یا استاد ول سے سنے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ ان صفحات میں عبارت آرائی زیادہ ہے مواد کم۔

برنی کے طرزِ تحریر کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کی زبان پر مقامی زبان اور محاورں کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت دہلی کے قیام کو ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ اس زمانے میں اسلامی اور ہندی تہذیبیں خاص طور پر دونوں قوموں (ہندو اور مسلمان) کی زبانیں ایک دوسرے کے کافی اثرات قبول کر چکی تھیں۔ برنی ہی نہیں بلکہ دوسرے مصنفین اور شعراء کی تحریروں میں بھی ہم کو یہ اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب کوئی زبان اپنے اصلی وطن سے نکل کر کسی دوسرے علاقے میں پہنچتی ہے تو اس پر وہاں کے ماحول کا اثر ضرور ہوتا ہے زبان ہی نہیں ہم کو برنی کے خیالات اور تصورات میں بھی اس اثر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، مثلاً نسبی امتیازات کو انفرادی و اجتماعی کردار کی تعمیر کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

بعض خصوصیات | پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ تاریخ فیروز شاہی میں واقعات و

Marfat.com

حالات کی تفصیل کے علاوہ ان اسباب وعلل اور نتائج سے بھی بحث کی گئی ہے اس سلسلہ میں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ برنی نے اپنے سیاسی تصورات پر ایک علیحدہ کتاب "فتاوائے جہاں داری" لکھی ہے۔ یہ بھی اس کی زندگی کے آخری دور کی تصنیف ہے۔ "فتاوائے جہاں داری" میں حکمرانی کے جو اصول پیش کئے گئے ہیں ان ہی کی روشنی میں تاریخ فیروز شاہی میں مختلف سلاطین کی پالیسیوں اور ان کی کامیابی و ناکامی پر بحث کی گئی۔ ان مباحث کی بعض تفصیلات کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ ان پر نظر ڈالے بغیر ہم تاریخ فیروز شاہی کی اہم خصوصیات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔

برنی نے اپنے عقائد اور تصورات کے مطابق اسلامی سیاست اور اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کا ذکر کیا ہے اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے جس کو اس نے نبوت اور بادشاہی کی شکل میں انسان کے سپرد کیا ہے جو کبھی ایک ہی ذات میں اور بیشتر علیحدہ علیحدہ ذاتوں سے متعلق ہی ہیں ختم نبوت کے بعد حکمران کے لیے نبی آخر الزماں کی دی ہوئی شریعت پر عمل اور اس کا رائج کرنا ضروری ہے۔ خلفائے راشدین صحیح اور حقیقی معنی میں اسلامی حکمران تھے یا ہم دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ خلافت راشدہ ہی صحیح اسلامی حکومت تھی۔ اس کے ختم ہونے پر حالات بدل گئے۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسلم حکمران "دنیوی شان و شوکت" اور عجمی بادشاہی کے دوسرے طریقے اختیار کرتے گئے جو یقیناً اسلامی سیاست و حکومت کی روح کے خلاف تھے۔ لیکن پھر بھی اگر یہ شریعت کے نفاذ میں کوششیں کرتے ہیں تو غنیمت ہے یہ ضرور ہے کہ بعض جزئیات میں برنی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور اس نے واقعات بیان کر کے جو نتائج اخذ کئے ہیں یا ان کے جو اسباب بیان کئے ہیں ان کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ تاریخ فیروز شاہی کی یہ بہت نمایاں خصوصیت ہے کہ مصنف نے واقعات پر تنقید بھی کی ہے اور ان کے تجزیے کی بھی کوشش کی ہے یہی سبب ہے کہ بعض ناقدوں نے اس کتاب کو تمثیل یا ڈرامہ کہا ہے جس کا مقصد حکمرانوں اور دوسرے ارباب اقتدار کو نصیحتیں کرنا ہے، دور جدید کا مورخ تاریخی کتاب میں اس مقصد اور مخصوص طرز تحریر کو جائز سمجھے یا نہ سمجھے مگر حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے یہ انداز عمداً اختیار کیا ہے اور اس کا ذکر وہ بطور خاص کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر اس کتاب میں جہاں داروں اور جہاں بانوں کے لیے پند و نصائح تلاش کیے جائیں گے تو دوسری کتابوں سے زیادہ اور بہتر ملیں گے۔ اس کے مختصر الفاظ میں کثیر مطالب ہیں[1]۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۳

Marfat.com

ایک دوسرے موقع پر وہ اپنی کتاب کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے اس میں جادو نگاری کی ہے پھر افسوس کرتا ہے کہ میں کیا کروں۔ کس کے آگے فریاد کروں اور کس سے کہوں کہ اس کا دوسری تاریخوں سے مقابلہ کرے اور اس کی تیاری میں، میں نے خونِ جگر پیا ہے اس کی داد دے[1]۔

تاریخ فیروز شاہی کی ایک خصوصیت بہت نمایاں طریقے پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف مواقع پر تاریخی شخصیتوں کی زبان سے سیاسی و دینی امور سے متعلق بعض اصول، پند و نصائح یا وصیتوں کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں مثلاً سلطان بلبن اپنے بیٹوں سلطان محمد اور بغرا خان کو امورِ جہاں بانی کے متعلق نصیحتیں کرتا ہے[2] یہی نہیں بلکہ اپنے امرا اور خواص کو بھی وہ اسی قسم کی ہدایات دیتا ہے[3]۔ ایک اور موقع پر کم اصل اور رذیل لوگوں کے تقرر کے خلاف وہ اپنے بعض امرا کو نصیحت کرتا ہے[4]۔ جس طرح بلبن نے اپنے بیٹوں کو نصیحتیں کی۔ اسی طرح بغرا خان نے اپنے بیٹے کیقباد کو بھی نصیحتیں کی ہیں۔ بغرا خان اور کیقباد کی ملاقات کو امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین کی وجہ سے فارسی ادب میں ایک مستقل مقام حاصل ہو گیا ہے لیکن اس کا حقیقی مقصد اس میں برنی کے ان چند صفحات میں مل جاتا ہے جہاں اس نے بغرا خان کی ان نصائح کا تفصیلی ذکر کیا ہے[5]

سلطان علاء الدین خلجی کے ذکر میں بھی اس میں یہ خصوصیت نظر آتی ہے، خود برنی نے چچا علاء الملک کی اس گفتگو کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعے سے اس نے نہایت خوبی اور کامیابی سے مغرور اور نوجوان العمر سلطان کے ذہن سے ایک نیا دین قائم کرنے اور دنیا کو فتح کرنے کے احمقانہ خیالات دور کیے[6]۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ گفتگو ہے جو سلطان مذکور اور قاضی مغیث الدین کے درمیان ہوئی اور جس میں آخر الذکر نے سلطان کی مختلف پالیسیوں پر شرعی نقطہ نظر سے تنقید کی ہے[7]

جن پند و نصائح اور گفتگوؤں کا ذکر بیان کیا گیا ہے ان میں سے ایسی ہیں جن کی اہمیت تاریخی واقعات کے محفوظ ہو جانے سے کہیں زیادہ اس امر میں ہے کہ ہمیں ان میں بعض اہم ترین مسائل کا تجزیہ ملتا ہے اور اس دور کی دینی و سیاسی فکر کی تصویر مرتب کرنے میں ہم ان سے بہت مدد لے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۳، ۱۲۴ [2] ایضاً ص ۶۹، ۸۰، ۹۴، ۱۰۶ [3] ایضاً ص ۴۱ [4] ایضاً ص ۳۶
[5] ایضاً ص ۱۴۸، ۵۶ [6] ص ۲۶۲، ۶۷ [7] ایضاً ص ۲۸۹، ۹۷ -

Marfat.com

سکتے ہیں۔ حکمران کی حیثیت اور مقام، اس کے اختیارات اور ذمہ داریاں، راسخ العقیدگی اور دین داری کی اہمیت، خراج و محصولات اور سب سے زیادہ شریعت کے قوانین و احکامات کا نفاذ وغیرہ ان مکالموں میں برنی نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ متذکرہ بیانات ان ہی لوگوں کے خیالات کا پرتو ہیں جن کی زبانوں سے وہ ادا ہو رہے ہیں۔ لیکن بعض ناقدین کا خیال ہے کہ یہ خود برنی کے خیالات و تصورات ہیں۔ جو اس نے تاریخی شخصیتوں کی زبانوں سے ادا کر رہے ہیں اس نظریہ کو قطعی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں کہ ان گفتگوؤں میں ان شخصیتوں کا جن کی زبانیں ان خیالات کو ادا کر رہی ہیں کوئی حصہ نہیں مثلاً بلبن کی تقریروں کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے جو نصیحتیں اپنے بیٹوں کو کی ہیں ان میں اس کے کردار اور تصورات کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے بادشاہ ہونے اور بعد اس کے خیالات اور افعال پر مذہب کا رنگ بہت گہرا ہو گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی بعض غیر اسلامی تصورات بھی اس کی سیاست میں داخل ہی نہیں تھے بلکہ اہم مقام رکھتے تھے۔ اسلام نے نسلی امتیازات کو تسلیم نہیں کیا ہے اور ان کو ختم کرنے کی ہدایت کی ہے مگر بلبن نسلی اور نسبی برتری کو ذاتی ہنر مندی پر ترجیح دیتا ہے اور خود بھی افراسیاب کی اولاد میں ہونے پر فخر کرتا ہے[1] جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس میں عقیدت اور شریعت مصطفوی کی پیروی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے اس کی منصف مزاجی مشہور ہے۔ چنانچہ وہ ان نصائح میں انصاف پسندی کو بہت اہمیت دیتا ہے مختصراً یہ کہ اس کی نصیحتیں اس کے کردار اور خیالات کی بہت بڑی حد تک آئینہ دار ہیں علاء الدین اور قاضی مغیث کی گفتگو میں بھی ہم یہی کیفیت دیکھتے ہیں یہ صحیح ہے کہ احکامات شریعت کے مفہوم اور بادشاہی و سیاست کے متعلق اہم مسائل پر برنی کے خیالات قاضی مغیث کے تصورات سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہوں گے۔ کیونکہ دونوں نے ایک ہی قسم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور ایک ہی ماحول میں تربیت پائی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قاضی مغیث کی گفتگو میں تمام تر برنی اپنے ہی خیالات پیش کر رہا ہے درست نہ ہوگا

اس سلسلہ میں صحیح رائے یہ ہوگی کہ برنی نے جو گفتگو میں درج کی ہیں ان کی تفصیلات اور معنی و مفہوم میں تو شک نہیں کیا جا سکتا لیکن تحریر کرتے وقت اس نے ان واقعات اور خیالات کو اپنے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴

Marfat.com

ہی الفاظ میں ادا کیا ہے فتاوائے جہانداری میں اس نے امور مملکت، جہاں بانی سے متعلق جو اصول اور تصورات منضبط کیے ہیں ان میں اور تاریخ فیروز شاہی کی تاریخی شخصیتوں کی گفتگوؤں میں بڑی حد تک مماثلت کی وجہ سے بعض مؤرخین نے آخر الذکر کو برنی ہی کے خیالات کا مرقع قرار دیا ہے یہاں تک کہ ایک جدید انگریزی مؤرخ پروفیسر ہارڈی[1] نے ان تمام پند و نصائح کو جو بلبن نے اپنے بیٹوں اور امیروں کو کی ہے یا اس تنقید کو جو خاص مغیث الدین نے علاؤالدین کی پالیسیوں پر کی ہے سراسر برنی ہی کے خیالات کہہ کر پیش کیا ہے ان کا یہ تجزیہ اور خاص طور پر انداز تحریر غیر متوازن اور ایک حد تک غلط ہے پروفیسر ہارڈی سے پہلے ایک پاکستانی مؤرخ سید حسن برنی نے مختصر الفاظ میں یہی رائے ظاہر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ زیادہ تر فرضی ہیں[2]۔

تاریخ فیروز شاہی کے ماخذ برنی نے اپنے ماخذ کا مختصراً ذکر کیا ہے بلبن کے عہد کی تاریخ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ میں نے اپنے باپ دادا اور ان لوگوں سے جو اس کے عہد میں اہم عہدوں پر فائز تھے معلومات حاصل کیں ہیں کیقباد کے عہدہ کے لیے اس کے راویوں میں اس کے والد اور اساتذہ ہیں۔ جلال الدین کے عہد سے فیروز شاہ تک کے لیے اس نے اپنے "مشاہدہ و معائنہ" کو اپنا ذریعہ معلومات تبلایا ہے پہلی نظر میں دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی اہم تاریخ کے لیے یہ ذرائع معلومات نہایت محدود اور ناکافی ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ ان روایات کی، جو اس نے اپنے باپ دادا یا دوسرے عہدہ داروں سے سنی ہیں، یا ان مشاہدات کی بنیاد پر جن کا اس کو خود موقع ملا ہوگا۔ اس نے جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ جزئیات کے لحاظ سے کس طرح صحیح ہو سکتی ہیں لیکن اس سلسلے میں ہم قیاساً کہہ سکتے ہیں اور یہ قیاس تقریباً صحیح ہے کہ اس نے جو معلومات اپنے بزرگوں سے حاصل کی ہوں گی ان کی مزید تفصیلات کے لیے دوسرے ذرائع بھی تلاش کیے ہوں گے وہ خود ذکر کرتا ہے کہ اس عہد کے دوسرے اہم عہدہ داروں سے بھی معلومات حاصل کیں۔ جب عہدہ داروں کا ذکر آتا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے ذریعے بعض دستاویزات اور ان لوگوں کے بیانات بھی جمع کیے ہوں گے جو متعلقہ واقعات کے عینی شاہد ہوں گے۔ کہیں کہیں اس نے دوسرے عہدہ داروں کا نام بھی تبلایا ہے جن سے اس نے براہ راست معلومات حاصل کی ہیں۔ بعض مواقع پر اس نے دستاویزوں کا حوالہ بھی دیا ہے مثلاً قاضی جلال عروس کا وہ تحفہ جو اس نے ایلتمش کو دیا یعنی خلیفہ مامون کی تحریر۔ اس

---

[1] ہسٹوریز آف میڈیول انڈیا باب دوم [2] ضیاء الدین برنی (مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۲۰ء) ص ۵۰

Marfat.com

کا ترجمہ بلبن کی زبان سے ادا کرایا گیا ہے[1] لیکن یہ ظاہر ہے کہ برنی کو یہ کہیں سے ملا ہوگا۔ اگرچہ بلبن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ "وہ یہ" ہے۔ لیکن پھر بھی ہم امکان کو کلیۃً نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہ اس نے اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو۔ بہرحال برنی پر یہ تنقید غلط نہیں کہ اس نے اپنی کتاب کے لیے مواد زیادہ تر اپنے بزرگوں دوستوں۔ اور دیگر عہدہ داروں کی روایات و بیانات سے حاصل کیا ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ روایات و بیانات کو پرکھنے اور راویوں کے کردار وغیرہ کو نظر میں رکھنے کی اہمیت سے وہ ناواقف نہ تھا۔ اس لیے ہم اس کے بیانات کو مستند تسلیم کر سکتے ہیں۔

جہاں کہیں وہ نتائج اخذ کرتا ہے یا اسباب و علل پر بحث کرتا ہے ہم کو اس سے اختلاف کا پورا حق ہے مگر واقعات کی حد تک اس کے بیانات میں شک کرنے کا کوئی جواز نہیں جزئیات میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے کیونکہ معمولی غلطیاں روایات بیان کرنے والے بھی کر سکتے ہیں لیکن من حیث المجموع برنی کی کتاب کو ہر دور کے مؤرخ نے مستند اور قابلِ اعتبار سمجھا ہے اور جس عہد کی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے اس پر اسی کو سب سے اوّل اور سب سے زیادہ معتبر ماخذ قرار دیا ہے تاریخ فیروز شاہی کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی اور اس تاریخ کے صفحات میں اس کے مصنف کا نام بحیثیت مؤرخ زندہ رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی حیات میں نہ کتاب نے شہرت حاصل کی اور نہ اس کو کوئی صلہ ملا۔ لیکن مصنف اور اس کی تصنیف دونوں کی دوامی شہرت سے اس کی تلافی ہو گئی ہے۔ برنی نے اپنے زمانے اور ہم عصروں کی ناقدرشناسی کی قدردانی نے اس کی یہ شکایت دور کر دی ہے[2]۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۲، [2] ماخوذ دیباچہ تاریخ فیروز شاہی مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق۔

Marfat.com

سوال: فتوح السلاطین مصنفہ عصامی پر نوٹ لکھیے ۔

عہد تغلق خاندان کا عصامی ایک مشہور مؤرخ ہے جس نے سلطان محمد بن تغلق کے آخری سال حکومت (۱۳۵۰ء) میں ۱۲ ہزار شعر کی ایک مثنوی فتوح السلاطین لکھی ۔ اس میں غزنویوں، غوریوں، خاندان غلامان، خاندان خلجی اور خاندان تغلق کے (پہلے دو) بادشاہوں کی فتوحات اور واقعات زندگی نظم کیے ہیں ۔

عصامی دہلی میں ۱۳۱۱ء میں پیدا ہوا ۔ اس کا صحیح نام بھی معلوم نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کے بزرگوں میں جو شخص سب سے پہلے سرزمین پاک و ہند میں آیا فخر الملک عصامی تھا ۔ جو خلفائے بغداد کا وزیر تھا ۔ کسی بات پر خلیفۂ وقت سے رنجیدہ ہو کر ترک وطن کیا اور اپنے خاندان کے ساتھ ملتان کے راستے دہلی آئے ۔ دہلی میں اس وقت سلطان شمس الدین التمش برسر اقتدار تھا جو اسلامی ممالک سے آنے والے اکابر علماء کی بڑی قدر کرتا تھا ۔ اس نے فخر الملک کا پرجوش خیر مقدم کیا ۔ بلکہ منصب وزارت اسے تفویض کیا ۔ فخر الملک کا پوتا عزالدین عصامی جو عہد بلبن میں ایک فوجی افسر تھا ۔ فتوح السلاطین کے مصنف کا دادا تھا ۔ اسی نے اس کی پرورش کی ۔ عصامی لکھتا ہے نوے سال کی عمر میں سلطان محمد بن تغلق کے حکم کے بموجب عزالدین اور اس کے پوتے کو دولت آباد کا رخ کرنا پڑا ۔ لیکن پہلی منزل پر ہی بڈھا جان بحق تسلیم ہو گیا ۔

عصامی نے فتوح السلاطین لکھتے وقت بانی خاندان بہمنی کے کتب خانہ سے استفادہ کیا ۔ اور واقعات کو بڑی احتیاط اور وضاحت سے نظم کیا ۔ چونکہ وہ خاندان خلجی و خاندان تغلق کے لیے ایک قریب العہد مورخ ہے اور ویسے بھی اس وقت دولت آباد وغیرہ میں کئی لوگ ایسے تھے جن کے لیے اس دور کے شمالی ہند کے واقعات چشم دید تھے اور عصامی کی ان تک رسائی تھی ۔ اس لیے اس کی مثنوی کی تاریخی اہمیت کافی ہے ۔

اس کے اپنے حالاتِ زندگی پر اخفا کا پردہ چھایا ہوا ہے فتوح السلاطین سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ معاصرانہ حالات سے بہت ناخوش تھے اور چاہتا تھا کہ کتاب کی تکمیل کے بعد مدینہ منورہ چلا جائے چونکہ فتوح السلاطین کی تالیف کے بعد اس کا کوئی پتا نہیں چلتا اس لیے خیال ہے کہ وہ اسے مکمل کرنے کے بعد حجاز میں جا بسا۔[1]

---

[1] آب کوثر ص ۴۲۸، ۴۲۹

Marfat.com

سوال: تاریخ فیروز شاہی مصنفہ سراج عفیف پر تبصرہ کیجیے۔

جواب: فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں دو ارباب قلم نے تاریخیں لکھیں جو فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یا شاید ان مصنفین نے خود ہی ان تاریخوں کے بادشاہِ وقت کے نام پر تاریخ فیروز شاہی رکھ دیے۔ ۱۔ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی اس کا دوسرا نام سیرۃ السلاطین بھی ہے۔ ۲۔ شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی یہ تذکرۂ عفیف شاہی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ دونوں کتابیں اس وقت کی ادیبانہ فارسی میں ہیں۔ یہ قابلیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کے نزدیک اپنے دور کی تاریخ کے لیے بہترین ماخذ کا کام دیتی ہیں۔ ۱۔ ضیاء الدین برنی بہ مؤید الملک کا فرزند تھا۔ جو علاء الدین خلجی کے زمانہ میں بَرن شہر (بلند شہر) کا ناظم تھا۔ غالباً یہیں ضیاء الدین برنی ۵۸۳ھ میں پیدا ہوا۔ بڑا ذہین آدمی تھا۔ تعلیم اچھی پائی محمد شاہ کے عہد میں اسے بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ سخت وہمی عقائد کا حامل تھا۔ پیر پرستی اس کی فطرت میں داخل تھی آخر عمر میں سلطان تغلق نے اس کی غیر آئینی طور پر حاصل کردہ زمینیں ضبط کر لیں تھیں اس لیے یہ محمد شاہ کی عیب جوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ ساری کتاب میں ہر جگہ محمد شاہ پر تعریف و توصیف کے پردہ میں کچھ نہ کچھ چوٹ کر جاتا تھا۔ یہ نظام الدین اولیاءؒ کا مرید تھا اور محمد شاہ کو غیر معمولی عقیدت درگاہ و خانقاہ سے نہ تھی اس لیے بھی برنی کی رائے میں محمد شاہ ایک مطعون شخص تھا۔ انگریزوں کے دور میں جب ہندوستان کی تاریخ لکھی جانے لگی تو انہوں نے ایسی ہی کتابیں تلاش کیں جن میں مسلمان بادشاہوں کے عیوب کو نمایاں کیا گیا ہو۔ اس لیے برنی کی کتاب کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ورنہ اصل اہمیت عفیف کی کتاب کو حاصل ہوتی۔

شمس سراج عفیف یہ شمس شہاب عفیف بن سعد الملک عملدار دیبالپور کا پوتا تھا۔ ۸۰۱ھ حملہ تیمور تک زندہ تھا۔ اس کا دربار سے کوئی خاص تعلق غالباً نہ تھا۔ اس نے بھی ایک تذکرہ احوال ملوک لکھا جو تذکرہ عفیف یا تاریخ فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہے یہ ایک غیر جانب دار لکھنے والا ہے اگرچہ ضیائے برنی جیسا صاحبِ قلم ادیب نہیں مگر واقعات کافی تحقیق کے بعد اور سلیقہ سے قلمبند کیے ہیں۔

عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تغلق کا تذکرہ ہے دوسرے تذکرے یا اس کے خاندان کا تذکرہ محض اتفاق سے مصنف کا مقصود صرف فیروز شاہ کا تذکرہ لکھنا ہے جسے اس نے کافی شرح و بسط کے ساتھ اور عمدگی کے ساتھ لکھا ہے خصوصاً اس زمانے کے درباری آداب اور خود بادشاہ کی سیرت و اخلاق پر گراں قدر معلومات اس کتاب سے حاصل ہوتی ہیں۔

Marfat.com

سراج عفیف کتاب کے آغاز میں بادشاہ کے دس خصائص بیان کیے ہیں ۔

۱۔ شفقت | شفقت کے متعلق سراج عفیف لکھتا ہے " یہ گوہر آبدار دریائے وہبی کے قعر سے نکل کر عالم آب و گل میں ملتا اور ارواح عالم میں تاثیر کرتا ہے یعنی اس کا اصل مسکن قلب انسانی ہے جہاں سے اس کی شعاع آب و گل کے باشندوں پر پڑتی ہے اور اس کو منور کرتی ہے اس روشن و تاباں جوہر کی اصل حقیقت حضرت پروردگار کے انوار سے منور و تاباں ہے اور اس مقام کی خبر خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس طرح دی ہے لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ چنانچہ تمام علماء و مشائخ رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام خلائق پر پدر و مادر سے زیادہ شفیق و مہربان ہیں۔ یہ حضرات طالبین مقصود کو مطلوب تک پہنچاتے اور محبوب کی تلاش کرنے والوں کو بزرگی و برتری کی راہ دکھاتے ہیں۔ تمام خلقت پر عظیم انسان احسان کرنے اور اپنی تربیت و تعلیم سے ان کو کامل بناتے اور شفقت و لطف کے ساتھ تعلیم دیتے ہیں ۔۔۔۔

اس طرح سلاطین عالم جو یقین کی تاثیر سے مستفید ہیں تمام مخلوق پر شفقت قلبی سے مہربانی فرماتے اور باوجود اس کے کہ خود عظیم انسان مرتبے پر فائز ہیں ہر مخلوق کی تربیت فرماتے۔ یہ گروہ عالی مرتبہ ہونے پر عامۂ خلائق کو اپنے باران کرم سے فیض یاب کرتا ہے اور ہوشیاری و ہمت کے عالم میں ابر باراں کی طرح خلقت پر احسان و کرم کے موتی برساتا ہے[1]۔

۲۔ عفو | مرتبہ عفو پروردگار کی انتہائی ہیبت اور اس کی جبّاری کے بے پایاں عظمت سے پیدا ہوتا ہے۔ سلاطین روزگار اپنے علم الیقین سے عفو کو اپنا شعار اور حلم و بُردباری کے گیند کو علم کے میدان میں ہمت و جرأت کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ عفو و حلم وہ صفات ہیں جن کا ظہور بہترین طریقے پر سلاطین ہی کے عمل و فعل سے ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ عدل و فضل | یہ مقام خدائے قیوم کے خوف کا نتیجہ ہے۔ علماء و مشائخ نے ہر حال میں عدل و انصاف کو شعار بنایا ہے اور ہمیشہ فضل و بزرگی حاصل کرنے میں سعی و کوشش فرمائی ہے اسی طرح گروہ سلاطین نے بھی اہل سلوک کی تقلید کی اور اپنے عہد حکومت میں ہمیشہ عدل کو بلند اور فضل و بزرگی کے علم کو بالا کیا ہے۔ ان سلاطین کا ہمیشہ مقصد یہ رہا ہے کہ کوئی مظلوم مغموم و رنجیدہ نہ رہے اور زبردست اپنے قوت بازو کے غرور سے زیردست کو آزار نہ پہنچائے۔ سلاطین عالم اپنے عدل سے مظلوم افراد

---

[1] تاریخ فیروز شاہی مترجم ص۱۲ (نفیس اکیڈمی)

Marfat.com

کی امداد خواہی فرماتے اور انوار فضل سے مسکین و محتاج اشخاص کو سرفراز فرماتے ہیں۔

۴۔ معائنہ و محاربہ | حکم پروردگار کی بجا آوری سے انسان اس مقام پر فیض یاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مشرکین کو قتل کرو جس طرح بھی تم ان کو پاؤ۔ مقاتلہ ظاہری عمل ہے اور محاربہ باطنی فعل ہے۔ سلاطین لڑائی کے وقت جلالت کے میدان اور شجاعت کے مقام پر مجاہدین ملت کی صفیں آراستہ فرماتے ہیں۔ یہ طالب حق گروہ دشمن سے دست و گریبان ہو کر اس حالت قتال میں جان کو ہتھیلی پر رکھنا اور اپنے کو خدا کے سپرد کر کے جہاد کے دریا میں غوطے کھاتا اور ہر غوطے میں بے حد لطیف و شریف جوہر گوہر حاصل کرتا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح ارشاد فرمایا ہے "اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ" جنت تلوار کے سائے میں ہے۔

۵۔ مرتبہ ایثار و افتخار | پروردگار کے لطف و کرم سے مستفید و مالا مال ہو کر انسان اس مرتبے کو اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ خدا کی راہ میں اس شے کو نہ صرف کرو جس کو تم عزیز و دوست رکھتے ہو۔

علماء و مشائخ اپنے غایت لطف و کرم سے دین و دنیا کی نصیحتیں خلائق کو عطا فرماتے ہیں اسی طرح سلاطین عالم اپنے ایام حکومت و دورِ معدلت میں تمام مخلوق پر بے شمار ایثار فرماتے ہیں جو نقد و مال اور ان کے حضور میں جمع ہوتا ہے اس کو طالبان و حاجتمندان دنیا کو عطا فرماتے اور اپنی مراد سے نامراد افراد کو شاد اور اہل استحقاق کو حق ضرورت سے مستفید فرماتے ہیں۔

۶۔ مرتبہ عظمت و رعب | یہ مقام انسان کو خدا کی رحمت سے عطا ہوتا ہے۔ سلاطین اہل دین ہمیشہ عظمت و جلالت کے ساتھ رہتے ہیں۔ شہریاران عالم کی عظمت و جلال کا تکملہ اہل جہاں کے شرف کا باعث ہے اور ان کے جاہ و جلال کا طرہ اور اہل عالم کے لیے سعادت کا ذریعہ و واسطہ ہے۔

بادشاہان عالم اپنی عظمت و جلالت کے مرتبے پر قائم و برقرار ہو کر کبھی تو قہر کی شراب تلخ لطف کے جام میں بھر کر دشمنوں کو عطا کرتے ہیں اور کبھی لطف کی خوشگوار شراب مہر کے ساغر میں بھر کر دوستوں کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔

۷۔ ہوشیاری و بیداری | یہ مقام عقل کی زیادتی اور فہم دل کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے۔ سلاطین عالم امور ملکی و معاملات مالی سے ایک دم بھی غافل نہیں رہتے۔ اگر ایک لحظہ بھی ارکان ملکی میں قلیل فروگذاشت ہو جاتی ہے تو تاجداران عالم کے قلب پر بے انتہا اضطراب طاری ہوتا

Marfat.com

ہے اور اگر ایک لمحہ بھی مالی معاملات میں ایک بستر بھی ضائع ہوتا ہے تو بادشاہوں کو بے حد افسوس ہوتا ہے تمام سلاطین دین پرور نے درگاہ کی بیداری اور بارگاہ کی ہوشیاری میں ہمیشہ سعی و کوشش کی ہے۔

۸۔ انتباہ عبرت | یہ مقام اللہ کے خوف سے باخبر اور اس کے جلال کی ہیبت وعظمت و کمال کی سطوت سے متاثر ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ سلاطینِ عالم دین مبین کی روشنی کے مطابق تخت جاہ و جلال پر متمکن ہو کر بھی عبرت کا تاج سر پر رکھتے ہیں۔ اور ہمیشہ فکرمند نظر آتے ہیں۔

۹۔ فتح و نصرت | یہ مقام عنایت پروردگار کی امداد و اعانت سے ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ سلاطینِ دور اندیش قلعہ کشائی و مملکت کشائی کے حریص ہوتے ہیں۔ فریدوں ملک عجم کی حکومت پر قانع نہ تھا بلکہ دیگر ممالک و حصار کی فتح کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہا۔ فرماں روایانِ عالم اس طرح کا جام شراب ہمیشہ نوش فرماتے ہیں اور ہمیشہ اس کام میں جان و دل سے کوشش فرماتے ہیں۔

۱۰۔ کیاست و فراست | حق یہ ہے کہ یہی مقام اصل مقصود و مطلوب ہے۔ اگر کوئی بادشاہ فراست کے گوہر سے عاری ہو تو وہ بادشاہت کے لائق نہیں۔

تمت بالخیر

Marfat.com

سابقہ سالوں کے
سوالات
اور
اُن کے جوابات

مخدوم غلام جیلانی

سابق اسسٹنٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

Marfat.com

Marfat.com

سوال۔ برنی کے مختصر حالات مختصراً بیان کیجئے۔ تاریخ فیروز شاہی کی نمایاں خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالئے؟

جواب۔ برنی کا اصلی نام ضیاء الدین تھا۔ اپنے آپ کو ضیاء الدین برنی کہتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بلند شہر (جسے پرانے زمانے میں برن کہتے تھے) کا رہنے والا تھا۔ برن گنگا اور جمنا کے دوآبہ کے قدیم ترین شہروں میں سے تھا۔ برنی کا تعلق شرفاء کے خاندان سے تھا۔ امیر خورد نے اس کے متعلق لکھا ہے۔ از دو دمانے بزرگے بود یعنی بزرگ خاندان سے تھا۔ اس کا بزرگ خاندان سے تعلق رکھنے کی بناء پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس نے اپنی تصانیف میں علو نسب پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے اجداد بلند عہدوں پر فائز تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی اس کے چچا علاء الملک کو وزیر زادہ کہتا تھا۔ برنی خود اپنے متعلق ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ پدر ایں ضعیف شریف بود۔ اس ضعیف کا والد شریف تھا۔ اس کے باپ کا لقب مویدالملک اور چچا کا لقب علاء الملک تھا۔

حکومت کے ابتدائی دور میں جب علاء الدین خلجی کے دماغ میں یہ خبط سما گیا تھا۔ کہ وہ ایک نئے دین کی بنیاد رکھ کر اس کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اور ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ تو اس وقت برنی کے چچا علاء الملک نے ہی صرف یہ جرأت دکھائی تھی۔ اور اس نازک اور خطرناک کام پر سلطان کو صحیح مشورہ دیا۔ لہٰذا وہ دونوں ارادوں سے باز آگیا۔

برنی کے والد نے جلال الدین خلجی کے عہد میں کیلوکھری یا شہر نو میں ایک شاندار مکان بنایا تھا۔ برنی بچپن میں ہی دہلی آگیا۔ اور ابتدائی تعلیم کا زمانہ یہیں گزرا۔ اس نے جلال الدین کے زمانہ میں ہی قرآن پاک ختم کر لیا تھا۔ اور لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ کہیں امیر خورد نے اسے عالم دل پذیر، مجمع اللطائف اور جوامع الحکایات کے القاب زریں سے نوازا ہے۔

تاتاریوں کے حملوں سے متاثر ہو کر دوسرے لوگوں کی طرح برنی کے اہل خاندان

Marfat.com

بھی دہلی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔ جہاں بڑے بڑے علماء و ادباء مصروفِ تدریس تھے۔ برنی نے بھی ان عظیم اساتذہ سے استفادہ کیا۔ جو اپنے زمانے کے رازی اور غزالی دوراں کہلانے کے مستحق تھے۔ دینی تعلیم کے علاوہ برنی کو تاریخ سے خاصی دلچسپی تھی۔ اس نے علمِ تاریخ کے حصول میں جو تکالیف برداشت کی ہیں۔ دوسرے لوگ ان کا بآسانی اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اس نے فلسفہ تاریخ پر بھی غور کیا ہے اور اس کی خوبیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ۔ ان کے خلیفہ اعظم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ ان کے خلیفہ بابا فرید الدین شکر گنجؒ ان کے خلیفہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کے زمانوں میں تصوف اور علم دین کا بڑا چرچا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر برنی کے والد مؤید الملک نے اپنے لڑکے شیخ نظام الدین اولیاء سے بیعت کرا دی تھی۔ مرشد کے زیرِ سایہ رہنے کی وجہ سے برنی نے بھی غیاث پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی جگہ اس کا انتقال ہوا۔ اور شیخ کے مزار کے قریب ہی اسے دفن کیا گیا۔

برنی سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں دربار میں بہ حیثیت ندیم منسلک تھا۔ دربار سے تعلق تیرہ سال سے زیادہ رہا۔ سلطان اس پر بڑا مہربان تھا۔ اور اس پر انعام و اکرام کی بارش ہر وقت ہوتی رہتی تھی۔

محمد تغلق کے زمانہ میں بغاوتیں عام ہو گئیں۔ تو اس نے برنی سے مشورہ کیا۔ کہ کن جرائم کی سزا قتل ہو سکتی ہے۔ اس نے سات مقامات کی نشاندہی کی۔ (۱) ارتداد (مذہب کا تبدیل کرنا) (۲) قتل عمد (۳) زنا بالجبر۔ (ان تین جرموں کی سزا شریعت میں قتل ہے) (۴) بادشاہ کے خلاف بغاوت۔ (۵) باغیوں کا سرغنہ (۶) بادشاہ کے دشمن کا ساتھ دینے والا۔ (۷) ایسا نافرمان جس کی نافرمانی کی وجہ سے ملک کو نقصان پہنچے۔

برنی کی جرأت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اسی نے خود سر اور جابر بادشاہ کو صحیح مشورہ دیا۔ کہ بادشاہ کے نافرمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ برنی نے بہ تمام آرا جمشید کا نام لے کر ذاتی رائے کے پردے میں بادشاہ کے پیش کیں۔

Marfat.com

جو خوشحالی اور فارغ البالی اس نے سلطانی کے زمانے دیکھی تھی۔ سلطان فیروز شاہ کے دورِ اقتدار میں تنگ دستی میں تبدیل ہوگئی۔ مدِ اندازوں نے تاریخ فیروز شاہی بھی بادشاہ تک پہنچنے دی۔ جس کا برنی کو بہت زیادہ افسوس تھا۔ آخر عمر اس کا کچھ تھوڑا سا وظیفہ مقرر ہوگیا۔ جس سے وہ مفلسانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ مرتے وقت اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا کفن دفن بھی ایک غریب آدمی کی طرح ہوا۔ امیر خورد نے اس کی وفات کے بارے لکھا ہے۔" از دنیا بدار عقبیٰ مردانہ دعاشقانہ خرامیدہ۔ یہ سب کچھ اسکی رائے میں اس لئے ہوا کہ بادشاہ کے بجائے سلطان المشائخ اور شیخ نظام الدین اولیاء کی صحبتوں کا اثر اس پر گہرا تھا۔

تاریخ کے فوائد:۔ برنی کے بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ تاریخ سے

۱۔ اصحاب بصیرت عبرت حاصل کرتے ہیں جس طرح آسمانی کتب سے حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ تاریخ کا حدیث سے گہرا تعلق ہے۔ محدث کے لئے دو رُخ ہونا از حد ضروری ہے

۳۔ تاریخ کے مطالعے سے عقل و شعور کی تیزی و ترقی میں مدد ملتی ہے۔

۴۔ انبیاء اور صلحاء کے حالات پڑھ کر انسان میں صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کی عادات پختہ ہوتی ہیں۔

۵۔ تاریخ میں جن لوگوں کے حالات درج ہوتے ہیں۔ ان کے نام ہمیشہ کے لئے قائم رہ جاتے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی کی خصوصیات

تاریخ فیروز شاہی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں برنی نے ان تمام مؤرخین کا ذکر کیا ہے۔ جنہیں تاریخی فوائد کا اندازہ تو تھا۔ لیکن انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ برنی نے ان کا کامیاب تجزیہ کیا ہے۔

۲۔ تاریخ فیروز شاہی تاریخی ادب میں کلاسیکی درجہ رکھتی ہے۔ طبقات ناصری کے بعد

Marfat.com

دوسرا اہم تاریخی ماخذ بھی ایک کتاب ہے۔

۳۔ تاریخ فیروز شاہی میں سلاطین تغلق کی زرعی اصلاحات کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔

۴۔ محمد تغلق کی وفات ایک حادثے میں ہوئی۔ تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ بہت مختصر انداز میں بیان ہوا ہے۔

۵۔ تاریخ فیروز شاہی کا طرز تحریر سادہ اور سہل ہے۔

۶۔ سہل اور سادہ عبارت کے باوجود کہیں کہیں رنگین بیانی اور شاعرانہ مبالغے کا انداز معلوم ہوتا ہے۔

۷۔ معزالدین کے قباد کا دور اقتدار مختصر ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کے عیش کا ذکر دس صفحات میں کیا ہے۔ جو تاریخی متانت کے خلاف ہے۔

۸۔ تاریخ کی عبارت پر مقامی زبان اور محاوراں کا اثر نمایاں ہے۔

۹۔ واقعات و حالات کی تفصیل کے علاوہ اُن کے اسباب و علل اور نتائج سے بھی بحث کی گئی ہے۔

۱۰۔ برنی نے اسلامی سیاست اور اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو خداوند تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہی کی شکل انسان کے سپرد کیا ہے۔

۱۱۔ ختم نبوت کے بعد حکمران کے لیے نبی آخرالزمان کی دی ہوئی شریعت پر عمل اور اس کا رائج کرنا ضروری ہے۔ خلفائے راشدین صحیح اور حقیقی معنی میں اسلامی حکمران تھے۔

۱۲۔ تاریخ فیروز شاہی میں واقعات پر تنقید کی گئی ہے۔ اور ان کے تجزیئے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

۱۳۔ مختلف مواقع پر تاریخی شخصیتوں کی زبان سے سیاسی و دینی امور سے متعلق بعض اصول پند و نصائح یا وصیتوں کی شکل میں بیان کئے گئے ہیں۔

س ۲۔ سلطان محمود کا بطور ایک فوجی لیڈر اور مربی علم و فن جائزہ لیجئے۔

Marfat.com

جواب :- The sultanate Of Delhi کے مصنف اے۔ ایل۔ سری واستوا جو بھارت کے مشہور مؤرخ ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کہ محمود کا شمار ایشیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ایسی لمبی چوڑی سلطنت پر حکمرانی کی ہے۔ جس کی حدیں عراق سے لے کر دریائے گنگا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جس کی وسعت خلافت بغداد سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ ادبی فضیلت کا مجسمہ اور علوم و فنون کا مُربی تھا۔ اس نے غزنی میں بہت سے مکاتب۔ درس گاہیں اور ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم کی۔ اور غزنی شہر میں کئی ایک تاریخی عمارتیں بنائیں۔

فوجی برتری :- اگرچہ اس پر کوتاہ نظر تاریخ نویسوں نے الزامات لگائے ہیں کہ اس نے ہندوستان پر ہر سال حملہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن سر ہنری ایلیٹ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھا جائے۔ تو یہ بات قطعاً بے بنیاد اور غلط ثابت ہوتی ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے۔ تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں کی غرض و غائت ہندوستان میں مستقل حکومت کرنا نہ تھا۔ اسے کئی مواقع میسر آئے۔ لیکن اس نے کبھی بھی مستقل حکومت کی داغ بیل نہ ڈالی۔ اس نے فوجی نقطۂ نظر سامنے رکھتے ہوئے پنجاب کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا تھا۔ اس علاقے میں اس کے فوجی آرام کیا کرتے تھے۔ محمود وسط ایشیا اور ایران کو زیر نگیں لا کر اپنی فوجی برتری قائم کرنا چاہتا تھا۔ فوجی اعتبار سے فوقیت حاصل کرنے کے لئے فوجی جاہ و جلال عسکری شان و شوکت اور وافر دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مقصد صرف ہندوستان پر حملے کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے ہندوستان پر سر ہنری ایلیٹ کے قول کے مطابق سترہ حملے کئے۔ جو اس کی فوجی قیادت کی ایک واضح دلیل ہے۔

فوجی قیادت کے لئے عسکری شہرت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی غرض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے ہندوستان پر بار بار لشکر کشی کی۔ اور اپنے دشمنوں کو سرنگوں کر کے اپنی فوجی برتری اور عسکری شہرت کا لوہا منوایا۔ چنانچہ اس کی فوجی

Marfat.com

برتری اور عسکری شہرت دور دراز کے ممالک یعنی وسط ایشیا اور ایران تک جا پہنچی۔ خلافت بغداد بھی اسکی عسکری شہرت اور فوجی دھاک سے متاثر تھی۔

فوجی جرنیل:۔ محمود فطری طور پر ایک خداداد عسکری قابلیت کا مالک تھا۔ وہ ہر قسم فوجی منصوبے اور نقشے بذات خود تیار کرتا تھا۔ اُن پر عمل درآمد بھی اپنی نگرانی میں ہی کرایا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سکندر اعظم کی طرح اسے ہر مہم میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اسکی فوج میں ترک افغان۔ ہندی اور ایرانی قومیت رکھنے والے لوگ ہوتے تھے۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ فوجی قائدانہ خوبیوں سے مکمل طور پر آراستہ تھا۔ اس نے ہر جوہر لطیف کی قدر دانی کی۔ اس لئے اپنی فوجی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سومنات۔ گنگا جمنا کے میدانوں میں لڑائیاں لڑیں گویا کہ وہ اعلیٰ قیادت میں فوجی برتری ایسے عظیم مقصد کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔

مربی علم وفن:۔ ہم آغاز میں بیان کر چکے ہیں۔ کہ وہ فوجی قیادت کے اعتبار سے ہی ارفع اور اعلیٰ مقامات حاصل نہیں کئے ہوئے تھا۔ بلکہ علوم وفنون کا بھی ایسا مربی تھا۔ کہ میدان میں بھی ہمیں وہی یکہ تاز نظر آتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کا زیرک ترین حکمران تھا۔ اور صاحب علم وفضل تھا۔ اس کے عہد زریں میں فارسی علم و ادب کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ ادب دوست۔ شعر وسخن کا رسیا اور مختلف علوم وفنون کا مربی تھا۔ اسکی معارف پروری اور علم دوستی کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ادبار وفضلار کو دریا دلی سے انعام واکرام دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے ہر فن کے بہترین اور باکمال لوگ اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

ایک انگریز تاریخ نویس لین پول محمود کی ادب نوازی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

نپولین نے مفتوحہ علاقوں سے آرٹ کے گراں بہا اور بیش قیمت نوادرات کو پیرس کے عجائب گھر میں جمع کیا۔ لیکن محمود غزنوی نے مختلف ممالک کے باکمال

Marfat.com

ارباب فن شعراء اور علماء کو اپنے دربار کی زینت بنا کر نپولین سے بہتر کام کیا۔ ہندوستان پر بار بار حملے کرنے سے محمود کو بے اندازہ دولت ہاتھ لگی۔ جس سے اس نے شہر غزنی کو خوبصورت بنانے کے علاوہ علوم و فنون کی فراخدلانہ سرپرستی کی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا دربار ایشیا بھر میں علم و فضل اور ثقافت کا ایک عظیم مرکز بن گیا تھا۔ بڑے بڑے شعراء۔ فضلاء۔ علماء۔ تاریخ دان۔ علم سائنس میں مہارت رکھنے والے۔ نجوم کے ماہر اور ریاضی دان اس کے دربار میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

شعراء میں عنصری۔ فرخی۔ اسدی اور منوچہری سرفہرست تھے۔ البیرونی جیسا ریاضی دان۔ سنسکرت اور ہندی علوم کا ماہر بھی اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ نجوم اور علم ہیئت کا نکتہ دان فارابی اور عتبی اور بیہقی جیسے مؤرخ اور وقائع نگار اس کے دربار میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اندازہ ہے کہ اس ضمن میں محمود ہر سال چار لاکھ دینار صرف کیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر ناظم لکھتے ہیں:

محمود ارباب علم و دانش پر بے حد مہربان تھا۔ اس کا ادنیٰ ترین انعام بھی ہزاروں دیناروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا منہ بیش قیمت جواہرات سے بھر دیا کرتا تھا۔ محمود نے اپنی سلطنت میں ہزاروں مکاتب اور مدارس قائم کئے تھے۔ مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ ان کے علاوہ کتب خانے اور عجائب خانے قائم کئے۔ غزنی میں ایک ایسی خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ جس کے ساتھ ہی عجائب گھر اور کتب خانہ قائم تھے۔ عجائب گھر مختلف قسم کی نادر اشیاء اور کتب خانے میں ہر شعبے کے متعلق بیش قیمت کتابیں مہیا کیں۔ غزنی کے محلات۔ باغات اور مسجدوں کو اس قدر سجایا کہ غزنی ہر لحاظ سے علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔

دربار کے چند ایک مشہور افراد:

۱۔ فضل بن احمد اسفرائنی۔ ناصرالدین کے زمانے میں وزیراعظم تھا۔ محمود نے بھی اسے اسی منصب پر بحال رکھا۔ اس نے فارسی کو سرکاری زبان بنایا۔

Marfat.com

۲۔ احمد بن حسن میمندی ۔ وزیر اعظم تھا ۔ سلطان کا ہم درس تھا ۔ مدبر سیاست دان تھا ۔ عربی فارسی کا بہترین اور بلند پایہ ادیب تھا ۔

۳۔ ثعلبی ۔ متبحر عالم ۔ مقتدر دانشور اور نادر مؤرخ تھا ۔

۴۔ ابوالخیر حماد نصرانی ۔ منطق ۔ فلسفہ اور علم طب میں یگانہ روزگار تھا ۔

۵۔ ابوریحان البیرونی :۔ اسے سنسکرت پر عبور تھا ۔ کتاب الہند اسکی مشہور تصنیف ہے ۔

۶۔ فردوسی ۔ شاہ نامے کا مشہور مصنف تھا ۔ اس نے اپنے شاہ نامے کے بارے میں لکھا ہے ۔

بسی رنج بردم دریں سال سی　　عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اس کے علاوہ عنصری ۔ فرخی ۔ اسدی اور منوچہری بھی دربار سے وابستہ تھے ۔

س ۳ :۔ علاؤ الدین خلجی کے قیمتوں پر کنٹرول کے قواعد کا تجزیہ کیجئے ۔ اور اس کے اثرات بیان کیجئے ۔

ج ۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء تک ہندوستان میں حکومت کی ۔ وہ غیر معمولی قابلیت ۔ بے حد جرأت اور آہنی عزم رکھنے والا بہت بڑا حکمران تھا ۔ وہ ہندوستان کا پہلا صاحب جاہ و جلال بادشاہ تھا ۔ جس نے اسلامی سلطنت کی حدود کو انتہائی جنوبی سرحد تک وسیع کیا ۔ اگرچہ وہ ان پڑھ تھا لیکن بے مثل فوجی سالار تھا ۔ اور معاملات کی تہہ تک پہنچنے اور تمدنی اور انسانی معاملات کو سمجھنے میں بڑا عقل مند تھا ۔ اس کی فوجی اصلاحات اشیاء کے نرخ پر کنٹرول اور نظام مالیہ اسکی اعلیٰ فہم و فراست کی آئینہ دار ہیں ۔ (ایم کبیر) اس نے ملک میں عظیم سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے بہت سی مفید اصلاحات کیں ۔ جن میں ایک اقتصادی نظام بھی ہے ۔

نظام مالیہ کی اصلاحات کی مانند اقتصادی نظام میں بھی سیاسی اور فوجی مقاصد کارفرما تھے ۔ چونکہ منگول آئے دن ہندوستان پر حملے کرتے رہتے تھے ۔ ان کے حملوں

Marfat.com

کی روک تھام کے لئے علاء الدین خلجی نے ایک مستقل فوج رکھنے کا ارادہ کیا۔ فوجی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے روپے کی سخت ضرورت درپیش ہوئی۔ کافی غور وخوض کے بعد علاء الدین اس نتیجے پر پہنچا کہ اشیائے ضرورت کی قیمتیں کم کر دی جائیں۔ اگرچہ اس قسم کے قواعد نافذ کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ لیکن فطری طور پر علاء الدین اس قسم کی مشکلات سے ہرگز گھبراتا نہیں تھا۔ لہٰذا جب اسے اس منصوبے کے مفید ہونے کا یقین ہو گیا۔ تو اس نے اقتصادی حکمت عملی کے لئے کئی ایک ضابطے وضع کئے۔ جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ منڈیوں میں اشیاء کی فراہمی کا موزوں نظام نافذ کیا۔

۲۔ وافر پیداوار علاقوں سے اشیاء خوراک کو دوسرے علاقوں میں منتقل کرنے کا مناسب انتظام کیا۔

۳۔ اشیاء ضرورت کی کمیابی بلکہ نایابی کی صورت میں ان کی ضرورت کے مطابق راشن بندی اور تقسیم کا بندوبست کیا۔

۴۔ خفیہ پولیس کے مخبروں کے ذریعے منڈیوں اور بازاروں میں نرخوں پر کڑی نگرانی کی۔ ناجائز نفع اندوزی اور منڈیوں کے متعلقہ دوسرے جرائم کی سخت سزائیں مقرر کیں ان وضع کردہ اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ علاء الدین کا مقرر کردہ اقتصادی نظام تاریخ میں بے مثال خیال کیا جاتا ہے۔

اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرتے ہوئے ہم علاؤ الدین کے ماہر اقتصادیات ہونے کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بے شک وہ عظیم فاتح تھا۔ اور اعلیٰ درجے کا ناظم تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ اقتصادیات کی جزء جزء سے کماحقہٗ واقف تھا۔ ہر کام کو وہ اس انداز سے انجام دیتا تھا۔ کہ کسی قیمت پر بھی اسے ادھورا نہیں چھوڑتا تھا۔ اشیائ کی قیمتوں کے تعین کے ضمن میں بھی اس نے اسی اصول کو پیش نظر رکھا۔ وہ بذات خود قیمتوں کا تعین کرتا تھا۔ اس نے تمام ملک میں اُن کے نفاذ کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ چند ایک اشیاء کی قیمتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

Marfat.com

۱۔ گندم فی من (بارہ سیر موجودہ) ۷ ۱/۲ جیتل (۵۰ جیتل موجودہ روپے کے برابر تھے)

۲۔ چنا	″	۵ ″
۳۔ دھان	″	۵ ″
۴۔ دال، نخس	″	۵ ″
۵۔ جو	″	۴ ″
۶۔ موٹھ	″	۳ ″
۷۔ نمک ۵ سیر		۱ ″
۸۔ تلوں کا تیل ۳ ″		۱ ″
۹۔ مصری فی سیر		۲ ″
۱۰۔ شکر سفید ″		۱ ″
۱۱۔ شکر سُرخ ″		۱/۲ ″
۱۲۔ گُڑ		۱/۲ ″

سبزی۔ پھل، ٹوپی، کنگھی، سوئی۔ کوزے تک کی قیمتیں مقرر تھیں۔ علاء الدین نے ملک قبول کو جو اعلیٰ درجے کا منتظم تھا اور دیانت دار تھا۔ غلہ منڈی کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اس چند ایک قواعد مقرر کئے۔

۱۔ سرکاری زمین کو کل پیداوار (جنس کی صورت میں) جمع کرنے کا اہتمام کیا۔

۲۔ سرکاری لگان بھی نقدی کی جگہ جنس کی صورت میں وصول کرنے کا حکم دیا۔

۳۔ تمام غلہ شاہی گوداموں میں جمع کرنے کا حکم دیا۔

۴۔ دہلی کے علاقے سے سرکاری لگان کا نصف حصہ غلہ کی شکل میں وصول کر کے غلے کے تاجروں کے سپرد کیا۔ تاکہ وہ دہلی میں فروخت کریں۔

۵۔ کاشتکاروں کو صرف اپنی ضرورت کے مطابق سال بھر کا غلہ جمع رکھنے اور زائد غلے کو مقررہ نرخوں پر فروخت کرنے کا حکم دیا۔

۶۔ محکمہ مال کے افسران کو حکم دیا۔ کہ وہ کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ غلہ فروخت

Marfat.com

کرنے پر مجبور کریں۔

اگر قحط یا خشک سالی یا کسی اور سبب سے تاجر پورا غلہ شہر میں نہ لا سکتے تھے۔ تو انہیں شاہی ذخیروں سے غلہ مہیا کیا جاتا تھا۔ تاکہ غلے کی بہم رسانی اور قیمتوں کے اعتدال پر رہنے میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ ہر آدمی کو اپنی ضرورت سے زیادہ غلہ خریدنے کی اجازت نہ تھی۔ نقل و حمل کے لئے تمام غلہ فروشوں اور تاجروں کو دریائے جمنا کے کنارے ساحلی دیہات میں آباد کیا۔ ان سے اقرار لیا گیا۔ کہ وہ ملک کے مختلف حصوں سے غلہ خرید کر منڈیوں میں لایا کریں گے۔

نقل و حمل کے ضمن میں تمام مشکلات پر قابو پانے کے لئے نہایت مستعد اور خفیہ مخبر مقرر کئے۔ تاکہ بادشاہ کو اشیاء کے نرخوں اور منڈیوں کے اتار چڑھاؤ سے باخبر رکھیں۔ کوتاہی کی بنا پر انہیں جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔ ذخیرہ اندوزوں اور گراں فروشوں کے لئے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ کسی آدمی کو ان احکامات کو نہ ماننے کی جرأت تک نہ ہو سکتی تھی۔ خشک سالی کے دوران میں غلے کی قیمتیں اعتدال پر رہتیں اور غلے کی فراہمی میں کوئی خلل نہ پڑتا تھا۔ سرکاری ذخیروں میں غلہ جمع رہتا۔ قلت کے زمانے سرکاری ذخیروں سے غلہ فراہم کیا جاتا۔ اگر کسی کو غلے کے حصول میں کوئی دشواری پیش آتی۔ تو متعلقہ حکام سے سخت باز پرس کی جاتی۔

علاء الدین نے اشیاء خوردنی کے علاوہ عمدہ کپڑے۔ میوہ جات۔ گھی اور جلانے کے تیل کی قیمتوں پر بھی یہی قواعد نافذ کئے۔ ان تمام اشیاء کی فروخت کا انتظام ایک خاص غلہ منڈی میں کیا گیا۔ جسے سرائے عدل کہتے تھے۔ مقررہ قیمت سے زیادہ وصول کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

کپڑے کے تمام تاجر اپنے نام ایک رجسٹر میں درج کرا کے کثرت سے کپڑا سرائے عدل میں لاتے تھے۔ دور دراز علاقوں سے قیمتی کپڑا اور اشیاء ضرورت لانے والوں کو بیس لاکھ تنکہ کی رقم بطور قرض دی گئی تاکہ اشیاء صرف کے لانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ سرائے عدل میں کاروبار کے اوقات صبح سے ظہر تک مقرر تھے مختلف

Marfat.com

اقسام کے گھوڑوں۔ گایوں اور بھیڑوں کی بھی قیمتیں مقرر تھیں۔

راشن بندی کے منصوبے میں سلطان کو بڑی کامیابی ہوئی، قحط یا خشک سالی میں بھی قیمتیں معمول کے مطابق رہتی تھیں۔ علاء الدین کے عہد زریں کا اقتصادی نظام مدتوں ضرب المثل رہا۔ حقیقتاً یہ امر سلطان کی اقتصادی مہارت پر دلالت کرتا ہے متعصب تاریخ نویسوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

س۴۔ غیاث الدین تغلق کے کارنامے بیان کیجئے۔ وہ کس طرح موت سے ہمکنار ہوا؟

ج۔ غیاث الدین تغلق نے ۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۵ء تک حکومت کی۔ سر ولزلے ہیگ کی غیاث الدین تغلق کے متعلق رائے درج ذیل ہے:۔

غیاث الدین تغلق ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ شعائر اسلامی کا پابند تھا۔ اس نے شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی پیداوار اور فروخت کو اسلامی قانون کے مطابق جرم قرار دیا۔ وہ غرور شاہی اور کبر و نخوت سے پاک تھا۔ سریر آرائے تخت ہونے کے بعد اپنے خاندان کے افراد۔ دیرینہ احباب اور ملازمین سے اس کے تعلقات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آیا۔

The Cantanbridge History
-of India Vol. III

غیاث الدین شروع میں سندھ کے ایک تاجر کے گھوڑے چرایا کرتا تھا۔ الغ خان برادر علاء الدین کی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ رفتہ رفتہ سواروں میں شامل ہوکر جرأت و مردانگی کے جوہر دکھانے کی پاداش میں امیر آخور (داروغہ اصطبل) کے منصب پر فائز ہوگیا۔ سلطان علاء الدین نے ۱۳۰۵ء میں دیپالپور کے اہم سرحدی صوبے کا حاکم مقرر کیا۔ اس جگہ اس نے منگولوں کی سرکوبی کے ضمن میں بہت سی کامیاب مہمیں سر کیں۔ اس نے منگولوں سے انتیس[۲۹] جنگیں لڑیں اور انہیں شکست فاش دی۔ جس کی وجہ سے اسے امرائے کبیر میں شامل ہوگیا۔ علاء الدین نے اسے غازی کا خطاب دیا۔ (ابن بطوطہ) علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد راوت کے میدان میں خسرو خان کو شکست دے کر ۶ دسمبر ۱۳۲۰ء میں سلطان غیاث الدین تغلق شاہ غازی کا لقب

Marfat.com

اختیار کر کے دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ (اے۔ ایل۔ سری واستوا)

اس نے سریر آرائے سلطنت ہوتے ہی اپنے اعزہ و اقربا کو مناصب جلیلہ عنایت کئے۔ اور علاء الدین کے حرم سے نہایت ہی مشفقانہ سلوک کیا۔

اسے تخت نشین ہوتے ہی گوناگوں مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک کافور، قطب الدین مبارک شاہ اور خسرو خان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے امور سلطنت تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ملک کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی تھی۔ علاء الدین کے جملہ قوانین منسوخ ہو چکے تھے۔ معاشرہ اخلاقی اعتبار سے تباہ ہو چکا تھا۔ عوام کے دلوں پر حکومت کی سطوت ختم ہو چکی تھی۔ سیاسی انتشار اور بدنظمی کی حالت پیدا ہو چکی تھی۔ الغرض غیاث الدین کے تخت نشین ہوتے ہی انتظامی اور معاشرتی ڈھانچہ تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی دانائی اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے حالات کی اصلاح کی۔ اور قلیل مدت میں سلطنت کا استحکام اور حسن انتظام بحال ہو گیا۔ اس اعتدال کو مد نظر رکھتے ہوئے نہ بے جا سختی کا مظاہرہ کیا۔ اور نہ ہی زیادہ نرمی سے کام لیا۔ تمام کے حقوق کا مناسب لحاظ کرتے ہوئے غیر جانب دارانہ سلوک روا رکھا۔ افسوس اس بات کا ہے۔ کہ پانچ سال کی قلیل مدت اس کے ملک کے سیاسی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ لیکن مدت کے بے رحم ہاتھوں نے ایک مدبر۔ صلح کل اور دلیر حاکم کو چھین لیا۔ اس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ مصالحانہ رویہ۔ اس نے اپنے قدیم آقا علاء الدین خلجی کے پس ماندگاں کے وظائف مقرر کئے۔ اور اس کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

۲۔ علاء الدین کے زمانے کے امراء اور مشیروں سے مشورہ لینے کی رسم کو جاری اور برقرار رکھا۔

۳۔ علاء الدین کی سخت گیری اور انتہا پسندی سے اجتناب کیا۔

۴۔ خسرو کی دی ہوئی گراں قدر جاگیریں اور رقوم بیت المال میں واپس کر دیں۔

۲۔ زراعتی اصلاحات:۔ (۱) اس نے کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کی جس

Marfat.com

کی وجہ سے زراعت میں ترقی ہوئی۔ کسانوں اور حکومت کو یکساں فائدہ پہنچا۔

۳۔ علاءالدین خلجی کے مقرر کردہ حکم مساحت (پیمائش کا طریقہ) کو یکقلم ترک کر دیا۔ کیونکہ ان قوانین کی وجہ سے کاشتکاروں پر سختی ہوتی تھی۔ فصل خراب ہونے کی صورت میں سرکاری مطالبہ کم کرنا پڑتا تھا۔ جس سے کاشتکاروں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

۴۔ سلطان علاءالدین سے قبل کا طریقہ رائج کیا۔ جسکی رُو سے سرکاری مطالبہ کا تعین کھیت کی حقیقی پیداوار پر ہوتا تھا۔

۵۔ حکم جاری کیا۔ کہ سرکاری مطالبے میں اضافہ یک دم نہ کیا جائے۔

۶۔ محکمہ مال میں ایسے تمام لوگوں کی آمد و رفت پر پابندی عائد کر دی۔ جنہوں نے پیداوار کے اضافے کی مخبری کرنا۔ سرکاری مطالبے کے بڑھانے کو اپنا پیشہ اور ذریعہ آمدنی بنا رکھا تھا۔ کیونکہ کمیشن وصول کرنے کی خاطر انکی اکثر اطلاعات غلط ہوتی تھیں۔ اور کاشتکاروں کیلئے پریشانی کا سبب ہوتی تھیں۔ سلطان نے غیر شرعی محصولات منسوخ کر دئے۔

۷۔ علاءالدین خلجی کے زمانے میں نمبرداروں۔ مقدموں اور چوہدریوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔ سلطان تغلق نے اس اعتماد کو بحال کر دیا۔ اور محصولات کی فراہمی میں انہیں اپنا معاون بنا لیا۔ اور بدلے کے طور پر چرائی ٹیکس انپر معاف کر دیا۔ وہ رعایا سے کوئی ناجائز طور پر معاوضہ وصول نہیں کر سکتے تھے۔

۸۔ لگان وصول کرنے اور دوسری بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے ایک نیا محکمہ دیوان مستخرج قائم کیا۔ جو صوبیداروں اور ماتحت حکام کے حساب کتاب کی نگرانی کرتا تھا۔ اور بددیانتی کرنے والوں کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔

۹۔ گورنروں کا وقار قائم کرنے کیلئے سلطان نے ان پر سے جا سختی ترک کر دی۔ جو ان پر حساب گیری کے دوران میں دیوان وزارت میں ہوا کرتی تھی۔ صوبائی محصولات سے پانچ فی صدی رقم اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی۔ لگان وصول کرنے والے بھی ڈھائی فیصدی محصولات میں سے اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ اس رعائت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کو سخت ترین سزائیں دیں۔

Marfat.com

۱۔ بنجر زمینوں کا تفصیلی جائزہ لے کر آبپاشی کا مناسب بندوبست کرکے آباد کیا۔ باغات لگوائے۔ اس طرح بہت سا بنجر علاقہ قابل کاشت ہو گیا۔ اور شاہی خزانے میں اضافہ ہوا۔

۳۔ **فوجی اصلاحات** ۔ سلطان ایک آزمودہ کار جرنیل تھا۔ اس لئے وہ فوج کا خاص خیال رکھتا تھا۔ فوجیوں کے لئے مختص رقم کو سختی سے فوجوں پر ہی خرچ کرتا تھا۔ اور تاکید کی ہوئی تھی کہ امراء اور افسرانِ اعلیٰ کسی قسم کی خیانت نہ کرنے پائیں۔ اس وجہ سے فوجوں کو باقاعدہ تنخواہ ملنے لگی۔

۲۔ سواروں اور گھوڑوں کا حلیہ محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا۔ اسلحہ کی جانچ پڑتال کرنے کے قوانین سختی سے نافذ کئے۔ اس وجہ سے فوج مستعد رہتی تھی۔ غفلت اور سستی نام کو بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

۴۔ **رفاہی اقدامات** ۔ سلطان نے غرباء، مسکینوں اور مفلوک الحال لوگوں کی امداد کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا۔ قحط اور خشک سالی کے زمانے میں رعایا اور کاشتکاروں کی مالی امداد کا انتظام کیا۔

۲۔ گداگری اور شراب نوشی کو سختی سے ممنوع قرار دیا گیا۔

۳۔ تجارت و صنعت کی ترقی کے لئے شاہراہوں کو لٹیروں اور ٹھگوں سے محفوظ کیا گیا۔

۴۔ حکومت کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے عمال کو باقاعدگی سے تنخواہیں دینے کا اہتمام کیا۔

۵۔ **فوجی مہمات** : سلطان نے داخلی مسائل حل کرنے کے بعد انتظامی اور مالیاتی امور کو درست کیا۔ سلطان نے سلطنت کی توسیع اور حکمرانوں کی گوشمالی کی طرف توجہ مبذول کی۔ خسرو خان کے زمانے کے باغیوں کا قلع قمع کیا۔ دو مہمیں اپنے بیٹے جونا خان کی سرکردگی میں دکن کی طرف روانہ کیں۔

۱۔ ۲۲ - ۱۳۲۱ء میں اپنے بیٹے جونا خان کی سرکردگی میں تسخیر ورنگل کے لئے بھاری

Marfat.com

فوج روانہ کی۔ کیونکہ راجہ نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔

۲۴-۱۳۲۳ء میں دوبارہ ورنگل کی تسخیر کے لئے مہم روانہ کی۔ کیونکہ پہلی دفعہ فتنہ پردازوں نے مشہور کر دیا تھا۔ کہ سلطان فوت ہوگیا ہے۔ شہزادہ امراء کے مشورے سے دہلی پہنچ گیا۔ تاکہ تخت پر قابض ہوسکے۔ خبر غلط ثابت ہوئی۔ شہزادہ نے ناکامی کے بارے میں معافی طلب کی۔ دوبارہ مہم پہ روانہ ہوکر شہزادے نے محاصرہ سخت کیا۔ راجہ مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے گرفتار ہوگیا۔

۱۳۲۴ء میں بنگال کی تسخیر کے لئے مہم روانہ کی۔ بنگال کا صوبہ بلبن کے زمانے سے نیم آزاد چلا آ رہا تھا۔ شاہ دہلی کا باجگذار تھا۔ سکہ اور خطبہ بھی سلطان کا ہی چلتا تھا۔ تغلق نے بذاتِ خود فوج کشی کی۔ سلطان نے ناصر الدین کو چتر شاہی اور دور باش عنایت کرکے بنگال کا حاکم تسلیم کرلیا۔ سلطان بھاری مال غنیمت لے کر واپس دہلی آیا۔

سلطان کی وفات:- ۱۳۲۵ء میں بنگال کی تسخیر کے بعد سلطان نے ترہٹ کو بھی فتح کرلیا۔ اور دہلی کی طرف چل دیا۔ باپ کی آمد کی خبر سُن کر شہزادہ جونا خان نے بوڑھے باپ کا استقبال کرنے کے لئے لکڑی کا ایک محل تعمیر کرایا۔ شاہانہ استقبال کیا گیا۔ عمائدین سلطنت نے شاہ کو پُرتکلف دعوت دی۔ ضیافت کے بعد سلطان دہلی روانہ ہونے ہی والا تھا۔ کہ شہزادے نے ہاتھیوں کی نمائش کا انتظام کیا۔ ہاتھیوں کی نمائش سے لکڑی کا محل لرزنے لگا۔ بہت سے لوگ بھاگ کر باہر چلے گئے۔ سلطان ابھی اندر ہی تھا کہ چوبی مکان کی چھت گر پڑی۔ سلطان اپنے بیٹے محمود خان اور دوسرے امراء کے ساتھ چھت کے نیچے دب کر فوت ہوگیا۔

سلطان کی وفات کے متعلق مختلف خبریں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جونا خان کی حصول تخت کے لئے سازش تھی۔ دورِ حاضر کے مورخین نے شہزادے کو اس الزام سے بری قرار دیا ہے۔ کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ اچھے تعلقات کی بنا پر بیٹے کو اس الزام میں ملوث کیا جائے۔ جونا خان ولی عہد پہلے ہی مقرر ہوچکا تھا۔ لہٰذا الزام بے بنیاد اور دور از حقیقت ہے۔

Marfat.com

س ۵۔ محمد تغلق نہ خیال پرست تھا۔ وہ دماغی طور پر ناقص العقل بھی تھا۔ اسکی بڑی بڑی سکیمیں ہی ناممکنات سے تھیں۔ بحث کیجئے۔

ج ۔ آغا مہدی حسین کی رائے یہ ہے کہ محمد تغلق خاندان تغلق کے عظیم حکمرانوں میں سب سے زیادہ بلند حیثیت کا مالک ہے۔ کیونکہ اس کے وقت اقتدار سلطنت تغلق بام عروج کو پہنچی۔

. Rise + Tale of Muhammad Taghluq

محمد تغلق کے منصوبے۔ سلطان کی طبیعت میں قدرت اور اختراع کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ وہ ہمیشہ انوکھی اور شاندار تجویزیں سوچتا رہتا تھا۔ لیکن اس میں ایک بڑی طبعی خامی بھی تھی کہ وہ ان شاندار منصوبوں کی عملی صورت کا جائزہ نہ لیتا تھا۔ اور عوام کے احساسات اور جذبات کو ملحوظ نہیں رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے اکثر منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچتے تھے۔

مشہور مؤرخ لین پول کی رائے ہے کہ سلطان اعلیٰ تخیل اور انتہائی بلند ارادوں کا مالک تھا۔ مگر اسکی تجویزیں اس عہد کے حسب حال نہ تھیں۔

سلطان نے تخت دہلی پر ۱۳۲۵ء سے لے کر ۱۳۵۱ء تک حکومت کی ہے۔ دوران سلطنت میں اس نے کئی ایک منصوبے بنائے۔ لیکن اُن کا انجام کوئی اچھا نہیں ہُوا۔ جو درج ذیل ہیں :-

۱۔ **دوآب کے مالیہ میں اضافہ :-** سلطان نے دوآب یعنی گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں لگان میں پانچ فیصد سے دس فی صد تک بڑھا دیا۔ سلطان نے اس امر کو پیش نظر نہ رکھا۔ کہ لوگ بلبن اور علاؤالدین خلجی کی مہموں کے باوجود راہ راست پر نہیں آئے۔ لگان کے اضافے کی وجہ سے لوگ فتنہ و فساد پر آمادہ ہو گئے۔ احکام شاہی سے سرتابی شروع کر دی۔ زراعت ترک کر دی۔ اپنے مال مویشی چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے۔ ملکی حالات خراب ہو گئے۔ ملک میں قحط پڑ گیا۔ فتنے کی سرکوبی کے لئے شاہی فوجوں کو حرکت میں آنا پڑا۔ بغاوت کچلی گئی۔ باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔

سلطان نے دوآبے میں از سر نو آبادکاری اور حالات سازگار بنانے کے لئے متا-

Marfat.com

تدابیر اختیار کیں۔ قحط زدگان کو تقاوی اور قرضے دئے گئے۔ آبیاری کے لئے کنوئیں کھدوائے گئے۔ لیکن سلطان کی تمام کوششیں رائگاں ثابت ہوئیں۔ لہٰذا حکومت کا وقار بری طرح مجروح ہوا۔ ۱۳۲۶ء

۲۔ دارالسلطنت کی تبدیلی۔ ۱۳۲۷ء میں سلطان نے دہلی کے بجائے دیوگری کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ دیوگری کے قریب ایک نیا شہر دولت آباد آباد کیا۔ دہلی کے عوام۔ علماء۔ امراء اور مشائخ کو اسجگہ منتقل ہونے کا حکم دیا۔ دہلی کی سلطنت کی حدود بہت وسیع ہو چکی تھی جو دریائے سندھ سے لے کر بنگال تک اور کوہ ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔

دیوگری کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور دہلی منگولوں کے حملوں کی زد میں تھا۔ سب سے بڑی وجہ سلطان کے نزدیک یہ تھی کہ امراء۔ علماء اور مشائخ کو دیوگری میں آباد کرنے سے اسلامی حکومت کو آسانی سے فروغ حاصل ہو گا۔ اور دکن اسلامی تہذیب کا گہوارہ بن جائے گا۔

سلطان کے حکم سے مجبور ہو کر عوام کو سات سو میل کا سفر طے کر کے دیوگری جانے کی جملہ مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اثنائے سفر بہت سے لوگ وفات پاگئے۔ زندہ لوگ جو دیوگری پہنچے۔ وہ بے حد دل شکستہ اور مایوس تھے۔ ساتھ ہی وہاں کی آب و ہوا موافق نہ آئی۔ علماء اور امراء نے اس جگہ رہنا پسند نہ کیا۔ لوگوں کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ جب سلطان کو لوگوں کی مصیبتوں کا پتہ چلا تو اس نے واپس دہلی کا حکم دے دیا۔ اگرچہ سلطان نے تا حد امکان آمد و رفت کے دوران میں کافی سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائیں۔ لیکن لوگوں کا آنے جانے میں بہت زیادہ نقصان ہوا۔ اگر حقیقت کو سامنے رکھا جائے۔ تو دارالحکومت کا تبدیل کرنا کوئی ایسی غلطی نہ تھی۔ جس کی بناء پر سلطان کو کلی طور پر ناقص العقل قرار دیا جائے۔ دہلی سے صرف مسلمان امراء۔ علماء کو نقل وطن کا حکم دیا۔ باقی لوگ دہلی میں ہی رہے۔ شاہی ٹکسال دہلی میں تھی۔ سرکاری کام برابر جاری تھے۔ نتیجۃً کہا جا سکتا ہے۔ کہ سلطان کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہوا۔

Marfat.com

لیکن اس کا اتنا فائدہ بھی ہوا۔ کہ دکن میں اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ دہلی کی ریختہ زبان دکن میں رائج ہوئی۔ ایک خود مختار بہمنی سلطنت یعنی اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مبلغین اسلام کی وجہ سے بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

۳۔ **علامتی سکے کا اجراء:**۔ سلطان نے ایک علامتی سکہ جاری کر کے دلیرانہ اقدام کیا۔ علامتی سکہ کاغذی نوٹ تھا (یہی کاغذی نوٹ آجکل ہر ملک میں رائج ہے) یا تانبے اور کانسی کے علامتی سکے جاری کئے۔ ان کی قیمت صرف شدہ دھات سے کہیں زیادہ تھی۔ ساتھ ہی یہ حکم تھا۔ کہ لین دین میں اسے چاندی کے برابر سمجھا جائے۔ چونکہ پہلے ملک میں اس قسم کے سکے کا رواج نہ تھا۔ اس وجہ سے لوگ سلطان کے منصوبے کی قدر و قیمت پر حاوی نہ ہو سکے۔ بلکہ ان کا خیال تھا۔ کہ ارزاں دھات کا سکہ جاری کر کے ہمیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ لوگوں نے جعلی سکہ بنانا شروع کر دیا۔ ضیاء الدین برنی کے قول کے مطابق ہر سنار کا گھر ایک ٹکسال بن گیا۔ اس وجہ سے سرکاری سکے کی ساکھ ختم ہو گئی تجارت کا انتظام برہم ہو گیا۔ مالیہ چونکہ علامتی سکوں میں ادا ہوتا تھا۔ ان میں کثیر تعداد جعلی سکوں کی ہوتی تھی۔ اسی لئے حکومت کو بھی نقصان ہوا۔ اس پر سلطان نے علامتی سکے کو منسوخ کر دیا۔ اور سرکاری خزانے میں واپس لوٹا کر سونے چاندی کا سکہ لینے کا حکم دیا۔ نتیجے کے طور پر خزانے کے سامنے جعلی سکے کے ڈھیر لگ گئے۔ جو خاندان سادات کے زمانے تک دیکھنے میں آتے رہے۔ (بقول فرشتہ)

علامتی سکے کے اجراء کے ضمن میں سلطان نے عوام کی ذہنی حالت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی جعلی سکے کی روک تھام کے لئے مناسب تدابیر اختیار کیں۔ اس لئے سلطان کی یہ تدبیر کامیاب نہ ہوئی۔

۴۔ **خراسان کی مہم:**۔ سلطان کے دل میں منگولوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کا خیال آیا۔ اس لئے اس نے خراسان فتح کرنے کا خیال کیا۔ کیونکہ وہاں کا حاکم عوام میں غیر مقبول تھا۔ سلطان کے دل میں خیال آیا کہ والئے توران کے ساتھ تعلقات اچھے کر کے خراسان پر حملہ کر دیا جائے۔

اس غرض سے تین لاکھ ستر ہزار جوانوں پر مشتمل لشکر تیار کیا۔ ان پر بہت سا روپیہ خرچ

Marfat.com

کیا۔ اسی دوران میں والئے توران ترمد شیریں کے قتل کی خبر آئی۔ اور خراسان میں ابوسعید نے اپنی سلطنت مضبوط کر لی۔ تو سلطان نے اس مہم کو ترک کر دیا۔ اس مہم کی ناکامی بھی سلطان کے خلاف جاتی ہے۔

۵۔ **قراچل کی مہم**۔ تسخیر خراسان کی مہم کی ناکامی کے بعد سلطان نے کوہ ہمالیہ کے دامن کی ریاستوں کو سر کرنے کا ارادہ کیا۔ دہلی سے فوج روانہ کی گئی۔ اور اپنے بہنوئی خسرو ملک کی قیادت میں یہ فوج پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کی گئی آغاز میں سلطانی فوج کو کچھ فتح ہوئی لیکن بارشوں کی کثرت اور دشوار گذار راہ کی وجہ سے یہ مہم ناکام ہو گئی۔ فوج کا کثیر حصہ تباہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ۳۸-۱۳۳۷ء کا ہے۔

۶۔ **چین سے سفارتی تعلقات**:۔ سلطان کے بعض ایشیائی ممالک تک خصوصاً چین سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ۱۳۴۱ء میں شہنشاہ چین نے ہمالیہ کی وادی میں بدھ مندروں کی تعمیر کی اجازت مانگی۔ جو کہ قراچل کی مہم میں اسلامی فوج کی وجہ سے تباہ ہوئے تھے۔ سلطان نے اپنا سفیر ابن بطوطہ مقرر کر کے چین بھیجا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا۔ کہ جزیہ دئیے بغیر تعمیر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

۷۔ **منگولوں کا حملہ**:۔ ۱۳۲۹ء میں توران کے حاکم ترمد شیریں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ سلطان نے مقابلہ کرنے کے بجائے بے شمار مال و دولت دے کر واپس کر دیا۔ یہ پالیسی عوام نے بہت ناپسند کی۔

سلطان محمد بن تغلق کا کردار اور اس کی متضاد خصوصیات:

سلطان کو اللہ تعالےٰ نے وہ ہمت عطا کی تھی۔ جس کی مثال زمین و آسمان میں نہیں ہو سکتی۔ جہاں گیری کے اوصاف اس کی فطرت میں خاص طور پر پائے جاتے تھے۔ اسکی شروع سے ہی خواہش تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور سکندر جیسی اسے سلطنت نصیب ہو۔ سلطان پانچ وقت کا نمازی تھا۔ کوئی غیر شرعی کام نہیں کرتا تھا۔ اس قسم کے عقائد رکھنے کے باوجود وہ عوام مسلمانوں کا خون گرانے میں دریغ نہیں کرتا تھا۔ سلطان بہت بڑا فیاض تھا۔ اور جہانداری میں اپنی جہاں بین طبع سے جدتیں کرنے کا عادی تھا۔ اپنی ذہانت

Marfat.com

کی بنا پر ہر صادر و وارد کی خوبیاں اور خامیاں اس پر عیاں ہو جاتی تھیں۔ ہم آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ جس شخص میں اتنی خوبیاں ہوں گی۔ خامیوں سے خالی نہیں ہوتا۔
دوسری بات یہ ہے کہ ایک انسان اپنے قول و فعل سے ہر دوسرے آدمی کو خوش نہیں کر سکتا ——— کہ ضیاء الدین برنی سلطان سے ناراض تھا۔ اس لئے اس نے سلطان کے کردار کو واضح طور پر عیاں پیش کیا۔ عجوبہ روزگار متضاد کیفیات کا بھی حامل ہو سکتا ہے۔ اس لئے سلطان کی ہر ادا کو نظر تنقید سے اصلاحی رنگ میں پرکھا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

س ۴۔ فیروز شاہ تغلق کے کردار:۔ پالیسی اور اصلاحات پر بحث کیجئے۔ کیا آپ اس کو ایک کامیاب حکمران قرار دیں گے؟

جواب۔ فیروز تغلق ۱۳۸۸ – ۱۳۵۱ء۔ فیروز شاہ تغلق نے ہندوستان پر سینتیس[۳۷] سال حکومت کی۔ سری واستوا کی رائے میں فیروز تغلق اپنے قول و فعل میں راسخ اور دیانت دار تھا۔ وہ بلاشک و شبہ عوام کا خیر خواہ تھا۔ اس سے پہلے یا بعد میں سلطنت دہلی کے کسی بادشاہ نے اپنی رعایا کی فارغ البالی اور خوشحالی کے لئے اس جیسا کوئی کام نہیں کیا۔ اس کے جاری کردہ نظام مالیہ سے صرف زراعت کو ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ عوام خوشحال اور فارغ البال ہو گئے۔

جب فیروز تغلق تخت شاہی پر متمکن ہوا۔ تو اسے پختہ عمر ہونے کی وجہ سے کافی سے زیادہ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس نے سلطان محمد تغلق کی پالیسی کا کافی سے زیادہ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے اس کے تباہ کن اثرات کا بخوبی مطالعہ کیا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے تمام طاقت ور عناصر کو اپنا ہم نوا بنانے کا ارادہ کیا۔ وہ علماء و امراء سے اختلاف رکھنا پسند نہ کرتا تھا مذہبی آدمی ہونے کیوجہ سے تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ تخت نشینی سے قبل ہی ایک رحم دل اور فیاض انسان کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے تخت نشین ہوتے ہی مندرجہ ذیل اقدامات کئے۔

۱۔ ملک مقبول کو خان جہاں کے خطاب سے اپنا وزیر مقرر کیا۔ جو کہ خواجہ جہاں احمد ایاز کی مخالفت اور اس کے برطرف کرنے کی کوششوں میں پیش پیش تھا۔

۲۔ خان جہاں احمد ایاز نے اپنے آپکو مستحکم کرنے کیلئے امراء میں جو مال و دولت تقسیم

Marfat.com

کی تھی۔ معاف کر دی گئی۔

۳۔ رعایا کی خوشحالی اور بہتری کے لئے خراج۔ زکوٰۃ۔ جزیہ اور خمس کے سوا سب غیر شرعی ٹیکس معاف کر دیئے۔

۴۔ رعایا سے مشفقانہ اور رحدلانہ سلوک روا رکھتے ہوئے خوفناک اور وحشت ناک سزائیں یک قلم ختم کر دیں۔ قید خانوں کی حالت کو سدھارا۔

۵۔ حکومت کے نام سابقہ واجب الادا قرضے معاف کر دے۔ بری رسموں اور بدعتوں کو منسوخ کرتے ہوئے عورتوں کا مزاروں پر جانا روک دیا۔

۶۔ سونے چاندی کے برتنوں اور ریشمی کپڑوں کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

فیروز شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی حصول مقبولیت کی خاطر بہت سے اہم امور سرانجام دیئے۔ جن میں فوجی مہموں کے علاوہ مالی اور ملکی اصلاحات بھی شامل ہیں۔

جنگی مہمیں:۔ (۱) بنگال کی مہم۔ ۵۹-۱۳۵۴ء فیروز شاہ کے تخت نشین ہوتے وقت بنگال کا حاکم حاجی شمس الدین ایلیاس تھا۔ جس نے بنگال میں خود مختار حکومت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے بہار اور اودھ پر حملے شروع کر دئے۔ نومبر ۱۳۵۳ء میں سلطان نے اسکی گوشمالی کے لئے ایک لشکر جرار بنگال کی طرف روانہ کیا۔ بنگالی فوج کو شکست ہوئی۔ بارشوں کے شروع ہونے کیوجہ سے طرفین نے صلح کر لی۔ صلح کے بعد سلطان واپس دہلی آ گیا۔

(۲) **جاج نگر:۔** بنگال سے واپسی پر سلطان اپنے آباد کردہ شہر جون پور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد جاج نگر پر حملہ کر دیا۔ جاج نگر کے راجے میں مقابلے کی تاب نہ تھی۔ ہر سال ہاتھی روانہ کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ یہ مہم ۱۳۹۰ء میں سر ہوئی۔

(۳) **نگر کوٹ:۔** ۱۳۶۰ء نگر کوٹ کے راجے نے اپنی طاقت کے گھمنڈ پر اردگرد کے علاقے میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ سلطان نے راجے کی گوشمالی کے لئے نگر کوٹ پر فوج کشی کر دی۔ چھ ماہ کے محاصرے کے بعد آخر کار صلح ہو گئی۔ سلطان جوالا مکھی کے مندر سے سنسکرت کی بہت سی کتب اپنے ساتھ لایا۔ جن میں بعض کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا گیا۔

(۴) **ٹھٹھہ:۔** تغلق کی بغاوت کے وقت سندھ سلطنت دہلی سے آزاد ہو گیا۔

Marfat.com

سندھ اس وقت سمہ خاندان کے جام علاء الدین جونا اور صدر الدین بانبھینہ کے ہاتھوں میں تھی۔
انہوں نے تاتاریوں سے مل کر ملتان اور گجرات پر حملے کر دیئے۔ ۱۳۶۱ء سلطان بھاری
لشکر لے کر انکی بغاوت کو فرد کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔
دوران محاصرہ میں رسد کے ختم ہونے کی وجہ سے سلطان کو مجبوراً مہم کو ترک کرنا پڑا۔ بظاہر اس
مہم میں سلطان ناکام ہوا۔

غیر مستقل مزاج ہونے کیوجہ سے سلطان کی فتوحات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن امور
جہانبانی میں اس کی استعداد اور قابلیت مسلم تھی۔ اس نے ملک میں امن وامان بحال کر کے عوام
کی اقتصادی حالت بہتر بنا دی۔ وہ ہمیشہ اپنی تمام تر توجہ اصلاحات کی طرف رکھتا تھا۔
اصلاحات میں اس نے ہمیشہ رفاہ عامہ کو پیش نظر رکھا۔ جس کی وجہ سے وہ عوام الناس
میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔

۱۔ **مالی اصلاحات:**۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے وقت ملک کی اقتصادی حالت
بہت ہی خراب تھی۔ جس کی وجہ محمد تغلق کی بے جا مہمات تھیں۔ خزانہ خالی ہو گیا۔ سلطان
نے سب سے پہلے کسانوں کی تباہ حالی کی تلافی کی۔ اور حکومت کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے
لئے خواجہ حسام الدین جنید کو سارے ملک کا مالیاتی جائزہ لینے اور زرعی محصولات کا اندازہ مرتب
کرنے کے لئے مامور کیا۔ خواجہ صاحب نے چھ سال میں ملک کا دورہ کر کے محنت شاقہ سے اس
کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سالانہ لگان کا اندازہ پونے سات کروڑ تنکہ تھا۔ تاریخ فیروز شاہی میں
درج ہے کہ یہی لگان باوجود رعایا کے خوشحال ہونے کے وصول ہوتا رہا۔ کسی قسم کا اضافہ نہیں
کیا۔ زراعت کی ترقی کے لئے کنوئیں اور نہریں کھودی گئیں۔ سابقہ شرح لگان گھٹا کر پیداوار
کا پانچواں حصہ مقرر کی۔ افسران مال کو رعایا کے ساتھ اچھا اور نرم سلوک کرنے کو کہا گیا۔ سلطان
نے پوری تحقیقات کے بعد غیر شرعی محصولات معاف کر دئیے۔ اور ان محصولات کو برقرار
رکھا۔ جو شرعاً جائز ہے۔

اخراج:۔ زرعی پیداوار پر پیداوار کا پانچواں حصہ وصول کیا جاتا تھا۔

۲۔ **عشر**:۔ بعض کھیتوں کی آمدنی کا دسواں حصہ بطور محصول وصول ہوتا تھا۔ یہ محصول

Marfat.com

ان زمینوں پر تھا۔ جو علماء اور صوفیاء کو بطور امداد دی جاتی تھیں۔

۳- زکوٰۃ :- مسلمان رعایا پر اپنی آمدن کا ڈھائی فیصد حصہ بطور محصول ادا کرنا لازمی تھا۔ اس مد میں جو رقم بھی وصول ہوتی تھی۔ حکومت خیراتی کاموں پر صرف کرتی تھیں۔

۴- جزیہ :- یہ وہ محصول ہے۔ جو غیر مسلم رعایا سے ان کے مال۔ جان اور آبرو کی حفاظت کے لئے حکومت وصول کرتی تھی۔ یہ خیال ذہن نشین رہے کہ یہ ٹیکس بچوں۔ بوڑھوں۔ عورتوں۔ بیماروں۔ غلاموں اور دیوانوں سے وصول نہیں ہوتا تھا۔ اور فوجی خدمت پر مامور غیر مسلم رعایا بھی اس محصول سے مستثنیٰ تھی۔ برہمنوں کے احتجاج کی وجہ سے جزیہ کا بوجھ برہمنوں اور دوسری غیر مسلم رعایا پر بھی ہلکا ہو گیا۔

۵- سلطان نے کئی ایک غیر شرعی اور غیر اسلامی محصولات معاف کر دئیے۔ ان محصولات کا اطلاق شہری آبادی پر ہوتا تھا۔ مثلاً صناع۔ صابن ساز۔ تیل نکالنے والے۔ گل فروش اور ماہی فروش وغیرہ۔ ایسے تمام محصولات جو دیہاتوں کے ساتھ مختص تھے منسوخ کر دئیے۔ محصولات کی کمی کی وجہ سے دستکاروں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ رعایا خوشحال اور فارغ البال ہو گئی۔

۲- جاگیرداری نظام :- فیروز شاہ نے جاگیرداری نظام کو از سر نو جاری کیا۔ سلطان کی یہ پالیسی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ جاگیردار مزارعین کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دیتے تھے۔ کاشتکار تباہ حال اور جاگیردار مرفہ الحال ہو گئے۔

۳- ذرائع آبپاشی :- سلطان نے زراعت کی ترقی کے لئے پانچ نہریں کھدوائیں۔ جن میں نہر جمن غربی دریائے جمنا سے نکالی گئی۔ دوسری مشہور نہر ملتان کے علاقے کو سیراب کرتی تھی۔ نہروں سے صحرائی علاقے سرسبز ہو گئے۔ سال میں دو فصلیں کاشت ہونے لگیں۔ اجناس کی قیمتیں گر گئیں۔ سلطان نے آبپاشی کے لئے ۵۰ اکنوئیں اور تیس تالاب بنوائے۔

۴- عدل و انصاف :- معاملات عدل میں سلطان احکام شرع کی پابندی کرتا تھا۔ باقاعدہ طور پر محکمہ عدل اور انصاف قائم تھا۔ قاضی القضاہ کے عہدے قائم تھے۔ متعدد سنگین سزائیں معاف کر دیں۔ بادشاہ بے رحم دل تھا۔ بعض اوقات مجرموں کو کلی طور

Marfat.com

پر معاف کر دیتا تھا۔

۵۔ **فوج**:۔ سلطان نے نوے ہزار سواروں پر مشتمل ایک باقاعدہ فوج تیار کی۔ تنخواہ کے بجائے جاگیریں دی جاتی تھیں۔ غیر مستقل فوج کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے علاوہ دو لاکھ فوج جاگیرداروں کے پاس بھی ہوتی تھی۔ فوج کو تندرست گھوڑے رکھنے کا حکم تھا۔ وزیر دفاع کئی ایک عسکری بدعنوانیوں کو دور کیا۔ سپاہیوں کے ساتھ نرم سلوک کیا جاتا تھا۔ سپاہی فوج میں جب تک چاہے رہ سکتا تھا۔ سپاہیوں کی جگہ اُن کے لڑکے اور قریبی رشتہ دار متعین کئے جا سکتے تھے۔ اس طرح اچھے نتائج نہ نکلے۔ فوج میں نااہل آدمی اکٹھے ہو گئے۔

۶۔ **غلاموں کی پرورش**:۔ سلطان کے زمانے میں غلام عام تھے۔ چونکہ بادشاہ کو غلاموں کا بے حد شوق تھا۔ اس لئے گورنروں کو اچھے غلام بھیجنے کا حکم تھا۔ ایک لاکھ کے قریب غلام دربار میں اکٹھے ہو گئے۔ دربار میں انہیں تعلیم دی جاتی اور مختلف پیشے سکھائے جاتے تھے۔ سلطان کمزور طبع انسان تھا۔ اسکی وفات کے بعد غلاموں کی وجہ سے بہت سی شورشیں اور بغاوتیں ہوئیں۔ اس لئے غلام مفید ہونے کی بجائے نقصان رساں ثابت ہوئے۔

۷۔ **تعمیراتِ عامہ**:۔ سلطان کو تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ اس نے تعمیرات کی بحالی اور نگہداشت کے لئے محکمہ وزارت قائم کیا۔ جو نئی اور پرانی عمارتوں کی حفاظت کرتا تھا۔ دہلی کے گرد و پیش میں تیس پرانے باغوں کی مرمت کرائی۔ اور بارہ سو نئے باغات تعمیر کرائے۔ جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے تھی۔

مشہور مورخ برنی کا بیان ہے۔ کہ سلطان نے پچاس مساجد۔ تیس دارالعلوم ملحقہ بمساجد۔ بیس محل اور ایک سو کارواں سرائیں تعمیر کرائیں۔ ان کے علاوہ دو سو شہر۔ تیس حوض۔ ایک سو شفاخانے۔ ایک سو حمام۔ پانچ مقبرے۔ دس مینار۔ دس کنوئیں اور ایک سو پچاس پل بھی تعمیر کرائے۔

۸۔ **رعایا پروری**:۔ سلطان ایک متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ جسے رعایا کی بہبود کا بڑا خیال تھا۔ غریب لوگوں کو سینکڑوں قسم کی رعائتیں دیں۔ دیوانِ خیرات کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا۔ جو غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی کے انتظامات کرتا تھا۔ ایک دیوان استحقاق قائم کیا۔ جو نادار اور معذور لوگوں کو گذر اوقات کے لئے وظائف دیتا تھا۔ جمعہ کے روز سلطان

Marfat.com

غریب لوگوں کے ساتھ معہ اُن کے اہل و عیال کے ملاقات کرتا تھا۔ اُنہیں انعام و اکرام سے بہرہ اندوز کرتا۔ متعدد دارالشفاء قائم کئے جہاں بیماروں کا باقاعدہ علاج ہوتا تھا۔

۷۔ **علم پروری**:۔ سُلطان کو علم و ادب کی سرپرستی سے خاصا شغف تھا۔ اگرچہ بذات خود اتنا اچھا ادیب نہ تھا۔ لیکن علماء کا بڑا قدر دان تھا۔ طلباء کو وظائف دیتا تھا۔ اپنی سرپرستی میں کم و بیش پچاس مدرسے جاری کئے۔ جن میں سے فیروز آباد کا مدرسہ بہت مشہور تھا سُلطان کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ اپنی سوانح حیات و فتوحات فیروز شاہی کے نام سے تحریر کی۔ ضیاء الدین برنی اور سراج عفیف دو مشہور مؤرخین نے اسی کے سایہ محافظت میں تاریخ فیروز شاہی لکھی۔ دینیات اور علم فقہ سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔

۸۔ **مذہبی پالیسی**۔ سلطان قوانین شرع کا سختی سے پابند تھا۔ علماء کا بڑا احترام کرتا تھا۔ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی وجہ سے مشائخ کا بڑا قدر دان تھا۔ اپنے زمانے کے بزرگ مخدوم جہانیاں سے بڑے اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ ہر مہم پر روانہ ہونے سے پہلے مزارات مقدسہ پر حاضر ہوتا تھا

۹۔ **کردار اور شخصیت**:۔ سلطان کے کامیاب یا ناکام انسان کے بارے میں مختلف مؤرخین کی آراء ملاحظہ ہوں:۔

(۱) برنی اور سراج عفیف۔ ہر دو مؤرخین کی رائے ہے کہ سلطان فیروز شاہ ناصر الدین محمود بن التمش کے بعد ایک انصاف پرور۔ نیک دل اور منتقی حکمران تھا۔

(۲) سرہنری ایلیٹ۔ الفنسٹن۔ وہ عہد سلاطین کا اکبر تھا۔

(۳) سرولزلے ہیگ۔ اکبر اعظم کے زمانے سے پہلے فیروز شاہ کا دورِ حکومت برصغیر میں اسلامی سلطنت کے لیے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔

(۴) سری واستوا۔ سلطان اپنے قول و فعل میں دیانت دار تھا۔ وہ حقیقتہً عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی کا خواہشمند تھا۔ اس سے پہلے کسی بادشاہ نے اپنی رعایا کے لیے اتنی بہبودی کا کام نہیں کیا۔ اِس نے صنعت و حرفت کے فروغ کے لیئے ہر وہ اقدام کیا۔ جو اس زمانے میں ممکن تھا۔

Marfat.com

۵۔ ڈاکٹر تریپاٹھی ۔ فیروز شاہ ایک شاہی فرمانروا تھا۔ جس کے دور کے بارے میں قدیم و جدید دور کے تاریخ دانوں نے اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔

سلطان فیروز شاہ نہایت نیک دل ۔ نرم مزاج اور رعایا پرور انصاف پسند حکمران تھا۔ ہر معاملے میں سلطان نے عوام کی آسائش کا خیال رکھا۔ گو اس کے کردار میں چند ایک کمزوریاں بھی ہیں۔ لیکن کون ہے جسے سب اچھا کہتے ہیں۔ خوبیوں کی کثرت چند ایک خامیوں پر ہمیشہ غالب ہوتی ہے۔ سلطان مذہبی آدمی تھا۔ شرع کے قوانین کو اولیت دیتا تھا۔ اس نے اشاعت اسلام کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمان ہونے والے ہندوؤں کا جزیہ معاف کرنے سے بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ علماء اور مشائخ کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ غیر شرعی باتوں کو حکماً ممنوع قرار دیا۔

عوام کی فلاح و بہبود ۔ تعلیم و تربیت کی ترویج کے لئے تا حد امکان کوشش کی۔ مساجد۔ مقابر اور مدارس تعمیر کئے۔ رعایا خوش حال تھی۔ سراج عفیف کی رائے ہے کہ سلطان کے زمانہ اقتدار میں ضروریات زندگی کی فراوانی تھی۔ اس کے چالیس سالہ دور میں لوگوں نے کسی چیز کی قلت محسوس نہیں کی۔ ان حالات کے پیش نظر ہم سلطان کو ایک کامیاب حکمران خیال کرتے ہیں۔

س ۶: ۔ ہندوستان پر تیمور کے حملے کی تفصیل بتائیے۔ اس کے اثرات بیان کیجئے۔

ج۔ **امیر تیمور کا حملہ**:۔ امیر تیمور المعروف بہ تمر لنگ چغتائی ترک تھا۔ اس کا باپ امیر ترغی برلاس چغتائی ترکوں کا سردار تھا۔ امیر تیمور ۱۳۳۶ء میں ماوراء النہر میں سمرقند کے نزدیک کیش کے مقام پر پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی وفات پر تینتیس ۳۳ برس کی عمر میں سمرقند کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

وہ ایک دلیر اور نڈر سالار تھا۔ اور خدا داد عسکری صلاحیتوں کا مالک تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے قبیلے کے متفرق لوگوں کو اکٹھا کیا۔ پھر ترکستان کے تمام قبائل کو ایک پرچم کے نیچے جمع کر کے ایران اور عراق کو فتح کیا۔ بعد ازاں ایشیائے کوچک میں عثمانی ترکوں کو شکست دی۔ افغانستان اور روس کے بھی بعض حصے فتح کر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

Marfat.com

ہندوستان پر حملے کے اسباب:۔

۱۔ وہ مہمات اور فتوحات کا بڑا دلدادہ تھا۔

۲۔ ایران۔ عراق۔ ایشیائے کوچک۔ افغانستان اور روس کے بعض حصوں کو فتح کرنے کی وجہ سے اس کے عسکری حوصلے بلند ہو گئے۔

۳۔ سلطنت دہلی کے سیاسی انتشار اور برصغیر کی بے شمار دولت بھی وجہ کشش تھی۔ کہ ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔

۴۔ ملک گیری کی فطری خواہش کے ساتھ ساتھ مذہبی جذبہ بھی کارفرما تھا۔ چنانچہ حملہ کرنے سے پیشتر اس نے علماء کی ایک مجلس مشاورت قائم کی۔ ان سے صلاح مشورہ کیا۔ کہ فوج کشی سے میرا مطلب کفار کو تباہ کرنا ہے۔ اور دین اسلام کو پھیلانا ہے۔ مجلس نے اس رائے کو پسند کیا۔

امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں اپنے پوتے پیر محمد خان ہراول کے طور پر روانہ کیا۔ جس نے دریائے سندھ عبور کرکے آغاز میں ہی اوچ اور ملتان پر قبضہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر امیر تیمور نے خود ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور ۱۳۹۸ء میں ایک بھاری لشکر لے کر سمرقند سے روانہ ہوا۔ اور ستمبر ۱۳۹۸ء میں دریائے سندھ۔ جہلم۔ چناب اور راوی عبور کرکے لاہور تک آ پہنچا۔ لاہور کے حاکم نے راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اسے شکست دے کر اکتوبر ۱۳۹۸ء میں ملتان سے پچھتر میل دُور شمالی مشرق میں تلمبہ پر حملہ کیا۔ جسرت کھوکھر کو گرفتار کر لیا۔ دو لاکھ روپے بطور تاوان وصول کرکے رہا کر دیا۔ اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ دیپال پور سے ہوتا ہوا پاک پتن پہنچا۔ آگے بڑھ کر بھٹنیر کے مضبوط قلعے پر قبضہ کیا۔ بعد ازاں سرستی۔ پانی پت سے ہوتا ہوا ان علاقوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے دہلی جا پہنچا۔

امیر تیمور کی آمد پر ناصر الدین محمود تغلق اپنے وزیر ملو اقبال کی جمعیت میں چالیس ہزار سپاہ دس ہزار سوار اور ایک سو بیس جنگی ہاتھیوں کے ساتھ مقابلے کے لئے نکلا۔ چونکہ شاہی لشکر میں کوئی قابل سالار نہ تھا۔ ناصر الدین محمود کو شکست ہوئی اور وہ جان بچا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ ملو اقبال بھی بلند شہر میں پناہ گزین ہوا۔

Marfat.com

امیر تیمور ۱۸ دسمبر ۱۳۹۸ء کو امیر تیمور دہلی میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوا۔ دوسرے دن ایک دربار عام منعقد ہوا۔ جس میں شہر دہلی کے امراء۔ علماء اور مشائخ بھی حاضر تھے۔ جنکی درخواست پر بھاری تاوان جنگ وصول کر کے خوں ریزی بند کر دی۔ امیر تیمور کے لشکر اہل شہر سے تاوان کی رقم اور سامان رسد حاصل کر رہے تھے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر تنازعہ ہو گیا۔ اور چند تیموری سپاہی مارے گئے۔ اس پر غضبناک ہو کر امیر تیمور نے قتل عام کا حکم دیا۔ پانچ روز تک دہلی میں قتل عام جاری رہا۔ شہر ویران ہو گیا۔ ہزاروں بے گناہ لوگ مارے گئے۔ بے شمار بچے اور عورتیں غلام اور لونڈیاں بنالی گئیں۔

امیر تیمور پندرہ دن تک دہلی میں رہا۔ وہ برصغیر میں مستقل سلطنت کا خواہشمند نہ تھا۔ ۱۹ جنوری ۱۳۹۹ء کو میرٹھ پر حملہ کیا۔ وہاں کے حاکم الیاس خان اور مولانا احمد تھانیسری نے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ تیمور نے شہر کو تاراج کیا۔ اور آبادی کو تہ تیغ کیا۔ بعد ازاں ہردوار پہنچکر ہندوؤں کو شکست دی۔ ہردوار سے نکل کر تیمور نے ریاست سرمور پر حملہ کیا۔ رائے مہروز کو شکست دی۔ یہاں سے بے شمار مال غنیمت حاصل کیا۔ کوہ شوالک کی ہندو کمین گاہوں تک جا پہنچا۔ ہندو بغیر لڑائی کئے بھاگ گئے۔ ۱۳۹۹ء فروری ۱۳۹۹ء جموں پر حملہ کیا۔ راجہ شکست کھا کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ ۱۹ مارچ کو امیر تیمور لاہور۔ ملتان اور دیپالپور کو سید خضر خان کے سپرد کر کے کابل سے ہوتا ہوا سمرقند واپس چلا گیا۔

امیر تیمور کے حملے کے اثرات : گو تیمور آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح واپس چلا گیا۔ لیکن اس کے حملے کے اثرات دُور رس ثابت ہوئے۔

۱۔ امیر تیمور ہندوستان میں تھوڑی مدت رہا۔ اور بہت تھوڑا علاقہ بھی فتح کیا۔ اس نے پنجاب اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس علاقے کی دولت سمیٹ کر لے گیا۔ ان علاقوں کے لاکھوں انسان مارے گئے یا قیدی بنا لئے گئے۔

۲۔ دہلی کی مرکزی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر ایک صوبہ خود مختار ہو گیا۔ تغلق خاندان کا رہا سہا وقار ختم ہو گیا۔

Marfat.com

۳۔ تیمور کے چلے جانے کے بعد ملک قحط کی لپیٹ میں آگیا۔

۴۔ دہلی کا شہر تباہ و دیران ہوگیا۔ تیمور اپنے ساتھ کاریگروں اور صناعوں کی ایک بھاری تعداد لے گیا کیونکہ اسے دہلی کی عمارتیں بہت پسند آئی تھیں۔ اس طرح برصغیر کی دضاحت اور فن تعمیر پر نمایاں اثر پڑا۔

۵۔ خضر خان کو امیر تیمور نے لاہور، ملتان اور دیپالپور کا حاکم بنایا تھا۔ اس نے بعدازاں دہلی پر قبضہ کر کے خاندان سادات کی بنیاد ڈالی۔

س ۱۹:۔ سابراہیم لودھی کی پالیسی اور مقاصد بتائیے۔ اور یہ بھی بیان کیجئے کہ وہ ناکام کیوں رہا؟

جواب ۔ سلطان ابراہیم لودھی بہلول لودھی کے خاندان سے تھا۔ جس کے متعلق Muslim rule under the Salatin میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

قدیم وقت سے افغان کوہ سلیمان سے وادی سندھ کے میدانوں میں روزگار اور تجارت کی تلاش میں آتے رہے ہیں۔ بہلول کا جدامجد بہرام فیروز شاہ تغلق کے عہد کے آغاز میں ملتان آیا۔ جہاں اس نے ملک مردان درانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ بہرام کے بیٹے اسلام خان لودھی نے خضر خان گورنر ملتان کی ملازمت کے دوران بہادری کے کارنامے دکھا کر اپنے آپ کو ممتاز حیثیت کا مالک بنایا۔ جس کے بدلے اسے سرہند کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ اقدام لودھیوں کے عروج کے لئے سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ (ایم۔ کبیر)

ابراہیم لودھی سلطان سکندر لودھی کا بڑا لڑکا تھا۔ جو اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور یہ خاندان لودھی کا آخری بادشاہ تھا۔ بعض دربار کے امراء نے اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر سلطنت کو دو بھائیوں میں بانٹ دینا چاہا۔ ان کا خیال تھا کہ دہلی ابراہیم لودھی کی تلمرو میں شامل رہے۔ اور جون پور شہزادہ جلال خان برسر اقتدار رہے۔ لیکن خان جہان لودھی نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اور سلطنت کی وحدت برقرار رکھنے پر زور دیا۔ امراء کو لعن طعن کیا۔ شہزادہ جلال کو دہلی آنے کے لئے کہا۔ اس تجویز میں کامیابی کے آثار نہ دیکھتے ہوئے ابراہیم لودھی نے مشرقی صوبوں کے امراء کو احکام بھیجے۔ اور شہزادہ کے احکام کی تعمیل سے روکا۔ سلطان ابراہیم کے اس حکم کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

Marfat.com

امراء شہزادہ جلال کے مخالف ہو گئے۔ وہ مجبوراً جون پور چھوڑ کر اپنی جاگیر کالپی میں چلا گیا۔

کالپی پہنچتے ہی شہزادے نے سلطان جلال الدین کا لقب اختیار کر کے سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔ فوج کو منظم کر کے ارد گرد راجاؤں کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ اپنی طاقت مزید مستحکم کرتے ہوئے مرکز کو تسخیر کرنے کی ٹھانی۔ جب سلطان ابراہیم نے ان حالات کو دیکھا۔ تو اپنے بھائیوں کو قلعہ ہانسی میں قید کر دیا۔ اور ایک بھاری فوج لے کر قنوج پہنچا۔ جب اعظم ہمایوں نے جو کہ شہزادہ جلال کا معاون و مددگار تھا۔ سلطان کی فوج دیکھی۔ تو شہزادے کا ساتھ چھوڑ کر سلطان ابراہیم کے ساتھ آملا۔ دریں اثنا سلطان نے کالپی کو فتح کر لیا۔ شہزادہ جلال نے آگرہ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ راجہ گوالیار کے پاس پناہ لی۔ شاہی فوجوں کو گوالیار میں داخل ہوتے دیکھ کر مالوہ چلا گیا۔ مالدہ سے کٹرہ آیا۔ مگر گونڈ کے زمینداروں نے اسے پکڑ کر سلطان کے پیش کر دیا۔ سلطان نے اُسے قتل کرا دیا۔

سلطان کی پالیسی:۔ سلطان کی دلی خواہش تھی کہ تمام امراء اس کے مطیع فرمان ہو جائیں۔ مگر سلطان میں اپنے اسلاف کی عادات موجود نہ تھیں۔ سلطان موقع شناس نہیں تھا۔ فطری طور پر ضدی اور درشتگی واقع ہوا تھا۔ امراء سے بڑی سخت ردی اور درشتی سے پیش آتا تھا۔ اس لئے امراء میں بددلی اور بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔

سلطان نے اعظم ہمایوں اور اس لڑکے فتح خان کو گوالیار کی مہم سے واپس بلا کر محض غلط فہمی کی بنا پر قید کر دیا جس کی وجہ سے دوسرے امراء بددل اور ہراساں ہو گئے۔

اعظم ہمایوں کے دوسرے لڑکے اسلام خان نے کٹرہ میں بغاوت کر دی۔ اور اپنے باپ کی فوجوں کی مدد سے کٹرہ کے گورنر احمد خان کو شکست دی۔ اسی دوران میں اعظم ہمایوں اور سعید خان لودھی آگرے سے فرار ہو کر لکھنو پہنچ گئے اور سلطان کے شورش اور بغاوت کر دی۔ ان حالات کے پیش نظر قنوج اور جون پور کے علاقے میں بغاوت کی لپیٹ میں آ گئے۔

Marfat.com

سلطان نے امراء کی قیادت میں ایک بھاری فوج اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے قنوج روانہ کی۔ مگر باغی امراء کی تھوڑی سی فوج نے سلطان کی فوجوں کو شکست دی۔ سلطان نے اپنی فوج کو کمک بھی بھیجی۔ مگر پھر بھی شاہی فوجوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ گو شاہی فوجوں نے بغاوت فرو کرنے کی بارہا کوشش کی۔ لیکن باغیوں کے دل صاف نہ ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ دریا خان لوہانی کے لڑکے بہادر خان لوہانی نے بہار میں خود مختاری کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اور سلطان محمد لوہانی کا لقب اختیار کیا۔ سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔

باغی امراء میں نصیر خان جیسا مقتدر شخص بھی شامل تھا۔ عوام سلطان ابراہیم لودھی سے بدظن ہو گئے۔ اور سلطان محمد لوہانی سے مل گئے۔ مشرقی صوبوں کی بغاوتیں اور امراء کا سلطان کے خلاف ہو جانا صرف سلطان کی غلط پالیسی کا نتیجہ تھا۔ شاہی فوجیں لوہانی کی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ چنانچہ سلطنت دہلی سے تعلقات منقطع ہو گئے۔

مشرقی صوبہ داروں کی بغاوت اور مرکز سے کٹ جانے سے بھی سلطان ابراہیم لودھی کی تند مزاجی میں فرق نہ آیا۔ پنجاب کے حاکم دولت خان کو دہلی بلایا۔ دولت خان نے اپنا لڑکا دلاور خان دربار شاہی میں حاضری دینے کے لئے روانہ کیا۔ سلطان دلاور خاں سے بڑی سختی اور تندی سے پیش آیا۔ وہ بھاگ کر اپنے باپ کے پاس پنجاب چلا آیا۔ اور بتایا تو دولت خان کے تعلقات بگڑ گئے۔ دولت خان لودھی نے ہراساں ہو کر کابل کے بادشاہ کو تمام حالات سے واقفیت دیتے ہوئے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ یہ سب کچھ سلطان کی سخت مزاجی اور تندی کا نتیجہ تھا۔

سلطان اپنی افتاد طبع کی وجہ سے مرکز میں مضبوط سلطنت قائم نہ کر سکا۔ مرکز پر مرکز رجحانات نے غلبہ حاصل کر لیا۔ ہر طرف بغاوت ہی بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جس کے نتیجے میں سلطان کے ملک پر حملہ کرنے کے لئے ظہیر الدین بابر نے فوج کشی کر دی۔ باغی امراء کا خیال تھا کہ بابر تیمور کی طرح آئے گا۔ لوٹ مار کر کے بگولے کی طرح واپس چلا جائے گا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست فاش دے کر دہلی میں سلطنت مغلیہ کی مستحکم بنیاد رکھی۔ سلطنت مغلیہ کسی نہ کسی

Marfat.com

شکل میں ۱۷۵۷ء تک ہندوستان میں قائم رہی۔ غلط پالیسی کی وجہ سے لودھیوں کا ہندوستان کی سلطنت سے واسطہ ختم ہوگیا۔

س ۹:۔ دیوان عرض کی تفصیل اور سلاطین دہلی کے فوجی نظام پر روشنی ڈالیئے۔

جواب ۔ دیوان عرض۔ دیوان عرض محکمہ دفاع کا دوسرا نام تھا۔ اس محکمہ کے افسر اعلیٰ کو عارض ممالک کہتے تھے۔ اس کے فرائض مندرجہ ذیل تھے:۔

۱۔ فوج میں سپاہیوں کو بھرتی کرنا اور ان کی تنخواہ کا تعین کرنا۔

۲۔ افواج کے لئے اسلحہ۔ رسد کا انتظام کرنا۔ فوجی گھوڑوں کی جانچ پڑتال کرنا۔

۳۔ فوج کو لڑائی کے لئے تیار کرنا اور سپاہ میں تنخواہ تقسیم کرنا۔

۴۔ عارض ممالک کا ایک نائب بھی ہوتا تھا۔ جسے نائب عارض ممالک کہتے تھے۔

۵۔ عارض ممالک پوری فوج کا سال میں ایک بار مکمل معائنہ کرتا تھا۔

۶۔ سپاہیوں اور گھوڑوں کے پتے اور حلیے درج کرانے کا بھی ذمہ دار تھا۔

۷۔ جنگ کے دوران میں رسد اور حرب کے سامان کو اکٹھا کرنا۔ اور میدان جنگ تک پہنچانے کا انتظام کرنا۔

۸۔ عارض ممالک کو دیوان عرض سے متعلقہ تمام حسابات دیوانی وزارت میں پیش کرنے ہوتے تھے۔

دیوان عرض کے علاوہ دیوانی رسالت۔ دیوانی قضا۔ دیوان انشاء اور دیوان برید بھی بڑی اہمیت کے محکمے تھے۔

(۲) فوجی نظام:۔

کسی بھی سلطنت کے استحکام کا براہ راست تعلق فوج سے ہوتا ہے۔ سلطنت دہلی بھی اس ضمن میں فوجی نظام کو خاص اہمیت دیتی تھی۔ کیونکہ برصغیر پر ہر وقت بیرونی حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔ اور ملک کے اندر بھی کئی عناصر حکومت کے خلاف مصروف پیکار رہتے تھے۔ آبادی کا زیادہ حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو دل سے حاکم تسلیم نہ کیا تھا۔ اور انہیں غاصب سمجھتے تھے۔ صرف قوت کے ڈر سے اطاعت گذار بنے رہتے تھے جب

Marfat.com

کبھی بھی موقع ملتا۔ بغاوت کھڑی کر دیتے تھے۔ بغاوتوں کے علاوہ ان سے جائز محصولات بھی حاصل کرنے کے لئے طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ سلاطین اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کا بھی خیال رکھتے تھے اس لئے سلاطین دہلی نے فوجی نظام پر خاص توجہ دی۔

آئینی اعتبار سے سلطان ہی فوج کا سپہ سالار تھا۔ جو عسکری مہارت کی بناء پر ایک تجربہ کار جرنیل ہوتا تھا۔ فوجی امور میں سلطان کا معاون اور مشیر نائب الملک ہوا کرتا تھا۔ محکمہ دفاع کے افسر اعلیٰ کو عارض ممالک کہتے تھے۔ اس کے فرائض میں درج ذیل امور شامل تھے:۔

۱۔ محکمہ دفاع کی تنظیم۔ فوج کی بھرتی۔ اور فوجی تربیت بھی شامل تھی۔

۲۔ وقتاً فوقتاً فوج کا معائنہ کرتا تھا۔ اور دیوان عرض میں ہر سپاہی کا پتہ اور حلیہ درج ہوتا تھا۔

۳۔ سلطان علاء الدین خلجی نے فوجی گھوڑوں کو داغ دینے کا طریقہ رائج کیا تھا۔ تاکہ گھوڑوں کو تبدیل نہ کیا جا سکے۔ فیروز شاہ نے ترک کر دیا۔ لیکن سکندر لودھی کے زمانے میں دوبارہ رائج ہوا۔

سلاطینِ دہلی کا دستور تھا کہ ملک کے اندر کا امن وامان بحال رکھنے اور بغاوتوں کے فرو کرنے کے لئے اپنی فوجوں کو اہم مقامات پر متعین رکھتے تھے۔ منگولوں اور بیرونی حملوں کی روک تھام کے لئے مختلف سرحدی چوکیوں اور قلعوں میں خصوصی فوج متعین کی جاتی تھی۔ جہاں سامانِ حرب اور رسد کا معقول انتظام ہوتا تھا۔ افواج کی چار قسمیں ہوتی تھیں:۔

۱۔ مستقل مرکزی فوج جو دارالسلطنت میں براہِ راست بادشاہ کی نگرانی میں ہوتی تھی۔

۲۔ مستقل صوبائی فوج۔ جو صوبوں کے گورنروں اور امراء کے زیرِ اثر ہوتی تھی۔

۳۔ نئی فوج جو بھرتی کی جاتی تھی۔ اسکی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

۴۔ مجاہدین۔ جو حصولِ ثواب اور جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔

فوج کے مرکزی حصے کو چشم قلب کہتے تھے۔ اس میں سوار، پیادہ۔ شاہی محافظ دستے (خاصہ خیلی) اور امراء کے دستے بھی شامل ہوتے تھے۔ ویاں مرکز کے علاوہ مختلف اطراف اور

Marfat.com

صوبوں میں متعین فوج کو حشم اطراف کہتے تھے۔
سلاطین دہلی کا دستور تھا۔ کہ ملک کے اہم مقامات پر تربیت یافتہ فوج رکھتے تھے اور وہاں رسد کا کافی سے زیادہ سامان ہر وقت موجود رہتا تھا۔ سلطان بلبن نے منگولوں کے حملوں کے انسداد کے لئے شمالی مغربی سرحد سے لے کر دہلی تک جا بجا مضبوط قلعے تعمیر کرائے۔ جنہیں مرمت کے بعد سلطان علاؤالدین خلجی نے دوبارہ مستحکم کیا۔ فوج بر ترتیب ذیل منقسم مختلف حصوں میں تھی۔

۱۔ سوار :۔ سلطنت دہلی کی اہم ترین فوج اور مؤثر فوج سواروں پر مشتمل تھی۔ جو آجکل رسالہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں فوج کا مضبوط ترین شعبہ سوار فوج ہی ہوتی۔ اور جنگی قوت کا اندازہ اسی شعبے سے لگایا جاتا تھا۔ بعض سواروں اور ان کے گھوڑے زرہ بکتر سے آراستہ ہوتے تھے۔ ہر سوار کے پاس دو تلواریں۔ ایک خنجر ایک ترکی کمان اور ترکش ہوتا تھا۔ رسالہ ایک اسپہ، دو اسپہ، سہ اسپہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اعلیٰ نسل کے گھوڑے مہیا کرنے کے لئے کئی شاہی اصطبل (پائیگاہ) قائم تھے۔ جس میں عرب، ترکستان اور روس کے اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالے جاتے تھے۔

۲۔ پیادہ فوج :۔ سوار فوج کے بعد پیادہ فوج تھی۔ اس کے سپاہیوں کو پائیک کہا جاتا تھا۔ اُن میں تیر انداز بھی ہوتے تھے۔ جنہیں دھانک کہتے تھے۔ پیادہ فوج میں عام طور پر ہندو، غلام اور ادنیٰ طبقوں کے لوگ ہوتے تھے۔ جنہیں اعلیٰ نسل کے گھوڑے رکھنے کی طاقت نہ ہوتی تھی، شاہی محافظ شاہی محلات کی حفاظت کرتے تھے۔ پہرہ دار اور چوکیدار پائیک فوج سے لئے جاتے تھے۔ یہ فوج اندرون ملک سازشوں کو دبانے میں بڑی مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

۳۔ ہاتھی۔ پرانے زمانے میں ہاتھی جنگ میں استعمال ہوتے تھے۔ اسکندر اور پورس کی لڑائی میں پورس کا ہاتھی بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے۔ یہ آجکل کے ٹینکوں کے مشابہ ہوتے تھے۔ اس لئے ہاتھیوں کی غور پرداخت پر خاص کوشش ہوتی تھی۔ ہاتھیوں پر مسلح سپاہی بیٹھ جاتے تھے۔ پیادہ اور رسالہ کے لئے ہیجام اجل ہوتے تھے۔ سلطان بلبن

Marfat.com

کے نزدیک ہاتھی کی بڑی اہمیت تھی۔ اس کے نزدیک ایک ہاتھی پانچ سو سپاہیوں کے برابر ہوتا تھا۔ ان کی سونڈوں اور لمبے دانتوں پر درانتیاں باندھ دی جاتی تھیں جن سے وہ ہر طرف تباہی اور بربادی کا سماں باندھ دیتے تھے۔ سلطان محمد تغلق کی فوج میں تین ہزار ہاتھی تھے۔

بنگال پر حملہ کرتے وقت فیروز تغلق کے ساتھ چار سو ستر ہاتھی تھے۔ شاہی ہاتھیوں کا نگراں افسر شحنہ فیل کہلاتا تھا۔ سلطان کی مرضی کے بغیر کوئی آدمی ہاتھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

فوج میں آتشیں اسلحہ (نفت) بھی ہوتا تھا۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں ابتدائی قسم ہلکی توپیں بھی ایجاد ہو چکی تھیں لیکن سلاطین دہلی نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

دشمنوں کے قلعوں کو توڑنے کے لئے منجنیق اور عرادے ہوتے تھے۔

دریاؤں کو عبور کرنے کے لیئے دریاؤں پر کشتیوں کے پل بنائے جاتے تھے۔

دشمنوں کی خبر گیری کے لیے خبر رساں بھی موجود ہوتے تھے۔

طبی امداد اور بینڈ باجے کا بھی خاطر خواہ انتظام ہوتا تھا۔

فوج کے ساتھ بڑے بڑے عسکری نشانات ہاتھیوں پر رکھے ہوئے ہوتے تھے۔

فوج کا جلوس نکلتا۔ تو دائیں طرف عباسی خلیفے کا جھنڈا (سیاہ رنگ) اور بائیں طرف سلاطین دہلی کا جھنڈا ہوتا تھا۔

فوج کی باقاعدہ مخصوص وردی ہوتی تھی۔ فوج میں اعشاری نظام رائج تھا۔

دس سپاہیوں پر ایک سرخیل۔ دس سرخیل پہ ایک سالار دس سالاروں پہ ایک امیر اور دس امیروں پر ایک خان ہوتا تھا۔ سپہ سالار تمام فوج کا افسر اعلیٰ خیال کیا جاتا تھا۔

افواج کو تنخواہ دی جاتی تھی۔ التمش کے زمانے میں نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔ اقطاع یعنی چھوٹی چھوٹی جاگیریں گھوڑے پالنے کے لئے دی جاتی تھیں۔ علاؤالدین خلجی نے ساری فوج کو مرکز سے تنخواہ دی۔ ایک سوار کو دو سو چونتیس تنکہ سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔

مستقل مرکزی فوج کو حشمی اور غیر حشمی کہتے تھے۔

الغرض آج سے پانچ چھ سو سال پہلے اس وقت کی تہذیب اور تمدن کے مطابق فوجوں کا

Marfat.com

اچھا انتظام تھا۔ تنگ نظر ہندو تاریخ نویسوں کو مسلمان بادشاہوں میں سوائے خامی اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر جبری طور پر اسلام پھیلایا جاتا۔ اندازہ لگائیے محمود غزنوی کے نسبی عہد سے لے کر اورنگ زیب کے زمانے تک کی کامیاب حکومت میں کوئی غیر مسلم نظر آتا۔ سچ ہے چمگادڑ ہمیشہ سورج کو ہی بدنام کرتی ہے۔

س نا۔ مندرجہ ذیل میں کسی تین پر مختصر نوٹ لکھیئے؟

(۱) غلاماں چہل گانی ۔ (۲) رضیہ سلطانہ (۳) سیدی مولا (۴) ملک کافور

جواب:۔ (۱) غلامان چہلگانی:۔ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں چالیس آدمیوں نے کافی سے زیادہ زور پکڑ لیا۔ ان کو غلامان چہل گانی کہتے ہیں، یہ سلطنت کے مختلف عہدوں پر متمکن تھے۔ ترکی النسل تھے، معمولی غلاموں سے ترقی کرتے ہوئے امارت کے درجے تک جا پہنچے۔ یہ بڑے جاہ پسند تھے۔ ذاتی اجارہ داری اور اقتدار اعلیٰ کے خواہاں تھے۔ ان کی ہر وقت کی خواہش تھی۔ کہ حاکم وقت اُن کے زیر اثر رہے۔ آغاز کار میں سلطانہ رضیہ کے تابع فرمان اور وفادار تھے۔ بعد ازاں انہوں نے بغاوت کر دی۔ ملکی امن و امان کو تباہ و برباد کر دیا۔

(۲) سلطانہ رضیہ:۔ سلطانہ رضیہ کے بارے میں اسکے باپ التمش کی رائے ملاحظہ کریں۔

"میرے بیٹے جوانی کے نشے میں مخمور۔ عیش و نشاط کے رسیا ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ جس میں امور سلطنت بطور احسن پورا کرنے کی اہلیت ہو۔ میرے مرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ میری اولاد میں سے میری لڑکی رضیہ سے زیادہ کوئی بھی منصب جہاں بانی کے لئے موزوں نہیں"۔ (التمش)

سلطانہ رضیہ التمش کی بڑی لڑکی تھی۔ وہ پہلی خاتون ہے جس نے تاج شاہی زیب سر کیا۔ وہ ۱۲۳۶ء میں اہلیان دہلی کی مدد سے تخت نشین ہوئی۔ اس نے سلطان جلال الدین کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشینی کی رسم میں اہل دربار اور تخت شاہی میں ایک پردہ حائل تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح بڑی عقلمند اور دور اندیش تھی۔ وہ شکل و صورت میں اپنے باپ کے مشابہ تھی۔ مضبوط قوت ارادی کی مالک تھی۔ عورت ہونے کے باوجود اس نے شاہی جاہ و جلال کو برقرار رکھا۔ آغاز کار میں اس نے پردے میں بیٹھ کر امور سلطنت سرانجام دیئے۔ ... ی اور انتظامی امور بطور احسن سرانجام دیا۔ بعد

Marfat.com

ازاں اس نے پردے کے ساتھ نسوانی لباس پہننا بند کر دیا۔ مردانہ لباس پہن کر دربار منعقد کرتی تھی۔ ہاتھی پر بیٹھ کر بے نقاب بازاروں میں نکلتی تھی۔ میدان جنگ میں مردانہ لباس میں فوجوں کی قیادت کرتی تھی۔

طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج لکھتا ہے۔

رضیہ ایک عاقل۔ عادل۔ کریم النفس۔ علم پرور۔ عدل گستر۔ رعیت پرور اور عسکری ذہانت کی حامل حکمران تھی۔ وہ ایک کامیاب اور لائق حکمران کی صلاحیتوں سے کما حقہٗ مزین تھی۔ لیکن ان تمام صلاحیتوں سے اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

امراء اور قدامت پسند عوام نے رضیہ سلطانہ کے عورت ہونے کیوجہ سے اسکی مخالفت کرنا شروع کی بے پردگی اور مردانہ لباس نے جلتی پر آگ کا کام کیا۔ راجپوتوں نے ہر طرف بغاوت کردی رنتھمبور اور گوالیار کے قلعے سلطنت دہلی کی سیادت سے آزاد ہوگئے۔ ان پُرآشوب حالات میں سلطانہ رضیہ نے اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ باغیوں کی گوشمالی کرکے امن وامان بحال کیا۔ سندھ اور بنگال کے حکام کو اپنا اطاعت گزار بنایا۔ اپنے نام کا سکہ جاری کیا تین سال تک تخت دہلی پر متمکن رہی۔

رضیہ سلطانہ نے اپنی خداداد فراست سے قرامطہ کی فتنہ آرائی کا سدباب ۱۲۳۷ء میں کیا۔

بعد ازاں امراء چہلگانی کی بغاوت کو کچل دیا۔

رضیہ بہت ہی فہم وفراست کی مالک تھی۔ وہ دوسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے ترکوں کا زور توڑنے کے لئے ایک غیر ترک کو امیر آخور کا منصب دیا۔ یہ اس کے فہم وتدبر کی بہترین مثال ہے۔

التونیہ حاکم بٹھنڈہ نے سلطانہ رضیہ سے ۱۲۴۰ء میں شادی کرلی۔ دونوں نے مل کر ایک بار پھر تخت یابی کے لئے سرتوڑ کوشش کی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۲۴۰ء کو ہندو ڈاکوؤں نے دونوں کو قتل کر ڈالا۔ سلطانہ کا مقبرہ دہلی میں ترکمان دروازہ کے احاطہ میں ہے۔ اس کی حکومت کی مدت ۳ سال ۶ ماہ اور ۶ دن ہے۔

۳۔ سیدی مولا:۔ سیدی مولےٰ ایران کے علاقہ جرجان کا رہنے والا تھا۔ اس نے برصغیر میں وارد ہوکر اجودھن (پاک پتن) شیخ فریدالدین گنج شکر کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ انہے

Marfat.com

روحانی فیض حاصل کر کے جانب دہلی روانہ ہوا۔ دہلی میں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ جہاں امراء کے علاوہ عوام کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی۔ ذریعہ معاش نہ ہونے کے باوجود اس کا دستر خوان بڑا وسیع تھا۔ لوگوں سے کوئی نذرانہ وصول پیش کرتا تھا۔ لیکن کھانا پینا شاہانہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت اسے رقم اپنے بورئیے کے نیچے سے مل جاتی تھی۔ اس نے ہاں کوئی خادم نہ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر قاضی جلال الدین کاشانی بھی اس کے معتقدین میں شامل ہو گیا۔ بلبن کے بیٹے جن کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اس کے مرید بن گئے۔ اس طرح اس کے مریدوں کی تعداد دس ہزار کے قریب ہو گئی تھی۔ قاضی جلال الدین نے سلطان فیروز خلجی کو قتل کرا کر سیدی مولے کو تخت نشین کرانے کا منصوبہ بنایا۔ سلطان اس سازش کا پتہ لگانے کے لئے بھیس بدل کر خود سیدی مولے کی طرف روانہ ہوا۔ چنانچہ سیدی مولے اور اس کے مرید گرفتار ہو کر سلطان کے پیش ہوئے۔ مریدوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ سیدی مولے کو ایک بیباک قلندر نے استرے کے وار کر کے زخمی کر دیا۔ بعد ازاں سلطان نے مست ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روندوا دیا گیا۔

برنی رقمطراز ہے جس روز سیدی مولے کو قتل کیا گیا۔ اس دن سخت آندھی آئی۔ کہ لوگ پناہ مانگنے لگے۔ اس سال بارش بھی نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ سب کچھ اس بے گناہ درویش کے ناحق خون کا نتیجہ ہے۔

۴۔ **ملک کافور**:۔ جنوری ۱۳۱۶ء میں علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک کافور نے اس کے چھ سالہ بیٹے کو شہاب الدین کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا۔ اور خود اس کا نائب بن گیا۔ اور علاء الدین کے دونوں لڑکوں خضر خان اور شادی خان کو اندھا کر دیا اور ملکہ جہاں کو قید کر دیا۔ علاء الدین کی ایک دوسری بیوہ سے شادی کر لی۔ اس نے تیسرے لڑکے مبارک خان کی آنکھیں بھی نکلوانے کے لئے کئی بار محل ہزار ستون میں اپنے آدمی بھیجے۔ اس نے خاندان خلجی کے پرانے نمک خواروں کو ایک ایک کر کے الگ کرنا شروع کیا۔ لیکن چند وفادار سپاہیوں نے ایک رات کو محل میں گھس کر ملک کافور کو قتل کر دیا۔ اس نے صرف ایک ماہ اور پانچ دن حکومت کی۔

Marfat.com

س ۱۱ غیر مسلموں کے بارے میں سلاطین دہلی کی پالیسی پر ضیاء الدین برنی کی تحریرات سے جو روشنی پڑتی ہے۔ اس پر ناقدانہ تبصرہ کیجئے۔

جواب۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ہندو معاشرہ چار طبقوں میں منقسم تھا۔

(۱) برھمن۔ جو لکھے پڑھے ہوتے تھے۔ اور مذہبی اعتبار سے سب سے اونچے خیال کئے جاتے تھے۔

(۲) کھشتری:۔ جو دفاع کے وقت ملک کی اہم خدمت سرانجام دیتے تھے۔ فوجی خدمت ان کے سپرد تھی۔

(۳) ویش:۔ تجارت پیشہ اور کاشتکاری کرنے والے لوگ تھے۔ جن کا کام معیشت کے اسباب مہیا کرنا تھا۔

(۴) شودر:۔ سب سے نچلے درجے کے لوگ شمار ہوتے تھے اور ہر ایک فریق کے خادم تھے۔ اعلےٰ طبقہ کے لوگ انہیں بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اسلام اور مسلمان فرمانروا اس امتیاز کے کبھی بھی روادار نہ تھے۔ اسلام کے قوانین کی رُو سے ہر انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے۔ عرب اور غیر عرب کی تمیز اسلام کے قوانین میں جائز نہیں۔ لہٰذا نچلے درجے سے تعلق رکھنے والے اسلام کے وسیع دامن میں پناہ لینا فخر سمجھتے تھے۔ سلاطین کے زمانے میں کسی بھی سلطان نے شودر اور چنڈال میں روائتی ظلم و ستم روا نہیں رکھا۔ لیکن ذات پات کی یہ تقسیم ہندو سماج میں سب سے بڑی لعنت تھی۔ اسی وجہ سے ہندو سماج میں عدم مساوات اور ناانصافی کا دور دورہ تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اسی عدم مساوات میں اور زیادہ شدت اس لئے پیدا ہو گئی۔ کہ ہندو الگ تھلگ رہ کر اپنے آپ کو مسلمانوں سے جُدا رکھنا چاہیئے تھے۔ یہاں برصغیر میں جب اسلامی حکومت کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہو گئیں۔ تو اسلامی اصولوں نے ہندو طرز فکر کو متاثر کیا۔ اور ہندو مت میں کئی اسلامی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اسلامی روایات سے متاثر ہو کر ان تحریکوں نے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ سماجی مساوات اور شودروں کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا گیا۔ یہ سب کچھ سلاطین اسلام کی مذہبی رواداری اور انسان دوستی کی وجہ سے

Marfat.com

ہُوا۔ نتیجے کے طور پر ذات پات کا فلسفہ لایعنی ہو کر رہ گیا۔

مجلسی زندگی میں ہندو خود مختار تھے۔ کیونکہ سلاطین نے انہیں پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ انہیں ہر طرح کی اجازت تھی۔ کہ اپنے باہمی تنازعات کو اپنے قانون اور رواج کے مطابق طے کریں۔ (لیکن برخلاف اس کے ہندو اس قدر تنگ نظر اور کم اندیش واقع ہوئے ہے کہ بھارت میں ہندو اکثریت آئے دن ان پر حملہ آور ہو کر مذہبی روا داری اور آزادی سلب کرنا چاہتی ہے) سلاطین دہلی کی حکومت کسی طرح بھی ان کی مذہبی زندگی میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

ہندو معاشرہ ممتاز طبقہ رؤسا۔ حکام۔ تجار اور سود خور ساہوکاروں پر مشتمل تھا۔ اور ہندو بہت ہی خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہندو رؤسا کی عورتیں اسلامی معاشرہ سے متاثر ہو کر پردے کی سخت پابند تھیں۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادی اور ستی جیسی قبیح رسوم کا رواج تھا۔ مسلمان سلاطین نے ہر ممکن کوشش سے ان بری رسموں کو روکا۔

ہندو اسلامی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے فارسی زبان سیکھی۔ اور بہت جلد کلیدی اسامیوں پر فائز ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مغلوں کے دور میں راجہ ٹوڈرمل۔ بیربل اور اورنگ زیب کے غیر مسلم ہندو فوجی کمانداروں کی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں۔ ہندوؤں نے اسلامی روایت اور شعار کو اپنایا۔ لباس وغیرہ میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔

مسلمانوں کی وسیع روا داری اور اسلامی اصولوں کے ماتحت ہر قسم کی سہولت دینے کے باوجود ہندوؤں نے اپنے آپ کو سلاطین کی وفادار رعایا ثابت نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو غاصب اور بیرونی مداخلت کرنے والے ہی سمجھتے رہے اور اسی کوشش میں رہے کہ کسی نہ کسی طرح آزادی حاصل کی جائے۔ اور رام راج کے لئے راہ ہموار کیجائے۔

ہندوؤں کو مسلمانوں کا جزیہ ہمیشہ ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ جو کہ صرف ان نوجوانوں پر عائد ہوتا تھا۔ جو فوجی خدمت نہیں دیتے تھے۔ بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں معذور لوگوں کو کسی قسم کا محصول نہیں دینا پڑتا تھا۔ مگر ہندو۔ نے انگریز کے قسم لے

Marfat.com

محصول بصد خوشی برداشت کیا۔ یہ ان کی تنگ نظری اور تعصب کا ہی نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے مشرق اور شمال مغرب میں ایک مضبوط اور تابندہ قائم رہنے والی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آگئی۔ گو ہندو نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دو حصے کر دیئے۔ لیکن پھر مشرقی حصہ آزاد مسلمان ریاست کی صورت میں ہندو کے سینے پر سانپ بن کر لوٹ رہا ہے۔ اور پاکستان تو ایک بنیان مرصوص ہے مغربی حصے پر حملہ کر کے بھارت نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ کہ پاکستان لوہے کے چنے ہیں۔ سلاطین نے ہندوؤں کی شکایتوں پر جزیہ کی قلیل رقم کئی بار معاف کر دی۔ جو ان کی مذہبی رواداری کی دلیل ہے اسپر اگر ہندو مورخ مسلم کو تنگ نظر اور ظالم کہے۔ تو یہ ان کی اپنی تنگ دامانی پر دلالت کرتی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار حکومت کی۔ اگر وہ اس قسم کے سخت گیر اور تشدد پسند ہوتے۔ تو انگریزوں کی آمد تک ہندوستان میں کوئی غیر مسلم نہ ہوتا تعلیم عام تھی۔ اس میں داخلے کے لئے مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ افسوس صرف اس بات کا ہے۔ کہ انگریز نے بھی مسلمان سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لینے کے لئے ہر طرح مسلمان کو بدنام کیا ہے۔ ہندو پہلے ہی دشمن تھا۔ اس لئے ہر طرف مسلمان ظالم ہی ظالم نظر آنے لگا۔

س ۲۔ سندھ میں محمد بن قاسم کی پالیسی اور نظم و نسق سے بحث کیجئے۔ اور بتایئے کہ اس پالیسی کے تعین میں اس کا کیا حصہ تھا۔

جواب۔ **محمد بن قاسم** :۔ محمد بن قاسم سترہ سال کی عمر میں اسلامی لشکروں کا سپاہ سالار بنا۔ جو اس بات کی روشن دلیل ہے۔ کہ محمد بن قاسم فہم و فراست کا پیکر تھا۔ اور عسکری قابلیت کا مالک تھا۔ بلند حوصلہ سپاہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ کار مدبر اور سیاست دان تھا۔ سندھ پر حملہ آور ہونے سے پہلے وہ فارس کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ اس لئے وہ صرف فاتح ہی نہ تھا۔ بلکہ اعلٰے درجے کا منتظم بھی تھا۔ اپنی فتوحات کے دوران میں اس نے اہل سندھ غیر مسلم اقوام کے ساتھ وہ مہذبانہ اور مشفقانہ سلوک کیا۔ کہ اس کے سندھ سے چلے جانے پر دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ وہ اس کی نرم پالیسی سے متاثر ہو کر اس کے گرویدہ ہی نہ ہو گئے۔ بلکہ اسے اوتار سمجھتے تھے۔ اور نجات دہندہ خیال کرتے تھے۔ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں میں بڑی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک مثالی حکومت قائم کی۔ اور ایسا نظام سلطنت رائج کیا۔ جو فلاح و بہبود اور عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی تھا۔ اس نے اپنی انتظامی حکمت عملی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ کہ راعی (حاکم) اور رعیت کے

Marfat.com

تعلقات دیانتداری کے اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں۔ مالیہ یا لگان کاشتکاروں کی استطاعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس نے سندھی عوام کو ظالم ہندو حکمرانوں کی جابرانہ حکومت سے نجات دلاکر حقیقی آزادی اور مساوات عطا کی۔ اسلامی اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے گورے کالے کی تمیز اُڑادی۔ اور اعلٰے وادنیٰ کے خودساختہ امتیازات کو مٹادیا۔

محمد بن قاسم صرف میدان کارزار میں محض ایک شاہسوار ہی نہ تھا بلکہ وہ انصاف پسند حاکم اور آئین وضبط کا پابند انسان تھا۔

جب ولید بن عبدالملک کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک حاکم ہوا تو اس نے بغیر کسی وجہ کے محمد بن قاسم جیسے ہردلعزیز نوجوان کو برطرف کرکے جانب داری کا ثبوت دیا۔ تو محمد بن قاسم نے اس ناجائز حکم کے سامنے گردن جھکادی۔ جو اطاعت امیر کی ایک روشن مثال ہے۔ وہ سندھ میں صرف قلیل مدت یعنی تین برس تک رہا۔ لیکن اس تھوڑی مدت میں بھی عوام اسے احسن اخلاق اور نیک اطوار کیوجہ اوتار مانتے تھے۔ اسکی زندگی کا آغاز بہادرانہ تھا۔ لیکن انجام دردناک تھا۔

محمد بن قاسم کی مہمات کی کہانی ایک رومانی باب ہے (لین پول)

۱۔ نظم ونسق:۔ محمد بن قاسم ایک عظیم فاتح ہونے کے باوجود ایک اعلٰے پایہ کا منتظم تھا۔ وہ سندھ میں صرف تین سال رہا۔ اور اس قلیل مدت میں وہ جنگی مہموں میں مصروف رہا۔ مگر تاریخ کے بے شمار کارنامے ہیں۔ اتنی سی تھوڑی مدت میں کسی جرنیل نے اتنی فتوحات حاصل نہیں کیں۔ فتح کے ساتھ ساتھ اس نے مفتوحہ علاقوں میں امن وامان۔ عدل وانصاف۔ رواداری اور اسلامی اصولوں پر مبنی معاشرہ قائم کیا۔ اس نے غیر مسلموں سے نہایت مشفقانہ اور روادارانہ سلوک کیا۔ اسی رواداری کا نتیجہ تھا۔ کہ سندھ کے غیر مسلم افراد نے محمد بن قاسم سے تعاون کیا۔ اسلامی فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اور بہت لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا۔

۲۔ جزیہ:۔ جزیہ ایک اسلامی محصول تھا۔ جو فوجی خدمات ادا نہ کرنے کی پاداش میں غیر مسلم عوام کو دینا پڑتا تھا۔ جبکہ اسلامی حکومت غیر مسلم عوام کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی تھی۔

فتح سندھ کے بعد پہلی بار مسلمان حکام کو سندھ کے غیر مسلم لوگوں سے واسطہ پڑا۔ تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا۔ کہ غیر مسلموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے

Marfat.com

ہدایات طلب کیں۔ علماء کے مشورے سے طے پایا۔ کہ ہندوؤں کے ساتھ روادارانہ سلوک کیا جائے اور انہیں اسلامی قلمرو میں یہودیوں اور عیسائیوں کا سا درجہ دیا جائے۔ یعنی انپر جزیہ عائد کیا جائے تا کہ انکی عزت۔ آبرو اور جان و مال کی حفاظت بطریق احسن کی جا سکے۔ اور انہیں اپنے مذہب کی جملہ رسومات ادا کرنے میں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ لہٰذا اسلامی دستور کے مطابق غیر مسلم عوام پر جزیہ بطور محصول لگا دیا گیا۔ اور رعایا کے لئے لازم تھا کہ وہ حکومت کی اطاعت کرے۔ جزیہ کے تین طبقے تھے۔

۱۔ دولت مند طبقہ۔ ۴۸ درہم سالانہ یعنی ۱۲ روپے سالانہ۔

۲۔ متوسط طبقہ:۔ ۲۴ درہم سالانہ یعنی ۶ روپے سالانہ۔

۳۔ نچلا طبقہ:۔ ۱۲ درہم سالانہ یعنی تین روپے سالانہ۔

لیکن اس محصول سے بوڑھے۔ اپاہج۔ غربا اور برہمن اور غیر مسلم افراد جو فوجی خدمت ادا کرتے تھے۔ اس محصول سے مستثنیٰ تھے۔ اہل سندھ برضا و رغبت یہ محصول ادا کرتے رہے۔ کیونکہ ان کی جان اور مال کی حفاظت کا ذمہ حکومت پر تھا۔ محمد بن قاسم نے جزیہ کی وصولی کے لئے برہمن عامل مقرر کئے۔ اور انہیں ہدایت تھی کہ محصول ادا کرنے والوں کی استطاعت کو مدِ نظر رکھا جائے۔

مذہبی آزادی:۔ جب محمد بن قاسم نے سندھ کے ہندوؤں پر یہ محصول عائد کیا۔ تو وہ بھی شام کے عیسائیوں اور ایران کے پارسیوں کی طرح ذمی رعایا قرار پائے۔ اس لئے انہیں مجلسی اور مذہبی آزادی عطا کر دی گئی۔ چنانچہ الور کی فتح کے بعد ہندوؤں کے بتکدے اور بدھوں کے مندروں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ نیز ہندوؤں کے مقدموں اور چوہدریوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے مندروں کی تعمیر کریں۔ مسلمانوں سے میل دین کیا جائے۔ امن اور اطمینان سے زندگی بسر کریں اور برہمنوں کے حقوق قدیم دستور کے مطابق بجا لائیں۔ جاگیر داروں کی جاگیریں بحال کر دیں۔ سندھ کے ہندو مسلمانوں کی اس رواداری سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

۳۔ مفتوحہ علاقوں کا انتظام:۔ سندھ کے مفتوحہ صوبے کو صوبہ عراق کے ذیلی صوبے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس جگہ کا حاکم حجاج بن یوسف کے ماتحت تھا۔ دُور ہونے کی وجہ سے محمد بن قاسم اپنے داخلی امور میں کلی طور پر خود مختار تھا۔ اور مقامی آبادی کے جذبات کا احترام کرتا

Marfat.com

تھا۔ اور مقامی لوگ نظام سلطنت میں باقاعدہ طور پر شریک ہوتے تھے۔ راجہ داہر کا عقل مند وزیر سی ساگر بطور وزیر کام کرتا تھا۔ اسی طرح قلعہ باتیہ کا حاکم ککسر بھی مشیر خصوصی تھا۔

جنگ کے ختم ہوتے کے بعد محمد بن قاسم نے تمام مفتوحہ علاقے کو چھوٹے چھوٹے اضلاع (اقطاع) میں تقسیم کیا۔ ان اقطاع پر معتبر عرب فوجی نگران متعین تھے۔ جن کے ذمے نظم و نسق کے علاوہ بغاوتوں کی روک تھام اور داخلی امن و استحکام ہوتا تھا۔ اضلاع کے چھوٹے چھوٹے حلقوں (تحصیلوں) پر ہندو حاکم مقرر کئے۔ دیہات کا انتظام بھی مقامی لوگوں کے سپرد تھا۔

محمد بن قاسم نے برہمن آباد کو چار برابر کے حصوں میں تقسیم کرکے وفادار اور معتبر کوتوال مقرر کئے۔ راجہ داہر کے بیشتر عہدہ داروں کو برقرار رکھا۔ دوران جنگ متاثرہ لوگوں کی فہرستیں بنوا کر ہر ایک آدمی کو معاوضہ دیا۔ اس اقدام سے مقامی لوگ عربوں کے گرویدہ ہو گئے۔

محکمہ عدل:۔ عدل و انصاف کے ضمن میں قاضی مقرر کئے گئے۔ جو اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ فوجداری مقدمات کا فیصلہ قاضیوں کے سپرد ہوتا تھا۔ دیوانی مقدمات کے فیصلوں کے لئے رعایا کو مقامی رواج کے مطابق پنچائیتوں سے رجوع کرنے کی اجازت تھی۔ ہندوؤں کے مقدمات کا ہندوؤں کے قانون کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا۔ حاکموں کو عدل و انصاف کرنے کا حکم تھا۔

فوجی انتظام:۔ محمد بن قاسم ایک مدبّر اور اچھا منتظم تھا۔ مفتوحہ علاقے میں متعدد چھاؤنیاں قائم کیں، ان فوجی مراکز میں ہسپتال۔ عدالت۔ دواخانہ اور اصطبل وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام ہوتا تھا۔ جاگیرداروں کی فوج کے علاوہ مستقل فوج کا بھی انتظام تھا۔ گھڑ سوار، سانڈنی سوار اور پیدل فوج کے علاوہ نفت انداز بھی ہوتے تھے۔ اسلحہ میں منجنیق۔ تیر و کمان۔ تلوار۔ ڈھال اور نیزے وغیرہ شامل تھے۔ سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ مال غنیمت میں سے مقررہ حصہ دیا جاتا تھا۔ عرب فوجیوں کو سندھ میں آباد ہونے اور سندھی عورتوں سے شادیاں کرنے کی اجازت تھی۔ مشہور چھاؤنیاں درج ذیل تھیں۔ منصورہ۔ قصدار۔ کندہ۔ بیل۔ بیضا۔ محفوظہ اور ملتان۔

محکمہ مال کا انتظام۔ محمد بن قاسم محکمہ مال کے انتظامی عہدوں پر خاص طور پر ہندوؤں کو مامور کیا۔ برہمنوں کی عزت کرتے ہوئے انہیں محاصل وصول کرنے پر متعین کیا۔ انہیں خطابات

Marfat.com

کے علاوہ قیمتی تحائف اور خلعتیں عطا کیں۔ مناصب کو موروثی طور پر مستقل کر دیا۔ برہمنوں کا سابقہ تین فیصد حصہ بحال کر دیا۔ عمال کو حکم تھا کہ امکانی طور پر رعایا پر کسی قسم کا بھی ظلم روا نہ رکھا جائے۔ استطاعت سے زیادہ جزیہ اور لگان ہرگز وصول نہ کیا جائے۔ رعایا اور حکومت کے درمیان اچھے تعلقات قائم تھے۔ ادائیگی فرائض کی صورت میں حکومت ہر قسم کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ ہندو افسروں نے ملک کا دورہ کر کے عوام پر واضح کر دیا۔ کہ اسلامی حکومت رعایا پر کس قدر مہربان ہے۔ اس طرح چھوٹے بڑے سب برابر ہو گئے۔

محمد بن قاسم نے تمام حساب وکتاب عربی کے بجائے مقامی زبان سندھی میں لکھنے کا حکم دیا۔ تہری زمین کی گندم اور جو پر ۲/۵ اور معدنیات پر ۱/۵ محصول عائد کیا۔ مسلمانوں سے زکوٰۃ اور صدقات وصول کئے جاتے تھے۔

الغرض محمد بن قاسم کا قائم کردہ نظام حکومت رواداری اور رعایا سے فیاضانہ سلوک کے اصولوں پر مبنی تھا۔ نظام سلطنت کی مضبوطیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ محمد بن قاسم کی معزولی پر چلے جانے پر ہندوؤں نے بہت زیادہ افسوس کیا۔ گریہ وزاری کی۔ اسکی یادگار کے طور پر مجسمے نصب کرلئے۔ یہ تھے مسلمان حاکم جو انصاف پسند اور با اصول تھے۔

س ۳: ۔ سلطنت دہلی کے بانی کی حیثیت سے التمش کو کون داخلی اور خارجی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوا؟

جواب ۔ سلطان شمس الدین ایلتتمش بجا طور پر سلطنت دہلی کا عظیم فرمانروا تھا۔ بہ حیثیت ایک اعلیٰ انسان اور موزوں حکمران کے وہ تمام سلاطین دہلی میں بلند مقام رکھتا ہے۔ (محمد عزیز احمد)

ایلتتمش کی وجہ تسمیہ :۔ اس لفظ کا صحیح تلفظ ایلتتمش ہے جس کے معنی معاون اور مددگار کے ہیں۔ (لین پول) ۔ بعض مورخین کی رائے ہے کہ ایلتتمش ترکی لفظ ہے۔ جس کے معنی چاند گرہن کے ہیں۔ چونکہ سلطان شمس الدین چاند گرہن والی رات میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ (ارلی ترکش ایمپائر آف دہلی ص ۱۸۱)

قطب الدین ایبک نے ایک لاکھ جیتل دے کر دو غلاموں کو خریدا۔ جن میں سے ایک یہی شمس الدین تھا۔ ایلتتمش اپنی خداداد ذہانت کی بنا پر سب سے پہلے ایک دستے کا سردار مقرر ہوا۔

Marfat.com

بعد ازاں امیر شکار کے منصب پر فائز ہوا۔ گوالیار کی تسخیر کے بعد سلطان نے اسے گوالیار کا حاکم مقرر کیا۔ جلد ہی بلند شہر (برن) اور اردگرد کے علاقے کا گورنر مقرر ہوا۔ لیکن جلدی ہی اپنی جانفروشی کے عوض بدایوں کا حاکم مقرر ہوا۔

سلطان محمد غوری کو کھوکھروں کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے وارد ہندوستان ہونا پڑا۔ التتمش نے کھوکھروں کی بغاوت فرو کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ سلطان غوری نے عسکری قابلیت دیکھتے ہوئے خدمت فاخرہ سے نوازا۔ اور سلطان نے ایبک سے فیاضانہ سلوک کرنے کو کہا۔ جس کے نتیجے میں آزاد ہو کر امیر الامراء کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا۔ سلطان قطب الدین ایبک کی اچانک وفات پر سپہ سالار اعلیٰ۔ شہر کے امیر۔ قاضی القضاۃ اور دوسرے امراء سلطنت کے مشوروں سے سلطان شمس الدین التتمش نے تاج شاہی قبول کر کے اپنی افواج کے ہمراہ دہلی پہنچا۔ اور ۱۲۱۰ء میں تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔

ابتدائی مشکلات:۔ التتمش کو تخت نشین ہوتے ہی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی کے ترکوں اور دوسرے امراء نے آرام شاہ کا ساتھ دے کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ کیونکہ وہ التتمش کو غلام ابن غلام جانتے تھے اور کسی صورت اسکی قیادت کے قائل نہیں تھے۔ ایبک کے زمانے کے صوبیدار پہلے نیم خود مختار تھے۔ اب کلی طور پر خود مختار ہو گئے۔

بنگال میں مردان خان نے بھی خود مختاری حاصل کر لی۔ سندھ اور ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ نے لاہور پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

تاج الدین یلدوز جو اپنے آپ کو محمد غوری کا جانشین سمجھتا تھا۔ خود ہی سلطان التتمش کو اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا اور سلطان دہلی پہ اپنی بالادستی جتاتا تھا۔

اُن راجپوت راجاؤں نے بھی بغاوت شروع کر دی جنہیں نے سلطان غوری اور سلطان ایبک نے زیر نگیں کیا تھا۔ اپنے باغیانہ ارادوں کے پیش نظر خراج دینا بند کر دیا۔ اجمیر۔ دوآب رنتھمبور۔ گوالیار کے علاقے خود مختار ہو گئے۔

فتنہ تاتار نے ان پریشانیوں میں مزید اضافہ کیا۔ جلال الدین خوارزم شاہ نے چنگیز خان سے شکست کھا کر غزنی میں پناہ لی۔ یلدوز غزنی سے بھاگ گیا۔ اور پنجاب آ کر دہلی پر قبضہ جمانے کے منصوبے

Marfat.com

بنلانے لگا۔

اسی دوران میں چنگیز خان نے غزنی اور کابل کو تاخت و تاراج کر دیا۔ خوارزم شاہ ہندوستان کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوا۔ چنگیز خان دریائے سندھ تک آ گیا۔ جس کی وجہ سے ایلتتمش کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن ایلتتمش نے اپنی دانست اور فہم و تدبر سے ان تمام مشکلات پر یکے بعد دیگرے قابو پا لیا۔ اور اپنی وفات تک شمالی ہندوستان کا واحد حاکم تھا۔ اس لئے تاریخ دان حضرات اسے خاندان غلاماں کا دوسرا بانی خیال کرتے ہیں۔

ترک امراء کی گوشمالی۔ سلطان نے برسرِ اقتدار آ کر ترکوں سے فیاضانہ سلوک کیا۔ انعام و اکرام دے کر انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر بھی اکثر ترک امراء اور معزی امراء نے علم بغاوت بلند کیا۔ نواح دہلی میں فتنہ پردازیوں میں مصروف ہو گئے۔ سلطان نے ابتداء میں خاموشی اختیار کی۔ مگر آخر کار جرار لشکر کے ذریعے تمام باغیوں کو دریائے جمنا کے پار شکست فاش دی۔ اور باغی امراء کو قتل کر دیا۔ جس کی وجہ سے دہلی میں امن و سکون بحال ہو گیا۔ اور ہندو رعایا بھی شاہی دبدبے سے خاموش ہو گئی۔

تاج الدین یلدوز:۔ ترک سرکشوں کو درمیان سے ہٹانے کے بعد سلطان نے اپنے سب سے بڑے دشمن یلدوز کی طرف توجہ منعطف کی۔ یلدوز نے ناصر الدین قباچہ کو لاہور سے نکال کر پنجاب کے بہت سے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور سلطان کو لکھا کہ اس کے تسلط کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس پر سلطان نے ایک بھاری لشکر پنجاب کی طرف روانہ کیا۔ ترائن کے مقام پر یلدوز سے معرکہ ہوا۔ یلدوز کو شکست ہوئی۔ گرفتار ہو کر بدایوں کے قلعے میں قید ہوا۔ جہاں دوران حبس میں ہی فوت ہوا۔ اس طرح سلطان کو ایک بڑے دشمن سے نجات ملی۔

چنگیز خان:۔ چنگیز خان نے سلطان جلال الدین کا تعاقب دریائے سندھ کے کناروں تک کیا۔ وہ دریا سے پار ہو گیا۔ خوارزم شاہ دہلی میں عام شہری کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن سلطان کو اس کے وجود سے تاتاریوں کا خطرہ بھی محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ خوارزم شاہ گکھڑوں کی مدد سے قباچہ پر حملہ کیا۔ اور ملتان پر قابض ہو گیا۔ مگر حالات اس کے لئے سازگار نہ تھے۔ ۱۲۲۴ء میں ایران چلا گیا۔ آخر وہ منگولوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ چنگیز خان نے دریا کو ضرور عبور کیا لیکن سلطنت دہلی پر حملہ نہیں

Marfat.com

کیا۔ اس طرح سلطنت دہلی کے سر پر سے ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔

ناصر الدین قباچہ: ۔قطب الدین ایبک کا داماد تھا۔ بڑا زیرک تھا۔ مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے ملتان کا حاکم بن گیا۔ قباچہ نے سلطان کو خراج دینا بند کر دیا۔ لہٰذا سلطان نے ۱۲۲۸ء میں قباچہ کو زیرِ نگیں کرنے کی خاطر اُچ پر حملہ کیا۔ قباچہ حملے کی تاب نہ لاکر بھکر کے قلعے میں پناہ گزین ہوا۔ اپنی فوجی قوت کو کمزور پاکر ایک کشتی کے ذریعے بھکر سے کسی دوسرے مقام کی طرف چلا گیا۔ کشتی اُلٹ جانے سے غرق ہو گیا۔ اسکی وفات کے بعد سندھ اور ملتان کے علاقوں کا سلطنت دہلی سے الحاق ہو گیا۔

بنگال کی فتح: ۔بنگال کا حاکم علی مردان خلجی تھا۔ رعایا اور امراء نے اسے قتل کر دیا۔ اب سلطان کو بنگال کی طرف توجہ مرکوز کرنا پڑی۔ فتنہ منگول سے نجات ملتے ہی سلطان نے ۱۲۲۵ء میں بنگال پر چڑھائی کی۔ وہاں کے حاکم نے بغیر لڑائی کے صلح کر لی۔ خراج دینے کا وعدہ کیا۔

سلطان نے اپنی پامردی اور تدبر سے تمام مشکلات پر قابو پا لیا۔ اور ایک مستحکم سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

س ۲۷:۔ علاء الدین خلجی کی مالی اصلاحات بیان کیجئے اور بتائیے کہ دیہی اور شہری آبادی کے مختلف طبقات پر ان اصلاحات کا کیا اثر ہوا؟

جواب ۔سلطان علاء الدین خلجی نے اپنی لمبی چوڑی سلطنت کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے۔ ملکی دفاع کو مضبوط بنانے ۔ داخلی طور پر ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لئے اور اقتصادی طور پر ملک کو خوشحال اور مضبوط بنانے کے لیے کئی ایک اصلاحات نافذ کیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔ فوجی اصلاحات:۔ سلطان نے ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ کرنے کے لئے سرحدی پالیسی کو از سرِ نو نافذ کیا۔ سرحدوں پر واقع تمام پرانے قلعوں کی مناسب مرمت کر کے انہیں مضبوط بنایا۔ اہم مقامات پر نئے قلعے بنائے۔ ان قلعوں میں تازہ ۔ چاق و چوبند اور تربیت یافتہ فوج کا تعین کیا۔ قلعوں میں جنگی ساز و سامان اور رسد کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ اسلحہ سازی کے بارے میں تجربہ کار اسلحہ سازوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

ا۔ جاگیرداری نظام کے ماتحت فوجوں میں اشتراک کم ہوتا تھا۔ سلطان نے جملہ افواج کو

Marfat.com

جاگیرداروں کے بجائے براہ راست مضبوط مرکز کے ماتحت کر دیا۔

۲۔ سپاہیوں اور افواج میں باقاعدہ تنخواہ کا انتظام رائج کیا۔

۳۔ پہلی بار گھوڑوں کو داغ دینے کا طریقہ جاری کیا تاکہ وہ عام گھوڑوں سے ممتاز رہیں۔

۴۔ سلطان نے فوج کو ترکوں کی طرز پر منظم کیا۔ فوج کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا۔

۵۔ ہر سپاہی کو دو سو چونتیس ٹنکے تنخواہ ملتی تھی۔

۲۔ نظام مالگذاری :۔ سلطان نے مالگذاری میں بھی بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اس نے ملکی ذرائع پر مکمل قبضہ کرتے ہوئے ذرائع آمدن کو انتہائی درجے تک پہنچا دیا۔ تاکہ مستقل فوج رکھی جا سکے۔ اس لئے نظام مالگذاری میں مندرجہ ذیل اصلاحات کی گئیں۔

ا۔ جاگیروں کی ضبطی :۔ سلطان نے مسلمان امراء اور علماء کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ فوجی خدمات کے بدلے میں حاصل کی ہوئی زمینوں کو خالصہ شاہی میں داخل کیا۔ اس طرح آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

۲۔ ہندو روساء کا زور توڑنا :۔ جاگیریں ضبط کرنے کے بعد سلطان نے ہندو روساء کی طرف توجہ مبذول کی۔ کیونکہ وہ سلطنت دہلی کے وفادار نہیں تھے۔ اور بسا اوقات بغاوتیں برپا کر دیتے تھے۔ یہی لوگ دیہات میں مالیہ وصول کرتے تھے۔ جو کہ پشت بہ پشت ان مناصب پر متعین تھے۔ مالیہ اور دوسرے محصولوں سے مستثنیٰ تھے۔ اس لئے یہ لوگ اچھے خاصے امیر ہو گئے تھے۔ سلطان نے ان لوگوں کا اقتدار توڑنے کے لئے تمام رعائتیں ان سے واپس لے لیں۔ اور ان پر عام آدمیوں کی طرح محصولات عائد کر دئیے۔

۳۔ لگان کی شرح پیداوار کا نصف حصہ مقرر کیا۔ ہندوؤں پر جزیہ لگا دیا۔

۴۔ سلطان سے پہلے اراضی سے لگان وصول کرنے کے لئے دو طریقے رائج تھے۔ (۱) حکم حاصل :۔ ہر فصل کے موقع پر مقدار کے مطابق حکومت سرکاری لگان وصول کر لیتی تھی۔ ۲۔ حکم مساحت : زمین کی پیمائش کر کے فی بیگھ اوسط مقدار مقرر کر لی جاتی تھی۔ سلطان نے لگان کے لئے زمین کی پیمائش کر کے نصف پیداوار سرکاری حصہ مقرر کر دی۔ اس طرح حکومت کی آمدنی دگنی ہو گئی۔

۵۔ سلطان نے لگان کی وصولی کے لئے دیانت دار عہدیدار متعین کئے۔ نابود کھیتوں سے لگان نہ وصول کرنے کا حکم دیا۔ محکمہ مال کے ملازموں کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ ارتکاب جرم پر عبرتناک سزا دی

Marfat.com

جاتی تھی۔

۶۔ نظام مالیہ کا نفاذ:۔ مندرجہ بالا اصلاحات کا نفاذ تمام ملک کے حصوں میں مشکل تھا۔ اس لئے یہ نظام سلطنت کے مرکزی حصے میں نافذ العمل تھا۔ سلطان کو اس طرح خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ہندوؤں کا زور ٹوٹ گیا۔ بغاوتیں رُک گئیں۔

۷۔ اقتصادی نظام:۔ منگولوں کے حملوں کا سدباب کرنے کے لئے مستقل فوج کا انتظام کیا۔ اس طرح اخراجات بڑھ گئے۔ ان بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کافی غور وخوض کے بعد اشیاء کی قیمتیں کم کر دی گئیں۔ اگرچہ اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنے میں سلطان کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ ایک مستقل مزاج انسان تھا۔ اس لئے اس نے چند ایک ضابطے وضع کئے۔

۱۔ منڈیوں میں اشیاء کی فراہمی کا خاطر خواہ انتظام کیا۔

۲۔ وافر اشیاء پیدا کرنے والے علاقوں سے اشیاء کے منتقل کرنے کا نظام۔

۳۔ اشیاء ضرورت کی کمیابی۔ بلکہ نایابی کی صورت میں حسب ضرورت راشن بندی اور تقسیم کا نظام۔

۴۔ خفیہ پولیس کے ذریعے اشیاء کی بازیافت۔ قیمتوں پر مکمل قبضہ کر لینا۔

۵۔ ناجائز منافع کی صورت میں سخت کڑی سزاؤں کا نفاذ۔ سلطان کا نافذ کردہ اقتصادی نظام مالی اصلاحات کے ضمن میں تاریخ میں ایک بے مثال باب ہے۔ اس بارے میں یہ اصلاحات نافذ کیں۔

۱۔ اشیاء کی قیمتوں کا تعین:۔ سلطان نے بہ نفس نفیس اشیاء کی قیمتوں کا تعین کیا۔ اشیاء بہت ہی سستی تھیں۔ مثلاً بارہ سیر گندم کی قیمت ایک روپیہ تھی۔

۲۔ فراہمی غلہ:۔ لگان میں پیداوار کا نصف وصول کیا جاتا تھا۔ یہ غلہ سرکاری گوداموں میں اکٹھا ہوتا تھا۔ اس ضمن میں کاشتکاروں کو اپنی ضرورت کے مطابق غلہ رکھنے کی اجازت تھی۔ زائد غلے کو فروخت کرنے کا حکم تھا۔

۳۔ خشک سالی یا قحط کی وجہ سے عوام کو غلہ سرکاری گوداموں سے ملنے کا حکم تھا۔

Marfat.com

۳۔ غلے کی نقل وحمل کے لئے ہر قسم کی امکانی سہولت پیدا کی گئی۔ اس غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام تاجروں اور بیوپاریوں کو دریاؤں کے کنارے پر آباد کیا۔ ان سے عہد لیا گیا۔ کہ وہ غلہ خرید کر منڈیوں میں لائیں۔

۴۔ اشیاء خور ونوش میں راشن بندی کر دی گئی۔ سرکاری خزانوں سے اشیاء صرف مہیا ہوتی تھیں۔

۵۔ قیمتی اشیاء اور کپڑے پر کنٹرول کر دیا گیا۔

سلطان کی مالی پالیسی بہت کامیاب تھی۔ اشیاء صرف سستی تھیں۔ ان کے حصول میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ بغاوتوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ الغرض سلطان ایک کامیاب بادشاہ تھا۔ اگرچہ ان پڑھ تھا۔ لیکن انتظامی صلاحیتوں سے اسے وافر حصہ ملا ہوا تھا۔

س ۵: ۔ علماء اور مشائخ کے ساتھ غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے تعلقات پر ناقدانہ نظر ڈالیئے۔

جواب: خاندان تغلق: سلطنت دہلی کے پانچ حکمرانوں میں سے تغلق خاندان کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مغلوں سے پہلے ہندوستان میں اسلامی دور حکومت کا بہترین زمانہ تھا۔ (آقا مہدی حسین)

غیاث الدین تغلق: ۔ غیاث الدین تغلق ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ شعائر اسلامی کا پابند تھا۔ اس نے شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کی پیداوار اور فروخت کو اسلامی قانون کے مطابق جرم قرار دیا۔ وہ شاہی غرور اور رعونیت سے کلی طور پر پاک تھا۔ سریر آرائے تخت ہونے کے بعد اپنے خاندان کے افراد، دیرینہ احباب اور ملازمین سے اس کے تعلقات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا۔ (مرد لزنے ہیرے)

سلطان غیاث الدین ایک راسخ العقیدہ سُنی مسلمان تھا۔ اس کا اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ روادارانہ سلوک تھا۔ وہ ارباب علم وفن کا مربی تھا۔

علماء وصوفیا: ۔ علماء اور صوفیا کے بارے میں محمد تغلق کی حکمت عملی قابل غور ہے۔ سلطان التمش مرحوم کے زمانے سے ہی علماء اور صوفیا کو دہلی میں ایک اہم حیثیت حاصل رہی۔

Marfat.com

حضرت نظام الدین اولیاء کو سلطان کے دربار میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ وہ اپنے دینی اور روحانی اثر و رسوخ کے لحاظ سے ایک روحانی حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ محمد تغلق نے علماء اور صوفیاء کرام کے اثر و رسوخ کو اپنے شاہی وقار کے لئے ایک بڑا خطرہ خیال کیا۔ چنانچہ اس نے ان کے وقار کو کم کرنے کی خاطر اپنے ابتدائی زمانے میں چند سرکردہ علماء اور صوفیا کو شاہی دربار سے وابستہ کرنے کی کوشش کی۔

سیر الاولیاء:۔ سلطان ان علماء کو دنیوی کاموں پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ (میر خورد) سلطان نے حکم دیا تھا۔ کہ درویش خدمت گاروں کی طرح اسکی خدمت کیا کریں (فرشتہ) مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے سلطان نے سخت گیری کرنا شروع کر دی۔ چنانچہ اس سخت گیری کا پہلا نشانہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی تھے۔ جو کہ سلطان الاولیاء نظام الدین اولیاء کے خلفاء کبار میں سے تھے۔ انہیں حکم ہوا۔ کہ وہ سلطان کو کپڑے پہنایا کریں۔ آغاز کار میں تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں انہیں اپنے مرشد کا حکم یاد آیا۔ جنہوں نے فرمایا تھا۔ کہ بہر حال تمہیں دہلی ہی رہنا ہوگا۔ خواہ تمہیں اس قیام میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

سلطان نے دوسرا حکم یہ جاری کیا۔ کہ مولانا شمس الدین یحییٰ کو (جو کہ دہلی کے ایک مقتدر عالم تھے۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء کے خاص مریدوں میں سے تھے) کہا۔ کہ آپ جیسے مقتدر علماء کو دہلی کے بجائے کشمیر میں رشد و ہدایت کا کام کرنا چاہیئے۔ تاکہ آپ آسانی سے اس کفرستان کی وادی میں تبلیغ اسلام کا اہم فریضہ ادا کر سکیں۔ انہوں نے کشمیر جانے کی تیاری شروع کر رہی دی تھی کہ عالم فانی سے عالم بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔

سلطان کی اس جابرانہ پالیسی کا اہم ہدف شیخ شہاب الدین المعروف بہ آحق گو بھی ہوئے۔ بادشاہ انہیں ذاتی خدمت پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن انہوں نے شاہی قاصد کو یہ کہہ کر لوٹا دیا۔ کہ وہ ایک ظالم کی خدمت نہیں کر سکتے۔ سلطان یہ الفاظ سن کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے قاضی انصاف سے بطور شکایت کیا۔ کہ شیخ ایک انصاف پسند بادشاہ کو ظالم کہتا ہے۔ شیخ نے طلبی پر قاضی انصاف کے دربار میں بھی برسر دربار اپنے الفاظ کو دہرایا۔ اور بادشاہ کے ظلم کی کئی ایک مثالیں پیش کیں۔ بادشاہ اور زیادہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے قتل کرا دیا۔

سلطان نے ایک اور بھی حکم نافذ کیا۔ کہ سادات اور مشائخ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں۔

Marfat.com

جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ دہلی میں علماء و صوفیا کی قدر و منزلت میں کافی سے زیادہ کمی آگئی۔ کئی ایک مشائخ اپنی مرضی سے اور کئی ایک با امر مجبوری دہلی چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔

سلطان کے ان اقدامات کے بعد علماء و صوفیاء کو دہلی پہلی سی منزلت نصیب نہ ہو سکی مختلف تاریخ نویس حضرات نے جن میں برنی (ضیاء الدین) ابن بطوطہ۔ فرشتہ اور میر خورد شامل ہیں۔ سلطان کے متحکمانہ انداز کو بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک حد تک زمانہ حال کے تاریخ دان اصحاب بھی سلطان کو جابر اور ظالم قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا۔ کہ کسی بھی عالم دین کو بے وجہ قتل نہیں کیا گیا۔

جدید تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سلطان بے حد اسلام کا شیدائی تھا۔ دکن اور ملک کے دوسرے اطراف میں تبلیغ دین کے وسائل اور ذرائع پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی۔ کہ اسلام ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل جائے۔ عوام کو مشرف بہ اسلام کر کے اپنا حامی اور مددگار بنائے۔ اس کا خیال تھا کہ دہلی میں مقیم رہنے کے بجائے علماء کو ملک کے مختلف اطراف میں دین کی تبلیغ میں زوردار حصہ لینا چاہئے۔ کیونکہ علماء سرکاری وظائف پر ایک ہی شہر میں رہتے رہتے آرام کے عادی ہو چکے تھے۔

مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود سلطان شرع اسلام کے خلاف نہ تھا۔ وہ عموماً صائب الرائے علماء کے مشوروں پر بھی عمل کرتا تھا۔ لیکن محکمہ انصاف میں علماء کی اجارہ داری کے خلاف ضرور تھا۔ بعض مورخین کا یہ الزام بالکل حقیقت کے منافی ہے۔ کہ سلطان نے مشائخ اور علماء پر بے جا سختی روا رکھی ہے۔

قتل علماء کی وجوہ:۔ شیخ ہود جو کہ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے تھے۔ اس لئے قتل کرایا گیا۔ کہ انہوں نے سو گاؤں پر مشتمل جاگیر کو تبلیغی کاموں پر خرچ کرنے کے بجائے ذاتی اور موروثی جاگیر سمجھ لیا تھا۔

(۲) شیخ شمس الدین کو اس لئے قتل کرایا گیا۔ کہ انہوں نے اپنی مجلس میں ایک باغی امیر کی تعریف کرتے ہوئے سلطنت کے اہل قرار دیا تھا۔

اسی طرح شیخ حیدری کو بھی حکومت کے خلاف ایک سازش کے جرم میں موت کی سزا دی گئی۔

Marfat.com

ـــــ ہم نے آپ کے سامنے تاریخی حقائق اور تاریخ دان حضرات کے نظریات مختلف کتب سے فراہم کر کے رکھ دیئے ہیں۔ آپ خود اندازہ لگالیں۔ کہ سلطان کس حد تک علماء اور صوفیاء کے خلاف تھا۔ جبکہ تبلیغِ دین کے ضمن میں بھی اسکی کافی سے زیادہ خدمات بھی تاریخی کتب میں ملتی ہیں۔ ویسے کوئی انسان بے عیب اور گناہوں سے مبّرا نہیں ہے۔ سلطان بھی تو انسان ہی تھا۔ آخر میں سلطان کے مذہب پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

سلطان راسخ العقیدہ سُنی مسلمان تھا۔ نوافل اور نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کرتا تھا مے نوشی اور ہر قسم کے فواحشات اور منکرات سے اجتناب کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے شراب نوشی کے جرم میں ایک امیر کی جائداد ضبط کر لی تھی۔ بقول ابن بطوطہ شرعی احکام پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اور شرع اسلامی کا اس حد تک پابند تھا۔ کہ کسی کو موت کی سزا دینے سے پہلے قاضی شرع سے باقاعدہ فتویٰ طلب کرتا تھا۔

س ۶:۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے نظم و نسق کو شریعت کے ہم آہنگ کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے۔ ان کا کیا نتیجہ نکلا۔

جواب۔ سلطان فیروز شاہ اپنے قول و فعل میں راسخ اور دیانت دار تھا۔ اور بلاشبہ عوام کا خیر خواہ تھا۔ اس سے قبل یا بعد سلطنت دہلی کے کسی سلطان نے بھی اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے اس جیسا کام نہیں کیا۔ اس کے نظام مالیہ سے نہ صرف زراعت ترقی پذیر ہوئی۔ بلکہ عوام خوشحال اور فارغ البال ہو گئے۔ (سری واستوا)

اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے اور شریعت کے ہم آہنگ کرنے کے بارے اس نے کئی احکام نافذ کئے۔ جن سے رعایا خوش حال ہو گئی۔ اور سلطان مقبول عوام ہو گیا۔ یہ تمام احکام فتوحات فیروز شاہی میں درج ہے۔ چند ایک درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ملک مقبول کو خانِ جہاں کے خطاب سے نوازا ۔ اور وزیر مقرر کیا۔

۲۔ سلطان نے وہ تمام رقوم معاف کر دیں۔ جو خان احمد ایاز نے اپنی حیثیت مضبوط کرنے کے لئے بے دریغ خرچ کیں تھیں۔

۳۔ رعایا کی خوش حالی اور فارغ البالی کے پیشِ نظر خراج۔ زکوٰۃ اور خمس کے علاوہ تمام غیر

Marfat.com

شرعی محصولات منسوخ کر دیئے۔

۴۔ رعایا سے مشفقانہ اور رحمدلانہ سلوک روا رکھا۔ خوفناک اور وحشیانہ سزائیں کلی طور پر ختم کر دیں۔

۵۔ حکومت کے تمام سابقہ واجب الادا قرضے معاف کر دیئے۔ عورتوں کا مزاروں اور میلوں پر جانا ممنوع کر دیا۔ (شریعت کے مطابق)

۶۔ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔ (شریعت کے مطابق)

سلطان فیروز شاہ کو اللہ تعالٰے نے امور جہاں بانی میں وافر استعداد عنایت فرمائی تھی۔ اس لئے سلطان نے امن و امان قائم کر کے عوام کو اقتصادی طور پر خوشحال کر دیا تھا۔ اسے ہر حال میں رعایا کی بہبودی منظور تھی۔ جس کی وجہ سے وہ عوام غیر معمولی طور پر مقبول ہوا۔

مالی اصلاحات شرعی طور پر:۔ سلطان سے پہلے بہت سے غیر شرعی محصول عوام سے وصول کئے جاتے تھے۔ سلطان نے یکقلم اُن سب محصولات کو معاف کر دئیے۔ مکمل تحقیقات کے بعد صرف پانچ قسم کے محصول جن کی شریعت اجازت دیتی تھی۔ روا رکھے۔

۱۔ خراج:۔ زرعی زمینوں کی پیداوار پر وصول کیا جاتا تھا۔ یہ پیداوار کا پانچواں حصہ تھا۔

۲۔ عُشر:۔ یہ محصول ۱/۱۰ حصہ ہوتا ہے۔ جو کہ اُن زمینوں پر لاگو ہوتا تھا۔ جو علماء صوفیاء کو حکومت کی طرف سے بطور امداد ملتی تھیں۔ بنجر اور غیر آباد کرنے پر بھی یہ محصول عائد کیا جاتا تھا۔

۳۔ زکوٰۃ:۔ زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن ہے۔ یہ محصول صرف مسلمان رعایا پر ہی لگایا جاتا تھا۔ جو کہ سالانہ جائز اخراجات کے بعد بچ جانے والی رقم پر ایک سال گذرنے پر لگایا جاتا تھا۔ اسکی مقدار ڈھائی فی صد ہوتی تھی۔ زکوٰۃ کی جملہ رقوم حکومت خیراتی کاموں پر خرچ کرتی تھی۔

۴۔ جزیہ:۔ یہ ایک ایسا محصول تھا۔ جو اسلام نے ایران سے اخذ کیا تھا۔ ایرانی زبان میں اسے گزیت کہتے ہیں مگر گزیت ہی عربی زبان میں جزیت (جزیہ) کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ ایرانی غیر ایرانیوں یا زیر حفاظت افراد پر عائد کرتے تھے۔ اسلام نے

Marfat.com

محصول کی روح برقرار رکھتے ہوئے غیر مسلم اقوام سے ان کی حفاظت کے عوض میں وصول کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ محصول جبری طور پر وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ غیر مسلم جو اسلام کی فوج میں بھرتی ہو کر دفاع وطن میں شریک ہوتے تھے۔ ان سے یہ محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ انہیں تنخواہ کے علاوہ باقی تمام رعایات میسر ہوتی تھیں۔ بچے، بوڑھے۔ عورتیں، بیمار۔ غلام۔ دیوانے اس محصول کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے۔ آغاز کار میں سلطان نے جزیہ برہمنوں سے بھی وصول کرنا شروع کیا۔ برہمنوں کے احتجاج پر سلطان نے برہمنوں کو اس محصول سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور ساتھ ہی اس کا بوجھ ہندوؤں پر بھی ہلکا کر دیا۔

سلطان نے کئی غیر اسلامی محصول معاف کر دیئے۔ وہ ایسے محصول تھے۔ جو شہری آبادی پر لگائے جاتے تھے۔ یہ محصول مختلف کاریگروں پر لگائے جاتے تھے۔ مثلاً صناع۔ صابن بنانے والے تیل نکالنے والے۔ گل فروشوں اور ماہی فروشوں پر لگائے جاتے تھے۔ اُن کے علاوہ ریڑھی والوں پر ٹیکس عائد تھا۔ چرائی پر ٹیکس تھا۔ جو دیہاتی آبادی پر لگائے جاتے تھے۔ سلطان نے یکسر معاف کر دیئے۔ ان متعدد محصولات کی کمی سے رعایا کے چھوٹے چھوٹے طبقوں خصوصاً دستکاروں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ نتیجے کے طور پر رعایا خوشحال ہو گئی۔

ان محصولات کو شرعی حیثیت دینے کے بعد سلطان نے جاگیرداری نظام کو یکقلم بدل دیا۔ یہ جاگیرداری نظام علاء الدین اور محمد تغلق کے زمانے میں رائج تھا۔

زمین کو زیر کاشت لانا بھی عین شریعت کے مطابق ہے۔ سلطان نے زمینوں کی زرعی حالت درست کرنے کے لیے کنوئیں کھدوائے۔ نہریں جاری کیں۔

عدل و انصاف کے ضمن میں ہر مقدمے کا اسلامی رواج کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا۔ مفتی شرعی فتویٰ صادر کرتا تھا۔ اور قاضی فیصلہ سناتا تھا۔

سلطان نے مستقل فوج رکھی۔ دفاع کی خاطر ہر وہ طریقہ شریعت میں جائز ہے۔ جس سے خدا کا دشمن اور مسلمانوں کا بدخواہ لرز اٹھے۔

مذہبی طور پر سلطان شرعی قوانین کا پابند تھا۔ وہ علماء کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیتا تھا۔ مشائخ سے نہایت عزت اور احترام سے ملتا تھا۔ گویا کہ اس کی حکومت

Marfat.com

شرعی قوانین کے مطابق تھی۔ اس نے اشاعت اسلام کے لئے ہر امکانی کوشش کی۔ غیر شرعی باتوں کو ممنوع قرار دیا۔ شرعی قوانین کے رائج کرنے کا نتیجہ بہت اچھا نکلا۔ رعایا خوش حال اور فارغ البال ہوگئی۔

س ۳:۔ سکندر لودھی کے کردار۔ پالیسی اور کارناموں کا جائزہ لیجئے۔

جواب:۔ سکندر لودھی ۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۷ء۔ سلطان بہلول لودھی کی وفات کے بعد امرائے دربار نے اس کے تیسرے بیٹے نظام خان کو تخت نشین کیا۔ لیکن بعض امرا نے اس انتخاب کی سخت مخالفت کی۔ کیونکہ وہ ایک سنار زادی کے بطن سے تھا۔ انہوں نے اس کے بڑے بھائی باربک خان حاکم جون پور کا نام تجویز کیا۔ لیکن خان خاناں اور دوسرے امرا کی حمایت پر نظام خان کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے ۱۷ جولائی ۱۴۸۸ء کو اپنی تاجپوشی کی رسم بڑی شان و شوکت سے ادا کی۔ اور امراء دربار کو انعام و اکرام سے نوازا۔

سکندر لودھی کے کارنامے اور کردار:۔ کردار:۔ سکندر لودھی خاندان کا ایک عظیم المرتبت بادشاہ تھا۔ بعض تاریخ نویس اسکی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔ کہ وہ بڑا عقلمند۔ عدل گستر۔ شفقت کرنے والا اور خدا ترس حکمران گذرا ہے۔ وہ ایک بہادر اور دلیر سپاہی تھا۔ اس نے تقریباً سو سال کے انتشار اور ابتری کے بعد پنجاب سے لے کر بہار اور کوہ ہمالیہ سے مالوہ تک کے علاقوں کو سلطنت دہلی کے زیر نگیں کیا۔ فیروز خلجی کے بعد وہ پہلا بادشاہ تھا۔ جس نے پاک و ہند کے شمالی حصے کے بیشتر رقبے کو قلمرو دہلی میں شامل کیا۔ اور سلطنت کے وقار رفتہ کو بحال کیا۔ امور ملک کی اصلاح کر کے سارے ملک میں نظم و نسق اور امن و امان کو بحال کیا۔ اور سرکش افغان امراء کو حکومت کے احتساب کا پابند کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ شاہی فرمانوں کی اطاعت کریں۔ اور استقبال کے طور پر انہیں بڑھ کر بنائے جانے کے موقع پر ایک دربار منعقد کیا کریں۔ تاکہ وہ صوبوں اور پرگنوں کو ذاتی جاگیر خیال کرنا شروع نہ کر دیں۔ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرنا شروع کیا۔ اس نے خفیہ اطلاعات کا محکمہ کچھ اس انداز سے قائم کیا۔ کہ اسے رعایا اور فوج کے جملہ حالات معلوم ہو جاتے تھے اور عوام اس کے باخبر ہونے پر حیران ہوتے تھے۔ اور لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا۔ کہ جن اس کے ماتحت ہیں۔ جو اسے ہر وقت آگاہ کر دیتے ہیں۔ اسے اپنی رعایا کی

Marfat.com

فلاح وبہبود کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ ہر روز غربا میں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ سردی کے دنوں میں کمبل وغیرہ بانٹے جاتے تھے۔ بہت سے حق دار لوگوں کے وظائف مقرر تھے۔ وہ اس قدر خداترس اور انصاف پسند تھا۔ کہ دولتمند کو غریب پر۔ طاقتور کو کمزور پر ظلم کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ کوئی آدمی عدل کے تقاضوں سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے زمانۂ اقتدار میں اشیاء صرف بہت سستی تھیں۔ رعایا خوش حال تھی۔ غلے کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر چونگی کا محصول منسوخ کر دیا تھا۔ تاکہ غلہ اور زیادہ ارزاں ہو جائے۔

اس کے دربار میں نامشروع امور کی اجازت نہیں تھی۔ رات گئے تک سلطنت کے امور سرانجام دیتا رہتا تھا۔ آدھی رات کو کھانا کھاتا اور پھر علماء اور مشائخ سے مذہبی معاملات میں تبادلہ افکار کرتا۔ اور مشائخ ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا۔ مورخین اسکی ذہانت کی داد دیتے ہیں۔ فیروز تغلق کے بعد وہ دہلی کا کامیاب ترین حاکم تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ گلرخی تخلص کرتا تھا۔

کارنامے:۔ (۱) **بغاوتوں کا انسداد:۔** تخت نشین ہوتے ہی سکندر لودھی کو بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس نے اپنی خداداد استعداد سے باغیوں کی سختی سے گوشمالی کی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے بھائی عالم خان کے خلاف فوج کشی کی۔ تو وہ بھاگ کر عیسیٰ خان حاکم پٹیالی کے پاس چلا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد سکندر نے اپنے بھائی کے ساتھ صلح کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ بعد ازاں عیسیٰ خان کو زخمی کر دیا۔ وہ مر گیا۔ جون پور کے حاکم باربک خان نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ سکندر نے اسمٰعیل لوہانی کے ذریعے باربک خان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ سکندر نے حملہ کر دیا۔ باربک کا سپہ سالار کالا پہاڑ گرفتار ہو گیا۔ شاہ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اس نے باربک کے خلاف لڑائی کی۔ باربک کو شکست ہوئی۔ لیکن سکندر نے فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے جون پور کی حاکمیت پر بحال رکھا۔ چند افغان امراء کو اس کا مشیر مقرر کیا۔ لیکن باربک نااہل ثابت ہوا۔ سلطان کے چلے جانے کے بعد علاقے کے زمینداروں نے اس انداز سے بغاوت شروع کی۔ کہ باربک حالات پر قابو نہ پا سکا۔ جون پور چھوڑ کر دریاآباد میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ سلطان کو باغی سرداروں کے خلاف خود میدان جنگ میں آنا پڑا۔ باغیوں کا

Marfat.com

قلع قمع کرنے کے بعد پھر باربک کو حاکم مقرر کر دیا۔ لیکن اس کے نااہل ثابت ہونے پر قید کر دیا۔ بعد ازاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن اس کے نااہل ثابت ہونے پر قید کر دیا۔ بعد ازاں اپنا گورنر مقرر کر دیا۔

سلطان حسین شاہ شرقی والئے بہار نے جون پور کے زمینداروں کی بغاوت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ سلطان نے اسے بنارس کے قریب زبردست شکست دی۔ وہ بنگال بھاگ گیا۔ شاہی فوجوں نے بڑھ کر بہار پر قبضہ کر لیا۔ سلطان نے جون پور پر دریا خان لوہانی اور ترہٹ پر اپنے لڑکے اعظم خان کو حاکم مقرر کیا۔ سلطان بنگال کی طرف بڑھا۔ والئے بنگال نے صلح کر لی۔

فتوحات :- ۱۵۰۲ء میں سلطان نے دھولپور پر فوج کشی کی۔ راجہ نے گوالیار میں پناہ لی۔ سلطان نے گوالیار پر حملہ کیا۔ راجہ مان سنگھ نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے کالپی اور بیانہ کے علاقوں کو بھی فتح کیا۔ مالوہ کو فتح کیا۔ اور چندیری کو بھی زیر نگین کیا۔

اصلاحات :- سلطان نے انتظام سلطنت کی اصلاح کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ اطراف سلطنت میں امن و امان قائم کیا۔ صوبائی گورنروں پر اپنا قبضہ جاری رکھا۔ باغیوں اور راہزنوں کا سختی سے محاسبہ کیا۔ ذرائع آمد و رفت کو درست کیا اور محفوظ کیا۔ محکمہ پولیس کی از سر نو تنظیم کی۔ شاہراہوں پر جا بجا ڈاک کا انتظام کیا۔ تجارت اور زراعت کی ترقی کے لئے محصول چونگی معاف کر دیا۔ باغی امراء کے حالات معلوم کرنے کے لئے خفیہ افراد کا انتظام کیا۔ جاسوس ہر وقت حالات سے سلطان کو باخبر رکھتے تھے۔ الغرض رفاہ عامہ کے لئے بہت سے مفید کام کئے۔

امراء پر سختی :- بغاوتوں کو فرو کرنے کے بعد سلطان نے امراء کو اپنا اطاعت گزار بنانے کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ حسابات کی سختی سے جانچ پڑتال شروع کی۔

ایک دفعہ چوگان بازی کے دوران امراء کے درمیان لڑائی کرنے والے افغان کو اپنے سامنے عبرتناک سزا دلوائی۔

امراء کو مجبور کیا کہ وہ امور سلطنت میں بادشاہت کا وقار بحال رکھیں۔

بائیس افغان امراء نے سلطان کی سختیوں سے تنگ آکر اس کے بھائی فتح خان کو بادشاہ بنانا چاہا۔ سازش کا پتہ چل گیا۔ سلطان نے امراء کو دہلی بھجوا دیا۔

Marfat.com

اس سخت گیر انہ برتاؤ سے تمام افغان امراء شاہی نظم وضبط کے اندر آگئے اور شاہی وقار اور احترام بحال ہوگیا۔

آگرہ کی تعمیر:۔ ۱۵۰۴ء میں سلطان نے شہر آگرہ کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ اسے دارالسلطنت کا درجہ دیا گیا۔ شاہی عمارات اور فوجی چھاؤنی کی تعمیر از سر نو کی۔ تاکہ شرقی اور غربی راجپوتانے کے علاقوں پر اچھی طرح نگرانی ہو سکے۔ ۱۵۰۵ء کے زلزلے میں عمارات کو نقصان پہنچا لیکن اسی سال دوبارہ تعمیر کی گئی۔ اور سلطان نے آگرے میں رہنا شروع کیا۔

مذہب:۔ سلطان سُنی عقائد کا پیرو تھا۔ اس کی ذاتی زندگی بڑی ستھری اور پاکیزہ تھی۔ شعائر اسلامی کا بڑا سختی سے پابند تھا۔ علماء اور مشائخ کا بڑا قدردان تھا۔ غیر شرعی رسُوم کو مٹانے کی کوشش کی۔

س ۵ :۔ سلاطین دہلی کے ماتحت صوبائی نظم ونسق کا حال لکھیئے۔

جواب۔ سلطنت دہلی کی صوبائی حکومتیں علی العموم مرکزی حکومت کے مانند تھیں۔ صوبے کا حاکم (گورنر) سلطان کا نائب کہلاتا تھا۔ وہ نظم ونسق کا ناظم اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ صوبائی حکومت کے کئی ایک شعبے مرکزی شعبوں کی طرح تھے۔ اُن کے اصول بھی ویسے ہی تھے۔ ان شعبوں میں مرکزی حکومت کی نگرانی اور مرکزی وزراء و حکام کا اقتدار تھا۔ دور دراز کے صوبے عام طور پر خود مختار خیال کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں چونکہ ذرائع آمد و رفت اور وسائل رسل و رسائل محدود تھے۔ اس لئے صوبوں کے حکام کو گورنروں سے زیادہ اختیار حاصل تھے۔ قاضیوں اور مالگذاری کے افسروں کا تقرر بادشاہ کے اختیار میں تھا۔ گورنروں کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوتے تھے۔

ضیاء الدین برنی:۔ والی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور مُقطع بھی کہلاتا تھا۔ محمد تغلق کے زمانے میں مُقطع کو امیر کہنے لگے۔ اور لودھیوں کے زمانہ اقتدار میں صوبائی حاکم کو شقدار کہتے تھے۔ سلطنت دہلی کی تاریخ میں صوبوں کا نام استعمال نہیں ہوتا۔ پھر بھی انتظامی سہولت کے پیش نظر سلطنت دہلی متعدد اقطاع میں منقسم تھی۔ جن پر فوجی حکام مقرر تھے۔ خاندان غلاماں کے ماتحت تمام سلطنت ۱۲ اقطاع میں بٹی ہوئی تھی۔ خلجی دور میں بھی اقطاع بدستور قائم رہے۔

گورنر کے عہدہ پر سلاطین ہمیشہ آزمودہ کار اور معتبر امیر کو مقرر کرتے تھے۔ اُمید کی جاتی تھی۔ کہ

Marfat.com

وہ اہلکاروں کی سرپرستی اور حفاظت۔ بغاوتوں کا انسداد۔ عوام کی فلاح و بہبود کا اہتمام اور عدل گستری کا انتظام ہمیشہ مرکز کے نمونے پر کریں گے۔ ہر صوبے میں ایک صاحب دیوان ہوتا تھا۔ جسے خواجہ کہتے تھے۔ اس کا تقرر وزیر کی سفارش پر بادشاہ خود کرتا تھا۔ جس کے فرائض میں صوبائی آمدن اور خرچ کا مفصل اور باقاعدہ حساب مرکز کو بھیجنا ہوتا تھا۔ گورنر اس کے کام میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ اب ہم انتظام کے بارے مختلف امور کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ شق :۔ صوبے کو شقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور حاکم کو شقدار کہتے تھے۔ تقسیم شق دار وسیع صوبوں کی ہوتی تھی۔ مثلاً محمد تغلق نے دکن کو چار شقوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ شقدار ایک فوجی افسر ہوتا تھا۔ جو شق میں امن وامان کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

۲۔ پرگنہ :۔ انتظام کی چھوٹی وحدت کو پرگنہ کہتے تھے۔ جو شق سے چھوٹی ہوتی تھی۔ اور کم از کم سو دیہات پر مشتمل ہوتا تھا۔ پرگنوں کا انتظام اور دیہات سے مالیہ وصول کرنے کا اہتمام ہندو مقدموں اور چوہدریوں کے سپرد ہوتا تھا۔ ہر پرگنہ میں ایک چوہدری (عوام کا نمائندہ) اور ایک متصرف (سرکاری نمائندہ) ہوتا تھا۔

۳۔ دیہات :۔ سب سے چھوٹا حلقہ دیہات کہلاتا تھا۔ جہاں پنچایت نزاعی امور کا فیصلہ کرتی تھی۔ دیہات کے انتظام میں مقدم۔ چوکیدار اور پٹواری مقرر ہوتے تھے۔

۴۔ ذرائع آمدن :۔ سلطنت کا مالی نظام شریعت کے مطابق تھا۔ جو کہ خلافت عباسیہ کی روایات اور مقامی اصول پر مبنی ہوتا تھا۔ آمدن کے ذرائع درج ذیل تھے۔

۱۔ لگان اراضی :۔ قرون وسطی میں حکومت کا سب سے بڑا ذریعہ آمدن مالیہ تھا۔ جو کہ زمین کی پیداوار پر لگایا جاتا تھا۔ جس کی دو قسمیں خراج اور عشر شریعت کے اصولوں کے مطابق وصول کیے جاتے تھے۔

۲۔ عشر :۔ یہ محصول اس زمین پر لگایا جاتا تھا۔ جسے مسلم کاشت کرتے تھے۔ جس کی شرح کل پیداوار کا دسواں حصہ تھی۔

۳۔ خراج :۔ اس زمین پر لگایا جاتا تھا۔ جسے غیر مسلم کاشت کرتے تھے۔ جس کی شرح ۲۰ فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک ہوتی تھی۔ اس کے وصول کرنے کے دو طریقے تھے۔

۱) حکم مساحت۔ زمین کی پیمائش کی جاتی تھی۔ اور گذشتہ سالوں کی پیداوار کی بنیاد پر قیمت لگا

Marfat.com

اندازہ لگایا جاتا تھا۔ اور حکومت کا حصہ متعین کر لیا جاتا تھا۔ (۲) حکم حاصل۔ تجربہ کار لوگ کھڑی فصل کی قیمت کا اندازہ لگا کر حکومت کا حصہ مقرر کر لیتے تھے۔ مختلف ادوار میں اس کچھ نہ کچھ رد و بدل بھی ہوتا رہا ہے۔ قحط یا خشک سالی کی صورت میں مالیہ یا مالیے کا کچھ حصہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ مالیہ نقدی اور جنس دونوں صورتوں میں وصول ہوتا تھا۔ مالیہ وصول کرنے والوں کو حکومت کی طرف سے عوضانہ بھی ملتا تھا۔

۴۔ زکوۃ :۔ یہ اسلام کا رکن ہونے کی وجہ سے صرف مسلم حضرات سے وصول کی جاتی تھی۔ اسکی شرح اسلام کی مقرر کردہ تھی۔ جس میں کمی یا بیشی ممکن نہ تھی۔ زکوٰۃ کی آمدن کو عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ فیروز تغلق کے زمانے میں حکومت خود وصول کرتی تھی۔ اور ایک الگ محکمہ تھا۔

۵۔ جزیہ :۔ یہ ایک اسلامی محصول تھا۔ جو غیر مسلم رعایا سے وصول ہوتا تھا۔ یہ محصول تمام سلاطین دہلی کے زمانے میں وصول کیا جاتا رہا۔ اس کے عوض میں غیر مسلم رعایا کی جان و مال اور عزت آبرو کی ذمہ دار حکومت ہوتی تھی۔ اور مذہبی آزادی کی بھی ذمہ دار ہوتی تھی۔ یہ محصول ان جوان غیر مسلم باشندوں سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ جو رضاکارانہ طور پر اسلامی فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ انہیں باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ اور ہر رعائت کے حقدار تھے۔ بچے۔ بوڑھے۔ اپاہج۔ عورتیں۔ مذہبی پیشوا اس محصول سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ اسکی تین شرحیں تھیں (۱) دولت مند لوگوں سے ۴۸ تنکے سالانہ۔ (۲) متوسط سے چوبیس تنکے سالانہ (۳) ادنیٰ طبقہ سے بارہ تنکے سالانہ۔

۶۔ عشور :۔ یہ وہ محصول تھا۔ جو سرحدی چوکیوں پر ملکی تجارت پر لگایا جاتا تھا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق اس محصول کی شرح ۲۵ فیصدی تھی۔ محمد تغلق نے ۲۰ فیصدی کر دی بکندر لودھی نے یکسر ختم کر دی۔

۷۔ مال غنیمت :۔ میدان جنگ میں چھوڑا ہوا سامان جو فاتح کے ہاتھ آتا ہے۔ سلاطین کے زمانے میں مال غنیمت کا پانچواں حصہ شاہی خزانے میں چلا جاتا تھا۔ باقی چار حصے فوج میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ علاء الدین نے اس کی شرح میں تبدیلی کر دی۔ لیکن فیروز شاہ نے علماء کے اعتراض پر پہلی شرح بحال کر دی۔

Marfat.com

۸۔ تحائف :۔ سلطان کی آمدن کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی سفیروں سے تحائف وصول کرنا بھی تھا۔

۹۔ مدفون خزانے :۔ لاوارث جائدادیں۔ کانیں۔ کانوں کی آمدنی کا پانچواں حصہ شاہی خزانے میں داخل کیا جاتا تھا۔ لاوارث جائدادیں سب کی سب سلطان کے قبضے میں جاتی تھیں۔ مدفون خزانوں کا پانچواں حصہ حکومت کی ملکیت ہوتا تھا۔

فوجی نظام :۔ ہر سلطنت کے استحکام کا مدار افواج کے استحکام پر ہوتا ہے۔ یہی حال سلطنت دہلی کا بھی تھا۔ چونکہ ہر وقت بیرونی حملوں کا خدشہ سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ اور داخلی طور پر بھی حکومت کو بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آبادی زیادہ غیر مسلم ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ جنہوں نے کسی طرح بھی مسلم حکمرانوں کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ مسلمان حاکموں کو غاصب خیال کرتے تھے۔ صرف حکومت کے ڈر سے خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ جب کبھی انہیں موقع ملتا شورش برپا کر دیتے تھے۔ محصولات کی وصولی میں بھی کئی ایک دقتیں ہوتی تھیں۔ سلاطین وسعت پذیری کے دلدادہ تھے ان تمام وجوہ کے پیش نظر ایک منظم اور مضبوط فوج کا ہونا از بس ضروری تھا۔

آئینی اعتبار سے سلطان ہی سالار اعظم ہوتا تھا جس میں عسکری مہارت سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ فوجی امور میں سلطان کا ایک معاون یا مشیر ہوتا تھا۔ جسے نائب الملک کہتے تھے۔ محکمہ دفاع کا افسر اعلیٰ دیوان عرض یا عارض ممالک کہلاتا تھا۔ جس کے فرائض میں فوجوں کا نظم ونسق معائنہ وغیرہ شامل تھے۔ دیوان عرض ہر سپاہی کا حلیہ اور پتہ درج ہوتا تھا۔ علاءالدین خلجی گھوڑوں کو داغ لگانے کا طریقہ بھی شامل کیا۔ تاکہ گھوڑوں کو بدلا نہ جا سکے۔ افواج کی چار قسمیں تھیں۔

۱۔ مستقل مرکزی فوج :۔ جو دارالسلطنت میں بادشاہ کی زیر نگرانی ہوتی تھیں۔

۲۔ مستقل صوبائی فوج :۔ جو کہ صوبے کے گورنر کے ماتحت ہوتی تھی۔

۳۔ رنگروٹ :۔ جو وقتی طور پر بھرتی کیے جاتے تھے۔ (Recruit)

۴۔ مجاہدین :۔ جو جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔ صوبجات یا مختلف مقامات پر متعینہ افواج کو حشم اطراف کہتے تھے۔ جنگی قلعے۔ فوجی چھاؤنیاں اور تربیت یافتہ فوج ہر وقت تیار رہتی تھی۔ فوج مختلف شعبوں میں بٹی ہوئی تھی۔

۱۔ سوار فوج۔ اہم اور مؤثر ترین فوج سوار فوج ہوتی تھی۔ آجکل جسے رسالہ کہتے ہیں۔ سلطان کی

Marfat.com

فوج کا اندازہ گھوڑوں کے دستوں سے لگایا جاتا تھا۔ اسلحہ میں دو تلواریں۔ ایک خنجر۔ ایک تیر کی کمان اور ترکش ہوتا تھا۔ رسالہ یک اسپہ۔ دو اسپہ۔ سہ اسپہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

۲۔ **پیادہ فوج**:۔ سوار فوج کے بعد پیادہ فوج تھی۔ جسے پائک کہتے تھے۔ ان میں تیر انداز بھی ہوتے تھے جنہیں دھانک کہتے تھے۔ پیادہ فوج میں زیادہ تر ہندو۔ غلام۔ اور ادنیٰ طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ جنہیں گھوڑا رکھنے کی طاقت نہ ہوتی تھی۔ یہ فوج داخلی سازشوں کو کچلنے کے کام آتی تھی۔

۳۔ **جنگی ہاتھی**:۔ پرانے زمانے میں ہاتھی بھی فوج کا ایک حصہ ہوتے تھے۔ اس امر کی اہمیت واضح تھی۔ ہاتھیوں کو وہی مرتبہ حاصل تھا۔ جو آجکل ٹینکوں کو ہے۔ ہاتھی پر متعدد سپاہی تیر و کمان اور دوسرے اسلحے سے آراستہ ہو کر لڑتے تھے۔ پیادہ اور رسالے پر تیروں کی بارش کر دیتے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے نزدیک ہاتھی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ محمد تغلق کی فوج میں تین ہزار ہاتھی تھے۔ شاہی ہاتھیوں کا نگران شحنہ فیل کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں ہاتھی کی قیمت سات آٹھ ہزار ہوتی تھی۔ الغرض ہاتھیوں کا وجود فوج کے ضمن میں واضح ہے۔

س ۹:۔ سلاطین دہلی کے ساتھ خلافت عباسیہ کے جو روابط تھے۔ اُن کا مربوط حال لکھیئے۔ ان روابط کی خاص اہمیت کیا تھی؟

جواب۔ اگرچہ ترکوں کی خلافت اور ہلاکو خان کے حملے کے بعد خلافت بغداد کی وہ پہلی سی حیثیت نہیں رہی تھی۔ جو ہارون الرشید اور مامون رشید کے زمانے میں تھی۔ مگر پھر بھی اپنی سیاسی شان برقرار رکھنے کے لئے سلاطین دہلی خلافت بغداد کو اصلی اور جائز حکومت سمجھتے تھے اگرچہ اسوقت خلیفہ بغداد اپنی سیاسی حیثیت کھو بیٹھا تھا۔ مگر اسلامی دُنیا میں اب بھی مذہبی پیشوا اور جائز خلیفہ مسلمین خیال کیا جاتا تھا۔ اور خلیفہ کی سند قبولیت کے بغیر کسی حکومت کی حیثیت کو آئینی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

اسی غرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے سلطان التتمش نے ۱۲۲۸ء میں ناصر الدین قباچہ کو شکست دینے کے بعد ان تمام علاقوں کو زیر نگیں کر لیا۔ جو کسی زمانے میں قطب الدین ایبک کے زیر نگیں تھے۔ اس طرح سلطان کی عسکری شہرت اور شاہی وقار کی دھاک بیٹھ گئی۔ اب اس نے اپنے سفیر

Marfat.com

کے ذریعے خلیفہ بغداد کے پاس کشور ہند کی سلطانی کی توثیق کے لئے درخواست بھیجی۔ ۱۸ فروری ۱۲۲۹ء
کو خلیفہ بغداد ابو منصور المستنصر باللہ کا سفیر اس (سلطان التمش) کے لئے فرمان روائی کی سند
لے کر دہلی پہنچا۔ سفیر کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ دارالحکومت دہلی عمدہ طریقوں سے سجایا گیا۔
اور سرکاری طور پر مسرت اور شادمانی کے اظہار کے لئے دربار عام منعقد کیا گیا۔ اس شاہانہ تقریب مسرت
میں خلیفہ اسلام کا جاری کردہ سلطانی منشور پڑھ کر سنایا گیا۔ اور خلیفہ بغداد نے سلطان کو ایک خلعت،
سلطانی منشور کے علاوہ روانہ کیا تھا۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت تھا۔ کہ دربارِ خلافت نے التمش کی
آئینی حیثیت اسلامی دنیا کی نظروں میں مستحکم ہو گئی۔

اگرچہ محمد تغلق عدل گستر اور فیاض ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی استعداد اور ذہانت کا بھی
مالک تھا۔ لیکن باوجود ان تمام صفات کے وہ عوام میں غیر مقبول ہو رہا تھا۔ جب اس نے اپنی غیر
مقبولیت کو دیکھا۔ تو اس نے خیال کیا۔ کہ اس سے عوام کی بے تعلقی اور بے زاری شاید
شرع اسلامی سے بیگانگی اور علماء و مشائخ پر تشدد کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کے دل میں
خیال آیا۔ کہ فی الحقیقت از راہ شرع شریف اسلامی دنیا پر حکومت کرنے کا حق خلیفۃ المسلمین
کو ہے۔ جو اس وقت خلیفہ بغداد تھا۔ اور بغداد میں خلفاء عباسی کی خلافت تھی۔ لہٰذا خلیفہ
عباسی کی اجازت کے بغیر اسکی حکومت کی شرعی حیثیت کمزور اور غیر مسلمہ ہے۔ چنانچہ اس
نے ایک قاصد کے ذریعے خلیفہ عباسی کی طرف سلطانی ہند کے لئے درخواست بھیجی۔ اگرچہ
تغلق خاندان کے زمانے میں خلیفہ بغداد کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ وہ سیاسی اعتبار
سے مصر کے مملوک فرمانرواؤں کے زیر اثر تھا۔ جب خلیفہ کا نامہ بر منشور اور خلعت لے کر
آیا تو سلطان نے برہنہ پا ہو کر اس کا استقبال کیا۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے۔ خلافت
بغداد کے ساتھ سلاطین ہند کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے خلافت بغداد کو
ہی اسلام کی آئینی اور جائز حکومت سمجھتے تھے۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ
سلاطین دہلی کے خلفاء عباسیہ کے ساتھ بڑے گہرے روابط تھے۔ وہ خلافت بغداد
کو ہی آئینی اور صحیح اسلامی حکومت خیال کرتے تھے۔

فیروز شاہ سلطان کے دربار میں بھی دو مرتبہ امیر المومنین خلیفہ عباسی کی طرف سے

Marfat.com

خلعت بادشاہی اولوالامری کا منشور اور سلطنت آئے۔ چنانچہ سلطان نے امیر المومنین کی ان نوازشات کی امکانی طور پر عزت کی۔ وہ خیال کرتا تھا۔ کہ یہ تمام اعزازات مجھے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ارزاں ہوئے ہیں۔ اس لئے ان نوازشات کی برکت سے جمعہ اور عید کی نمازوں میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ آسمانی بلاؤں یعنی قحط اور وبا کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ ان کی برکات اور فیوض سے ہر طرف امن وامان کا دور دورہ ہے۔ (تاریخ فیروز شاہی)

ان پرچہ جات کے حل کرنے کے لئے کئی ایک کتب زیر مطالعہ رہی ہیں۔ سیاسی واقعات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ انداز بیان میں فرق آجاتا ہے۔ واقعات کے بیان کرنے کو نقل پر ہی محمول نہ کیا جائے۔ بلکہ سیاسی حیثیت سے تنقید کی جائے۔

س نمبر۱۔ حسب ذیل میں کسی تین پر نوٹ لکھیں:

(۱) البیرونی۔ (۲) بختیار خلجی (ج) ابن بطوطہ۔ (د) رنتھمبور (۵) مبارک شاہ سید۔

(۱) **البیرونی:**۔ پورا نام ابوریحان البیرونی تھا۔ محمودی دربار کے علماء وفضلاء میں ابوریحان البیرونی کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ وہ ۹۷۳ء میں خوارزم کے نزدیک بیرون نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ خوارزم کی فتح کے بعد محمودی دربار سے وابستہ ہوا۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی اور عبرانی کے علاوہ سنسکرت زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ علم نجوم کا ماہر تھا۔ اور بے مثال ہیت داں تھا۔ اس نے تاریخ۔ ریاضی۔ ہیئت۔ جغرافیہ۔ طبیعات۔ کیمیا اور علم مدنیات پر قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے سنسکرت زبان بڑی محنت سے سیکھی۔ اور رسوم ہندوستان کے بارے کتاب الہند ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی جو ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔

البیرونی کی دوسری شہرہ آفاق کتاب قانون مسعودی ہے۔ جو نجوم اور ہیئت پر ایک مستند کتاب ہے۔ البیرونی دربار محمودی کا مقتدر عالم اور عظیم مورخ تھا۔ اور ہر فن مولا کے کردار کا حامل تھا۔

۲۔ **ابن بطوطہ:**۔ ابن بطوطہ کو قرون وسطیٰ کے مورخین کی صف اوّل میں بلند مقام حاصل ہے۔ وہ بیک وقت سیاح۔ عوام کا مزاج شناس۔ کردار نگار۔ عالم۔ فاضل

Marfat.com

انصاف وقائع نگار۔ بے باک نقاد۔ اور نامور مؤرخ تھا۔

اس کا اصل نام محمد بن عبداللہ تھا۔ وہ مراکش کے شہر طنجہ میں ۲۴ فروری ۱۳۰۴ء کو پیدا ہوا۔ علوم متداولہ کے حصول سے فارغ ہونے کے بعد ۲۱ برس کی عمر میں اس کے دل میں حج کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ ۱۴ جون ۱۳۲۴ء کو سفر حج پر روانہ ہوا۔ تیونس۔ لیبیا اور شمالی افریقہ کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کرتا ہوا مصر پہنچا۔ سکندریہ پہنچکر عازم حج ہوا۔ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد وہ ایک بہت لمبے سیاحتی سفر پر روانہ ہوا۔ چنانچہ عرب سے شام۔ ایشیائے کوچک۔ اور عراق کی سیاحت کرتا ہوا ایران پہنچا۔ ایران سے ہندوستان کا ارادہ کیا۔ ۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء کو سندھ پہنچا۔ سندھ سے ملتان اور دیپال پور پہنچا۔ ۱۳۳۴ء میں دہلی آیا۔ جہاں سلطان محمد تغلق سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس کی شہرت اس کے آنے سے پہلے دہلی پہنچ چکی تھی۔ سلطان نے اسکی آمد پر خصوصی مسرت کا اظہار کیا۔ دارالسلطنت میں اس کی اچھی طرح آؤ بھگت ہوئی۔ شرف باریابی کے بعد خلعت فاخرہ عنایت فرمائی۔ اس کی علمی وجاہت کے پیش نظر اسے دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔ قاضی کے منصب پر ابن بطوطہ نے آٹھ سال کام کیا۔

۱۳۴۱ء میں چین سے ایک سفارت آئی۔ چین کے بادشاہ نے گراں قدر تحفے بھیجے۔ چین سے روابط مستحکم کرنے کے لئے سلطان نے بھی ایک سفارت چین بھیجی۔ ابن بطوطہ سے بڑھ کر اور کوئی آدمی موزوں نہیں تھا۔ سلطان نے ۱۳۴۲ء میں سفیر بنا کر چین بھیجا۔ ۱۳۴۷ء میں چین سے روانہ ہو کر ۱۳۴۹ء میں واپس وطن پہنچ گیا۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۱۳۷۷ء میں وفات پائی۔

مبارک شاہ :۔ ۱۴۲۱ء لغایت ۱۴۳۴ء۔ سید خضر خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ تخت دہلی پر بیٹھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فہم و فراست کا پیکر تھا۔ اور بہادر سلطان تھا۔ مگر تخت اس کے لئے کانٹوں کی سیج ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے زمانے میں بغاوتیں اور شورشیں ہوتی رہی ہیں۔ یہ ان کے انسداد میں مشغول رہا۔

۱:۔ ۱۴۲۱ء میں جسرت کھوکھر نے سلطان خضر خان کی وفات کےبعد بغاوت کر دی۔ اس نے لدھیانہ سے دریائے ستلج تک کا علاقہ تاخت و تاراج کر کے سرہند کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن شاہی افواج سے

Marfat.com

مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے دریائے چناب کو عبور کر کے پہاڑی علاقے میں چلا گیا۔ پہاڑوں سے نکل کر اس نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن حاکم لاہور نے اسے بھگا دیا۔

۲۔ سلطنت میں ابتر حالت دیکھ کر ابراہیم شرقی نے دہلی فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ خود فوج لے کر کالپی کی طرف بڑھا۔ اور اپنے بھائی کو اٹاوہ کی طرف بھیج دیا۔ سلطان مبارک شاہ نے ملک محمود حسن کو ابراہیم شرقی کی طرف بھیجا۔ خود اس کے عقب میں روانہ ہوا۔ چند واڑہ کے مقام پر سخت لڑائی ہوئی۔ ابراہیم شرقی کو شکست ہوئی۔ اس لڑائی میں میوات کے سردار کا شرقی کے ساتھ گٹھ جوڑ تھا۔ سلطان مبارک شاہ نے اپنے وزیر ملک سرور کو روانہ کیا۔ لیکن وہ قابو نہ آیا۔

۳۔ ۱۴۲۹ء میں فولاد نامی ایک ترک سردار نے بغاوت کر کے بٹھنڈہ اور راپری پر قبضہ کر لیا۔ اپنی قوت بڑھانے کے لئے پنجاب کے کھوکھروں اور کابل کے نو مسلم حاکم امیر شیخ زادہ علی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ مبارک شاہ نے اس شورش کو دبانے کے لئے عماد الملک کو بھیجا۔ امیر شیخ زادہ علی کو شکست ہوئی، کئی ایک شورشوں کے بعد فولاد ترک ۱۴۳۲ء میں مارا گیا۔

سلطان مبارک شاہ کا دور حکومت علمی ترقی کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی اس کے زمانے کا اہم کارنامہ ہے۔ جس میں غوری سے لے کر مبارک شاہ تک کے حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔

Marfat.com

فاروق پریکٹیکل انگلش ٹیچر

معہ

بول چال

مذکورہ کتاب کے مطالعہ سے آپ تھوڑے وقت میں انگلش بول اور سمجھ سکیں گے۔

:- ملنے کا پتہ :-

نیو بک پیلس اردو بازار لاہور

Marfat.com

Marfat.com

... کے لیے سوالاً جواباً کتب

بشیر احمد تمنا

ایس ایم شاہد

... اور سیاسی کارنامے — صفدر حیات صفدر

زاہد حسین انجم

فضل کریم شیخ

اصغر علی جعفری

ایس۔ ایم۔ شاہد

... ۱۵۲۶ء — پروفیسر غلام رسول

... ۱۸۰۰ء — صفدر حیات صفدر

... سے ظفر تک ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء — صفدر حیات صفدر

اصغر علی جعفری

فضل کریم شیخ

... افکار و ادارے — جاوید اقبال

صفدر حیات صفدر

... کارنامے — توضیح ایوب سید

...س چوک اردو بازار لا...

Marfat.com